جنوری 2024
شعاع
www.pklibrary.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

پہلی شعاع، مدیرہ 6
حمد، میر درد 7
نعت، رحمان خاور 7
نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 8

انٹرویو

نادیہ احمد سے ملاقات، شاہین رشید 18
جب تجھ سے ناتا، الف۔ س 13

سال نو سروے

نئے سال کی دہلیز پر، ادارہ 23

ناول

والعصر، امت العزیز شہزاد 32

بانی — محمود ریاض
مدیر اعلیٰ — آذر ریاض
مدیرہ — رضیہ جمیل
مدیرہ خصوصی — امت الصبور
فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید
قانونی مشیر — نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

مکمل ناول

شہر شام ہجر، فرح بخاری 114
ماء الملوک، نگہت سیما 82
جو اک سکھ نے آزاد کیا، ام ہانی 140
لٹل اولڈ ہاؤس، سحرش مصطفیٰ 168

ناولٹ

کہر میں ڈوبی شام، زارا ہنجرا 60

افسانے

سال نو اور آنٹی پرابلم، حمیرا شفیع 55
ترس، شادیہ الطاف ہاشمی 75
دینو موچی کی سامرہ، سونیا ربانی 78
سالگرہ، مہوش نذیر 109

pklibrary.com

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ — 25000 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

تسکینِ ذوق

غزل	ظریف احسن	195
نظم	عروج عباس	195

مستقل سلسلے

خط آپ کے	ادارہ	200
یادوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	197
کھلتا کسی پہ	حبیبہ خان	199
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	209
مسکراہٹیں	ادارہ	196
موسم کے پکوان	واصفہ سہیل	208
خوبصورت بنیے	ادارہ	210

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

جنوری 2024

جلد 37 شمارہ 05

قیمت 150 روپے

واٹس ایپ

03172266944

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

رضیہ جمیل

پہلی شعاع

شعاع جنوری کا شمارہ لیے حاضر ہیں
خوشی اور اداسی کے ملے جلے احساسات لیے نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ ایک طرف وقت ہاتھ سے نکل جانے کا ملال ہے تو دوسری طرف نیا سال شروع ہونے پر نئے جذبے، نئی امیدیں، نئی امنگیں دل پر دستک دے رہی ہیں۔
زندگی نشیب فراز سے عبارت، خوشی اور غم کا استعارہ ہے۔ شب و روز کی گردشوں میں ہمارے دل کی کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ خوشی ایک لمحاتی کیفیت جبکہ غم دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ ہم بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور جو کھو دیا اس پر ہاتھ ملتے رہتے ہیں۔ کبھی اپنی کوتاہیوں کا پچھتاوا، کبھی دوسروں کے ہاتھوں جو رنج پہنچے یاد آتے ہیں۔
نیا سال مبارک
رب سے اچھی امیدیں رکھتے ہوئے دعاؤں کے ساتھ نئے سال کا استقبال کریں۔ نیا سال ہمارے ملک کے لیے، ہم سب کے لیے امن کا، محبتوں کا اور خوش حالی کا سال ہو۔ آمین

ایک اور چراغ بجھا

ابھی عابد حسین کا غم تازہ ہی تھا کہ ادارے کا ایک اور ستون انیس الرحمٰن ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔
عابد صاحب کے جانے کے بعد پرچے کی ذمہ داری انہوں نے ہی سنبھالی تھی اتنے فرض شناس اور اپنی ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھانے والے ساتھی کی رخصتی ہمارے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ ان کا خلوص، خوش اخلاقی، دردمندی اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ ادارہ بھلا نہ پائے گا۔
اللہ تعالیٰ انیس الرحمان کی مغفرت فرمائے۔ انہیں قبر کی سختیوں سے محفوظ رکھے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

اس شمارے میں

- ماء الملوک ...... نگہت سیما کا مکمل ناول
- ☆ شام شہر ہجر ...... فرح بخاری کا مکمل ناول
- ☆ جو اک سکھ نے آزاد کیا ...... ام ہانی کا مکمل ناول
- ☆ لعل اولڈ ہاؤس ...... سحرش مصطفیٰ کا مکمل ناول
- ☆ زارا منجر اکا ناولٹ ...... کہر میں ڈوبی شام
- ☆ حمیرا شفیع، شازیہ الطاف ہاشمی، سونیا ربانی اور مہوش نذیر کے افسانے
- ☆ والعصر ...... امت العزیز شہزاد کا ناول
- ☆ معروف مصنفہ نادیہ احمد سے ملاقات
- ☆ دستک ...... معروف شخصیات سے گفتگو
- ☆ پیارے نبی کی پیاری باتیں ...... احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ
- ☆ خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

pklibrary.com

حمد

مقدور ہمیں کب تیرے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تُو لوح و قلم کا

اس مسندِ عزت پہ کہ تُو جلوہ نما ہے
کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا
اور دل میں بھروسا ہے، تو ہے تیرے کرم کا

مانندِ حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

میر دردؔ

نعت رسولِ مقبول ﷺ

جہاں سے گنبدِ خضرا دکھائی دیتا ہے
وہاں سے آنکھ کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

خدا بھی اس کا محب اور انبیاء بھی تمام
وہ اک رسول جو یکتا دکھائی دیتا ہے

ہے برقرار توازن جو دین و دنیا میں
یہ راستہ تو نبیؐ کا دکھائی دیتا ہے

نہ پوچھ خواہشِ دیدارِ مصطفےٰ کا صلہ
ہر ایک سمت اُجالا دکھائی دیتا ہے

نبی کا ذکر کرو دوستو کہ مدت سے
جہانِ دل میں اندھیرا دکھائی دیتا ہے

رحمان خاورؔ

pklibrary.com

مال اور زندگی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بوڑھے کا دل دو چیزوں کی محبت میں جوان ہوتا ہے۔ زندگی کی محبت اور مال کی کثرت کی محبت میں۔" (بخاری)

ابن آدم کا دل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر ابن آدم کے پاس مال کی وادیاں بھری ہوئی ہوں تو وہ چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ تیسری وادی بھی ہو اور انسان کا دل صرف مٹی سے بھرتا ہے، البتہ جو شخص توبہ کرے، اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ مال کی محبت انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ جس میں دنیا و آخرت کی کئی مصلحتیں پوشیدہ ہیں، تاہم اس میں حد سے بڑھ جانا گمراہی کا باعث ہے۔

2۔ مال کی حرص جائز حد سے بڑھ جائے تو حق تلفی، بخل، فرائض میں کوتاہی اور اس قسم کی دوسری خرابیوں کا باعث بن جاتی ہے، اس لیے ان بداعمالیوں سے بچنے کے لیے مال کی محبت کو جائز حد سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہیے۔

3۔ مال کی محبت کا علاج یہ ہے کہ فرض، زکاۃ اور واجب اخراجات کے علاوہ بھی نیکی کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنے کی کوشش کی جائے۔

4۔ مال کی ناجائز محبت سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

5۔ دل مٹی سے بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل زندگی بھر سیر نہیں ہوتا۔ جب مٹی میں جائے گا اور قبر میں دفن ہوگا، تب اس کی حرص ختم ہوگی، اور دل سیر ہوگا کیونکہ وہاں ثواب و عذاب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا جس کے بعد دنیا کی طرف توجہ ممکن نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

امت مسلمہ کی عمریں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہوں گی۔ اس سے آگے بڑھنے والے کم ہوں گے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ گزشتہ امتوں میں لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوتی تھیں ان کے مقابلے میں اس امت کے افراد کی عمریں بہت مختصر ہیں، اس لیے ہمیں اس مختصر مہلت میں نیکی کے کام کرنے کی کوشش زیادہ کرنی چاہیے۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں چھوڑا جس کی موت کو اتنا موخر کر دیا کہ وہ ساٹھ سال کو پہنچ گیا۔" (صحیح بخاری)

3۔ جب انسان ساٹھ سال کے قریب پہنچ جائے تو اسے آخرت کی طرف زیادہ توجہ کرنی

pklibrary.com

چاہیے، شاید ساٹھ سال سے آگے نہ بڑھ سکے اور ساٹھ سال کے بعد تو یوں سمجھے کہ مجھے رعایتی مدت مل رہی ہے۔ اس کے بعد غفلت اور فسق و فجور نہایت خطرناک ہے۔ ستر سال کے بعد تو ہر دن کو ایک نئی رعایت تصور کرنا چاہیے۔

نیک عمل پر ہمیشگی اختیار کرنا

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

قسم ہے اس (اللہ) کی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (دنیا سے) لے گیا۔ آپ جب فوت ہوئے تو آپ زیادہ نماز (تہجد) بیٹھ کر ادا فرماتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک زیادہ پسندیدہ عمل وہ نیک عمل تھا۔ جس پر بندہ ہمیشگی کرے اگرچہ تھوڑا ہو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ تھوڑی نیکی اگر پابندی سے کی جائے تو وہ طبیعت پر بوجھ نہیں بنتی اور نتیجے کے لحاظ سے اس زیادہ نیکی سے بڑھ جاتی ہے جو چند دن زور شور سے کی جائے پھر چھوڑ دی جائے۔

2۔ ہمیشگی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بیمار ہو، مجبور ہو یا کوئی اور عذر ہو پھر بھی ضرور ادا کرے، اس طرح یہ نفلی عمل فرض کے مشابہ ہو جائے گا اور نفل کو فرض کا مقام دینا درست نہیں۔

3۔ نیکی کا جو کام ہمیشہ کرنے کی عادت ہو، پھر کسی وجہ سے وہ چھوٹ جائے، بعد میں جب وہ وجہ ختم ہو جائے تو دوبارہ شروع کر دینا چاہیے۔

4۔ تہجد میں طویل قیام افضل ہے اگرچہ تھک جانے کی وجہ سے قیام کا کچھ یا اکثر حصہ بیٹھ کر ادا کیا جائے۔

طاقت کے مطابق

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میرے پاس ایک عورت (بیٹھی) تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس (گھر میں) تشریف لائے تو آپ نے فرمایا۔

"یہ خاتون کون ہے؟"

میں نے کہا "فلاں صاحبہ ہے جو سوتی نہیں۔" (ام المومنین نے اس کی نماز تہجد کا ذکر کیا) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ٹھہرو! وہی چیز اختیار کرو جس کی تمہیں طاقت ہو قسم ہے اللہ کی! اللہ تمہیں اکتاتا یہاں تک کہ تم خود اکتا جاؤ۔" (مسلم)

ام المومنین رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا وہ کام زیادہ پسند تھا جس پر وہ عمل کرنے والا دوام کرے۔

فوائد و مسائل:

1۔ طاقت سے زیادہ عبادت کرنا منع ہے کیونکہ اس سے بعد میں اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور خطرہ ہوتا ہے کہ انسان عبادت بالکل ہی ترک کر دے۔

2۔ ہمیشگی والے عمل کا مجموعی ثواب زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ افضل ہے۔

خوف خدا

حضرت حنظلہ (بن ربیع بن صفی) تمیمی اسیدی رضی اللہ عنہ کاتب وحی سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ہم نے جنت اور جہنم کا ذکر کیا (تو دل کی یہ کیفیت ہوئی) گویا ہم (جنت اور جہنم کو) آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر میں اٹھ کر بیوی بچوں کے پاس (گھر) چلا گیا۔ میں ان کے ساتھ ہنسا کھیلا۔ (حنظلہ نے) کہا پھر مجھے وہ کیفیت یاد آئی جس میں ہم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں) تھے، چنانچہ میں (گھبرا کر) باہر نکلا تو میری ملاقات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہو گئی۔ میں نے کہا۔

''میں منافق ہوگیا، میں منافق ہوگیا۔''
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (تفصیل سن کر) فرمایا۔ ''یہ کیفیت تو ہماری بھی ہے۔''
حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ کیفیت عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''حنظلہ! اگر تم (ہمیشہ) اسی کیفیت میں رہو جس میں تم میرے پاس ہوتے ہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر یا (فرمایا) راستوں میں تم سے مصافحہ کریں۔ (لیکن) حنظلہ وقت وقت کی بات ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اپنے ایمان اور قلبی کیفیات کے بارے میں بہت محتاط رہتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کسی نادانستہ غلطی کی وجہ سے ان کی درجات میں کمی نہ آجائے۔
2۔ دل کی کیفیات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔
3۔ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنا اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے دنیا کے معاملات میں مشغول ہونا شرعاً مطلوب ہے۔
4۔ انسان کو فرشتوں سے (بعض لحاظ سے) افضل قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایسے حالات میں گھرا ہوا ہے جو اسے اللہ سے غافل کرتے ہیں، پھر بھی وہ اللہ کو یاد کرتا اور اس کی عبادت کرتا ہے۔

بہترین عمل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''اتنے عمل کا بوجھ اٹھاؤ جتنے کی تمہیں طاقت ہو کیونکہ بہترین عمل وہ ہے جس پر زیادہ پابندی کی جائے اگرچہ تھوڑا ہو۔''

میانہ روی

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو ایک چٹان پر نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ایک حصے میں (کسی کام سے) تشریف لے آئے۔ وہاں کچھ دیر تشریف فرما رہے پھر واپس تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ آدمی اسی طرح نماز پڑھ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ جمع کرکے (اشارہ کرتے ہوئے) تین بار فرمایا۔
''لوگو! افراط و تفریط سے بچ کر) میانہ روی اختیار کرو۔'' پھر فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ (ثواب دینے سے) نہیں اکتا تا تم ہی (عمل کرنے سے) اکتا جاتے ہو۔''

گناہوں کا بیان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ''ہم نے عرض کیا اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم سے ان اعمال کا بھی مواخذہ ہوگا جو ہم جاہلیت میں کرتے تھے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
''جس نے اسلام لاکر نیک کام کیے اس سے جاہلیت میں ہونے والے اعمال کا مواخذہ نہیں ہوگا اور جس نے (اسلام لاکر بھی) برے کام کیے، اس سے پہلے اور بعد والے (سب اعمال) کا مواخذہ ہوگا۔''

فوائد و مسائل:

1۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''اسلام اپنے سے پہلے (گناہوں) کو مٹا دیتا ہے۔'' (صحیح مسلم..... حدیث ۱۲۱) جو شخص خلوص دل کے ساتھ سے اسلام قبول کرتا ہے اس کے جاہلیت کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔
2۔ جو شخص اسلام قبول کرنے کے بعد بھی جاہلیت کی عادتیں اور بداعمالیاں ترک نہیں کرتا،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا، اس لیے اس کے سابقہ گناہ معاف نہیں ہوتے۔

3۔ جو شخص خلوص سے اسلام قبول کرتا ہے، پھر اس سے تقاضائے بشریت کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے، اس سے زمانہ کفر کے اعمال کا مواخذہ نہیں ہوگا کیونکہ مسلمان کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوجاتا۔ جن صحابہ کرام سے ایسے گناہ سرزد ہوئے جن پر حد نافذ ہوئی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا جنازہ پڑھا اور ان کے حق میں دعائے مغفرت فرمائی۔

4۔ مسلمان کو صحیح مسلمان بننے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اس کے گناہ معاف ہوجائیں اور اسے جنت میں اعلیٰ مقام حاصل ہوجائے۔

قاتل ومقتول

حضرت ابوبکرۃ نفیع بن حارث ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں سونت کر ایک دوسرے کو (مارنے کی نیت سے) ملتے ہیں (ایک دوسرے کے مدمقابل آتے ہیں) تو یہ قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! قاتل کا جہنمی ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مقتول جہنمی کیوں ہوگا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس لیے کہ وہ بھی اپنے (دوسرے مسلمان) ساتھی کے قتل پر حریص تھا۔" (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس ارادہ معصیت پر انسان مستحق عتاب الٰہی ہوگا۔ جس کا اس نے اپنے دل میں پختہ عزم کیا ہوگا اور اس کے ارتکاب کے لیے اسباب وسائل بھی اختیار کیے گئے ہوں گے کہ گو وہ اس میں کسی رکاوٹ کی وجہ سے کامیاب نہ ہوا ہو۔

2۔ عزم، وسوسے مختلف ہے۔ وسوسہ معاف ہے، جب کہ عزم (پختہ ارادہ) قابل مواخذہ ہے، تاہم حدیث میں جو وعید مذکور ہے اس کے مصداق باہم لڑنے والے مسلمان، اس وقت ہوں گے، جب وہ دنیاوی حمیت وعصبیت کی بنا پر لڑ رہے ہوں۔ کوئی شرعی معاملہ ان کے باہمی قتال کی بنیاد نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ممکن ہے کہ دونوں ہی کا اپنا اپنا اجتہاد ہو جس میں وہ عنداللہ معذور سمجھے جائیں۔

جماعت کی نماز

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی کی جماعت کے ساتھ پڑھی ہوئی نماز، اس نماز سے کچھ اوپر بیس (20) درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے جو وہ اپنے بازار یا گھر میں پڑھتا ہے، اس لیے کہ جب کوئی شخص اچھے طریقے سے وضو کرتا، پھر نماز کے ارادے سے مسجد میں آتا ہے، اسے نماز ہی مسجد کی طرف لے جاتی ہے، تو ایسے شخص کے ہر قدم کے بدلے میں ایک درجہ بلند اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے تا آنکہ وہ مسجد میں داخل ہوجاتا ہے۔ پھر جب وہ مسجد میں داخل ہوجاتا ہے تو جب تک نماز اسے وہاں روکے رکھتی ہے، وہ نماز ہی میں شمار ہوگا (یعنی جماعت کے انتظار یا ذکر الٰہی میں مصروف، جب تک مسجد میں رہے گا، وہ اللہ کے ہاں حالت نماز میں سمجھا جائے گا) اور فرشتے تمہارے ایک آدمی کے لیے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنی اس مجلس میں بیٹھا رہے جس میں اس نے نماز پڑھی ہے۔ فرشتے کہتے ہیں اے اللہ! اس پر رحم فرما۔ اے اللہ! اسے بخش دے۔ اے اللہ! اس پر رجوع

فرما۔ (یہی دعائیں اس کے حق میں اس وقت تک جاری رہتی ہیں) جب تک وہ کسی کو ایذا نہ پہنچائے۔ جب تک بے وضو نہ ہو۔" (بخاری و مسلم۔ اور مذکورہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔)

فوائد و مسائل:

1۔ نماز باجماعت ادا کرنا فرض ہے اور بلاوجہ سستی یا کاموں میں مصروفیت کی بنا پر نماز باجماعت ادا نہ کرنا گناہ ہے، تاہم صحت نماز کے لیے جماعت شرط نہیں ہے۔ اس حدیث سے نماز جماعت کے عدم وجود کا استدلال درست نہیں ہے۔

2۔ اگر کوئی شخص کسی شدید ضرورت کے پیش نظر گھر یا بازار میں اکیلے نماز ادا کرتا ہے تو اس کی نماز ادا تو ہو جائے گی، البتہ وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ فرض کا تارک ہونے کی وجہ سے گناہ گار بھی ہوگا۔

3۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی 25، 26 یا 27 درجے زیادہ فضیلت ہے جیسا کہ دیگر روایات میں ہے۔ نماز، دیگر اعمال خیر سے افضل ہے کیونکہ فرشتے نماز کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

4۔ مسلمان کو تکلیف دینے سے بندہ فرشتوں کی ان دعاؤں سے محروم ہو سکتا ہے جن کا ذکر مذکورہ حدیث میں ہے۔

5۔ گھر سے باوضو ہو کر مسجد میں آنے کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے جیسا کہ حدیث میں ہے فرشتے بے وضو ہونے تک انسان کے لیے دعا کرتے ہیں۔

نیت کے مطابق

ابوالعباس عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ لی ہیں۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی۔

"چنانچہ جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا لیکن اسے کر نہیں سکا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر ارادے کے مطابق اسے کر بھی لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گناہ زیادہ نیکیوں کا ثواب اس کے لیے لکھ دیتا ہے اور اگر کسی نے کسی برائی کا ارادہ کیا لیکن اسے کیا نہیں تو اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر ارادے کے مطابق اس برائی کو کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک ہی برائی لکھتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ جو بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حوالے سے بیان فرمائی اسے حدیث قدسی کہا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو الہام کے ذریعے سے آگاہ فرماتا ہے۔ اس میں اللہ کی اس وسعت فضل و کرم کا بیان ہے جو وہ اپنے بندوں کے ساتھ فرماتا ہے۔ اور قیامت والے دن بھی فرمائے گا۔

2۔ برائی کا اگر صرف ارادہ کیا اور وسوسہ ہے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہے۔ البتہ پختہ عزم کرنے کے بعد کسی وجہ سے نہ کر سکے تو وہ قابل مواخذہ ہے جس طرح کہ پہلے گزرا ہے۔ لیکن اگر پختہ عزم کرنے کے بعد اللہ سے ڈرتے ہوئے برائی چھوڑ دیتا ہے تو یہ باعث اجر بھی ہے۔

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

الف۔س

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

بس جی زندگی جینا چھوڑ کر، سسک سسک کر گزارنا شروع کر دیا۔ تو جناب، سات عدد بھائیوں کی اکلوتی، سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن۔ ماں باپ کی آنکھ کا تارا۔ اکثر خاندانی محفلوں میں کان میں آواز پڑ جاتی تھی کہ "لاڈ پیار نے بگاڑنے کے بجائے سنوار دیا ہے۔" "معصوم، اللہ میاں کی گائے۔"

س۔ "شادی کب ہوئی؟"

ج۔ "محبت بھرے گھر کو چھوڑنے پر راضی نہ تھی۔ بیسیوں رشتے بھوک ہڑتال کر کے رد کر دیے۔ بالآخر نومبر 2000 میں اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا اور ہم پیا دیس سدھارے۔

س۔ شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

ج۔ سلیقہ مندی سے گھر کو سجاتے رہنا۔ کوکنگ، بیکنگ کرنا۔ کلاسک اردو اور انگلش ناول پڑھنا۔ خواتین ڈائجسٹ، شعاع، کرن، از بر کرنا۔ رسالے امی جان اور بھابھیوں کے لیے آتے تھے۔ امی نے ڈانٹ ڈپٹ کرنا سکھا ہی نہیں تھا سو بھابھیوں کو سمجھانے کا ذمہ دیا گیا۔ پیار سے، لالچ دے کر بھابھیوں نے وعدے لیے کہ میٹرک پاس کرنے سے پہلے رسالے نہیں پڑھنے مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔ خیر شان دار نمبروں سے بی۔ایس۔سی سائیکالوجی کیا۔ بھابھی نمبر چار نے گھر میں قدم رکھا اور چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ہمارے خاندان کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ ایک ماہ بعد علیحدہ ہو گئیں۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑا۔ بڑی تین بھابھیاں بھی شوہروں کو لے کر چلتی بنیں۔ امی جان بستر سے لگ گئیں۔ ہم نے ایم۔ایس۔سی ادھورا چھوڑ کر پرانی بوا کے ساتھ مل کر گھر کو سنبھالا۔ بھابی نمبر پانچ اور چھ کی بری دل لگا کر بنائیں لیکن وہ تو پہلے دن سے اکھڑی اکھڑی لگیں۔

امی جان بڑی نیک اور وضع دار خاتون تھیں۔ انہوں نے خوش دلی سے بیٹوں کو علیحدہ گھر لے دیے کہ اچھا ہے آنے جانے کے لیے ایک ہی شہر میں اتنے سارے گھر ہوں گے۔ خیر سب بھائی بھابھیاں ہر ویک اینڈ پر تشریف لاتے۔ امی جان، ہم اور بوا کمر کس لیتے خوب خاطر مدارات کی جاتی۔ جانے کا موقع دیا ہی نہیں گیا کہ امی اور بابا خراب صحت میں کہاں تکلیف کریں گے۔ خیر بھابھی نمبر سات کو بیاہ کر لایا گیا۔

محترمہ نے ولیمے والے دن ہی سوال کر لیا کہ "سب تو الگ رہتے ہیں تو یہ محترمہ (مابدولت) کیا میری ذمہ داری ہیں؟"

امی جان کو برا لگا۔ تمام خاندان والوں کی موجودگی میں اعلان کر دیا کہ میں نے شوہر کی کمائی سے بیٹوں کے فرض ادا کر دیے۔ بیٹی کے لیے سب کچھ تیار ہے۔ بیٹوں کو قسم ہے کہ اپنی بیوی بچوں کا حق نہ ماریں اور میری بیٹی کو کچھ نہ دیں۔ اس کے بعد دل پکڑ کر گر گئیں اور خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

بابا جان اور میں تو ہوش ہی کھو بیٹھے۔ چالیسویں کے بعد میری ایک دوست، اپنے شوہر کے دوست کا رشتہ لائیں۔ بھابھیوں کو بوجھ ہلکا کرنے کی جلدی تھی۔

س۔ رشتے میں مرضی شامل تھی؟

ج۔ جی بالکل! میری یہ دوست کافی عرصہ سے ذکر کرتی تھی کہ میرے شوہر کا دوست تمہیں پسند کرتا ہے۔ اس کے بچوں کی سالگرہ پر انہوں نے دیکھا تھا۔ میں نے کبھی توجہ نہ دی۔ خیر رشتہ پکا ہونے کے بعد انہیں دیکھا تو بہت اچھے لگے۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج۔ تقریباً آٹھ سال۔ جی ہاں! آٹھ سال۔

وہ یوں کہ ساس بیوہ تھیں۔ منگیتر صاحب کی پانچ عدد بڑی بہنیں تھیں۔ دو شادی شدہ تھیں۔ ایک سال منگنی رکھنے کے بعد ساس شادی کی تاریخ لینے آئیں۔ تاریخ طے کرنے کے بجائے، بابا جان کو بول دیا کہ میں ابھی پانچ دس سال تک بیٹے کی شادی نہیں کر سکتی۔ (وجہ دونوں داماد گھر داماد اور ہڈ حرام تھے۔ ان کے جیسے مزید تین نگینے تلاش کے باوجود مل نہیں رہے تھے)۔

بھابھیاں بخوبی آگاہ تھیں کہ میری اور منگیتر صاحب کی بہت انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے بابا جان پر رشتہ ختم کرنے کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ منگیتر صاحب نے بابا جان اور بھائیوں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے کہ میں رشتہ ختم نہ ہونے دوں گا۔

اگلے چھ سال تک ہم دونوں ثابت قدم رہے۔ کیا کیا طوفان نہ جھیلے۔ آخر ساس صاحبہ نے بیٹے سے اسٹامپ پیپر بنوایا کہ ابھی تک اور آئندہ بھی جو کچھ کماؤں گا، وہ میری ماں اور بہنوں کا ہوگا اور شادی کی تاریخ لینے آ گئیں۔

اب میرے بابا جان نے ان کو بھگا دیا۔ دونوں ہی گھرانے روشن خیال تھے۔ لو میرج ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ بس شاید ہماری خوشی کی برداشت نہ تھی۔ بہت منت سماجت کے بعد بابا جان نے شادی کے لیے ہاں کی اور جنوری 2000 میں بالآخر شادی ہو گئی۔

س: شوہر میں خوبیاں یا جیون ساتھی کے بارے میں کیا تصور تھا؟

ج۔ جیسا میں چاہتی تھی کہ سنجیدہ، سوبر اور ذمہ دار ہو تو جناب چودہ سال کی عمر سے بیوہ ماں اور یتیم بہنوں کی ذمہ داری بخوبی اٹھا رہے ہیں۔ ساتھ ہی تعلیم مکمل کی۔ دو دو نوکریاں کیں۔ پھر اپنا کاروبار شروع کیا۔ ماشاء اللہ بہت کامیاب ہوئے اور کہانیوں کے ہیرو کی طرح ہینڈسم بھی ہیں۔

س۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے؟

ج۔ بہت معصوم خیالات تھے کہ جب ان لوگوں میں رہوں تو میری نیچر دیکھ کر، وہ لوگ دل سے راضی ہو جائیں گے۔ شادی پر یہ لوگ ناراض تھیں تو ان کی خدمت کر کے دل جیت لوں گی۔ مگر ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

س۔ شادی کے لیے قربانی؟

ج۔ قربانی دی اپنی سیلف ریسپیکٹ کی۔

س۔ رسموں پر جھگڑا ہوا۔

ج۔ بالکل! ایسا اور اتنا کہ لگ رہا تھا کہ شادی انجام نہ پانے دیں گی۔ لین دین کا یہ تھا کہ دینا کچھ نہیں لین ہی لین۔ فرمایا۔ "شکر کریں آپ کی بیٹی بیاہ رہے ہیں۔ رسم کوئی نہیں ہوگی۔ البتہ ساس نندوں کے سونے کے بندے اور جوڑے، دامادوں نواسے نواسیوں کے جوڑے، درجن بھر پھوپھیوں (دولہا کی) اور چچاؤں کے جوڑے، ماموؤں خالاؤں کے جوڑے کا مطالبہ۔

(ان میں سے کوئی بھی شادی میں شریک نہ تھا۔ پھوپھی صرف ایک تھیں جو شامل نہ ہوئیں اور خالہ کا تو وجود ہی نہیں۔ ماموں بھی نہیں آئے۔ وجہ؟ میری ساس نندوں کا بلند اخلاق)۔

باقی جہیز تو بیٹی کے باپ پر فرض ہی ہوتا ہے۔ بری ایسی شان دار کہ بھابھیاں اور بھائی آب دیدہ ہو گئے۔ پرنٹڈ فلیٹ (پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ لیا اپنے جہیز کا نکالا۔ سنا ہے پہلے ہوتا تھا) کے پورے پانچ جوڑے بغیر دوپٹوں والے۔ گندہ پیلا والا چھلکے جیسا سونے کا سیٹ (چھوٹے چھوٹے بندے اور سنہری ڈوری میں لٹکتا لاکٹ)۔

بارات والے دن پارلر جاتے ہوئے الٹرا ماڈرن نند، چوٹی کی ڈیزائنر کے جوڑے میں ملبوس یہ سامان دینے آئیں۔ بعد میں ساس کا فون آیا کہ "دلہن بہت اچھی تیار ہو۔ ٹیکہ، جھومر، نتھ، کڑے سب پہنے ورنہ برادری (کدھر تھی؟) میں میری بے عزتی ہوگی۔ اور میں بارات واپس لے جاؤں گی۔"

pklibrary.com

بابا جان نے اور بڑی بھابیوں نے ایمرجنسی میں قیمتی ترین جوڑے اور زیور خریدے ہمارے ہاں نتھ، ٹیکہ، جھومر دولہا والے دیتے ہیں۔

لاہور کے مہنگے ترین ہوٹل میں بارات کو خوش آمدید کیا۔ صرف ماں، بیٹیاں، داماد اور بس۔ ہاں ان کے دوست، کاروباری دوست تھے۔ باراتیوں سے زیادہ لوگ بینڈ والے تھے۔ ان کے دوستوں نے انتظام کیا تھا۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔ شادی کی رات شوہر صاحب خوشی سے بے حال تھے۔ مگر اپنی خوشی سے زیادہ اس بات کے احسان مند کہ میری ماں نے کنواری، بڑی بہنوں کے ہوتے بیٹے کی شادی کردی۔ (وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہی ہیں۔ ایک کا نکاح ہو کر ختم ہو گیا۔ لڑکا اپنے والدین کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ بڑی والی ایک تند تین بیٹیاں اور طلاق لے کر واپس آچکی ہیں)۔ مجھے حکم دیا کہ میری ماں نے عظمت کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں ہماری خوشی پوری کر کے۔ اس لیے ان کو پورا حق ہے کہ وہ ہم دونوں کو جوتے بھی مار سکتی ہیں۔ (انہوں نے سچ مچ مارے بھی)۔"

س۔ شادی کے بعد زندگی میں تبدیلیاں؟

ج۔ شادی انسانی ضروریات (جیسے کہ کھانا پینا) بھی بھلا دیں۔ کچن کو تالا لگا ہوتا۔ جب میاں صاحب کھانے کے وقت موجود ہوتے صرف اس وقت فقیروں کی طرح تھوڑا سا کھانا دیا جاتا جو ہم دونوں آپس میں بانٹ لیتے۔ میاں صاحب نے کئی بار رو رو کر ماں سے فریاد بھی کی۔ کوئی اثر نہ ہوا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ لاہور کے پوش ترین علاقے میں رہنے والی، شہر کے اعلیٰ ترین سیلون میں باقاعدگی سے جانے والی خواتین، گھر کے اندر ایک لڑکی سے ایسا سلوک کر رہی ہوں گی۔ شوہر صاحب ایک کامیاب بزنس مین، مرسیڈیز اور بی۔ ایم۔ ڈبلیو میں بیٹھ کر میری خاطر شہر کے دوسرے کونے سے کھانے کے وقت گھر آنے کی کوشش کرتے اور خوب ذلیل ہوتے۔

س۔ پہلے بچے کی پیدائش؟

ج۔ ہائے کیا ڈرامہ ہوا؟ شوہر صاحب نے سوچا اب تو دل موم ہو ہی جائے گا ان لوگوں کا۔ انہوں نے تو شور ہی مچا دیا کہ میرے پیر صاحب نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ آنے والا بچہ میرے اور میری بیٹیوں کے لیے منحوس ہے اس لیے ابارشن کراؤ۔ ماں بیٹیاں کمرے میں آئیں اور میرے اوپر حملہ کر دیا۔ مجھے دیواروں میں دے دے کر مارا۔ ساس نے بالوں سے پکڑ کر گرایا اور گلا دبا دیا۔ شوہر صاحب بچاتے بچاتے تھک گئے تو رو رو کر میرے بھائیوں کو فون کر دیا۔ وہ لوگ آ گئے تو ان کے پیر پکڑ کر معافی مانگی اور کہا اس کو لے جاؤ میں گیٹ سے نکل رہی تھی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

میں نے بھائیوں سے کہا کہ جائیں اور بابا جان کو مت بتائیے گا۔ خود ان کے پاس کمرے میں گئی۔ انہوں نے کمرہ لاک کر لیا۔ بس ہم دونوں روتے رہے۔ گھر کے نوکر بھی حیران بس ساس نے پھر اتنی باتیں کریں۔ کہتیں۔

"بے غیرت گھر میں جوان نندوں کا لحاظ نہیں کیا۔"

نوکر فارغ کر دیے۔ صفائی میرے ذمہ لگا دی۔ کھانے پینے کا پہلے سے بھی زیادہ "خیال" رکھنا شروع کر دیا۔ شادی کے وقت پچاس کلو وزن تھا چوتھے مہینے میں پینتیس کلو ہو گیا۔ ڈاکٹر نے خوراک کا خیال رکھنے کو کہا تو کروڑ پتی میاں جی، بی۔ ایم۔ ڈبلیو، میں سوار پتلون کی جیب میں ملک پیک کا چھوٹا والا ڈبا چھپا کر لانے لگے۔

اللہ نے کرم کیا، ساتویں مہینے میں پری۔ میچور بیٹی پیدا ہوئی اور ہم دونوں زندہ بھی رہے۔ ڈاکٹر تو ناامید تھے۔ میکے میں اطلاع بھی نہ کی۔ دو مہینے بعد سب بابا جان کے ساتھ خیریت لینے آئے تو دو عدد، ڈھانچے دیکھ کر رو ہی پڑے۔ بابا جان کو ہارٹ اٹیک

ہوگیا۔ ساس نے خوب ڈرامہ کیا۔

"میں تو بیٹی بنا کر لائی تھی لیکن یہ مجھے ماں نہیں سمجھتی اسمارٹ رہنے کے شوق میں کھاتی نہیں میری ایک نہیں سنتی۔ بھائیوں کو حقیقت معلوم تھی مگر لحاظ میں چپ کر رہے۔ گھر لے جانے کی کوشش کی تو اجازت نہ دی کہ میرے گھر کی رونق ہے، میں تو اسے دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ (آسمان پھٹا نہ زمین اتنے جھوٹ پر)۔

س۔ سسرال میں مقام کیا ملا؟

ج۔ نوکروں کو اشارے کر کے کہا جاتا اس کا کام نہ کرنا۔ اس کے کمرے کے آگے اتنی جگہ چھوڑ دیا کرو یہ خود صاف کرے گی۔ یہاں تک کہ میرے اور بیٹی کے دھلے کپڑے، اتار کر پھینک دیے کہ ہماری تاریں گندی نہ کر صرف میرے بیٹے کے کپڑے ڈال۔ کمرے سے باہر نہ آ میری بیٹیاں تیری شکل سے چڑتی ہیں۔ ویسے بھی میں نہیں نکلتی تھی کیونکہ گھر داماد، نندوئی صاحب اور ان کی بیویاں خاصے رومانٹک (بے ہودگی کی حد تک) موڈ میں رہتے تھے۔ بڑے بڑے سین دیکھنے کو ملے احتیاط کے باوجود۔ سب سے بڑھ کر یہ مقام ملا کہ "میں تو اپنے بیٹے کا شوق پورا کرنے کے لیے لائی ہوں مگر بسنے نہیں دوں گی۔" بس اسی بات کو سچ سمجھ کر ٹھان لی کہ میں بس کر ہی دکھاؤں گی۔ بیٹی کے ایک سال بعد اللہ نے پھر آپریشن سے ایک بیٹا عطا کیا۔ باقاعدہ ماتم کیا گیا کہ تیرا وارث آ گیا۔ اب میرا اور میری بیٹیوں کا کیا بنے گا؟

حد یہ کہ شادی شدہ نند اور نندوئی کہنے لگے ہم ان سیکیورٹیز فیل کر رہے ہیں۔ ماں کا حکم مان کر اسے اور اس کے بچوں کو اس کے باپ کے گھر بھیج دو (طلاق دے کر)۔ یاد دہانی کرائی گئی کہ "تمہاری خواہش (شادی کی) ہم نے پوری کر دی تھی اب تم ہماری خواہش پوری کرو۔"

شوہر صاحب نے ماں کے پیر پکڑے۔ وکیل بلوایا۔ پرانے معاہدے کا اعادہ کیا گیا۔ بزنس میں لگا سرمایہ اور اس سے متوقع آمدنی ماں کے نام ہے۔ بشمول جائیداد (والد صاحب کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے)۔ ماں اور بڑی بیٹیوں نے سلائی اسکول میں نوکری کی تھی گھر چلانے کے لیے۔ شروع کے تین سال) پھر اللہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بزنس میں کامیابی دی۔ نندوئی صاحب کے نام بھی ایک پلاٹ لے کر دیا۔ اللہ رے شرافت تو ختم ہے اس بندے پر۔ میں چپ اللہ کو پکارتی رہی بس۔

س۔ شادی کے بعد زندگی میں تبدیلی؟

ج۔ کوئی زیادہ نہیں۔ تین بچوں کے بعد بھی بہت سلم، اسمارٹ رہی۔ کم گو پہلے بھی تھی اب کم سم رہنے لگی۔

س۔ شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج۔ شادی کے اگلے دن میکے سے ناشتہ آیا۔ ایک تندہی سنبھال رہی تھیں۔ ایک شوہر کے ساتھ سیلون گئی تھیں۔ ایک متوقع شوہر کے ساتھ آؤٹنگ کرنے۔ باقی دو سو رہی تھیں۔ خود ہی چائے بنا کر ناشتہ سرو کیا۔ نوکر کو ساس نے کسی کام سے بھیجا ہوا تھا۔ رسم کے مطابق میکے نہ جانے دیا کہ گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ (نادیدہ)۔ باقی بھی ملنے جلنے والے دلہن دیکھنے آنے والے ہیں۔ (بیس سال گزر گئے۔ ابھی تک نہیں پہنچے۔)

خیر میاں صاحب کے باہر پاؤں سے لکیر بنا کر ہدایت جاری کی کہ تو نے اس سے آگے صفائی نہیں کرنی۔ مجھے حکم دیا کہ "چل کمرہ صاف کر۔" سجاوٹ کے بعد صفائی کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ ڈیکوریشن کی چیزوں کے ٹکڑے اور پھول وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔ میں نے پوچھا کہ ویکیوم یا جھاڑو وغیرہ کدھر ہے؟" چلانا شروع کر دیا کہ تو کس جنگل سے آئی ہے یا فقیر ہے۔ تیرے پاس جھاڑو بھی نہیں۔ کسی بھی طرح صفائی کر۔ میں نے خوف کے مارے اپنے سامان سے ٹوتھ برش نکالا اور دو گھنٹے لگا کر اس سے کمرہ صاف کیا تھا۔ ساس بیڈ پر بیٹھی گھورتی رہیں۔

س۔ میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟

ج۔ میکے کے کھانوں کی ملنے جلنے والوں میں دھوم تھی۔ سسرال میں کوئی سسٹم ہی نہیں تھا۔ کچن نوکروں کے حوالے۔ ہر نند اپنا آرڈر کرتی یا پھر ہوٹل سے منگوا کر کھا لیتی۔ اس کے بعد کچن کو تالا کہ میں نہ جاؤں۔ شوہر صاحب جانتے تھے مگر ماں کے احسان مند اور وعدے کے پابند کہ جو ماں چاہے گی وہی ہوگا۔ میں نے صبر کی انتہا کردی اور ٹھان لی کہ واپس نہیں جاؤں گی۔ بھائی بھابیوں کو امی جان کی دی ہوئی قسم ذہن میں بٹھالی تھی۔

س۔ سسرال کے ماحول میں تبدیلی؟

ج۔ پہلے سب جمع کر آپس میں بھی گالم گلوچ کرتے تھے اور مجھ پر بھی اب آواز آہستہ رکھتے ہیں۔ بہنوں کی آپس میں لڑائیاں کم ہوگئی ہیں۔ میں نے کچن سے نوکر راج ختم کرادیا۔ تین وقت نوکروں کی مدد سے باقاعدہ کھانا بنانا شروع کردیا۔ یہ شادی کے دس سال بعد ہوا۔ دو بچوں کے بعد تین مس کیرج ہوئے پھر میرا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ دو مہینے اسپتال میں رہی۔ ونٹی لیٹر پر بھی رکھا گیا۔ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی۔ ساس نندوں کو خرچے کی فکریں۔ شوہر صاحب نے نرس رکھ دی۔ معصوم بچے سرہانے بیٹھے رہتے۔ ان کی خاطر خود کو کھڑا کیا۔

شوہر کے دوستوں کی بیویاں کہتیں ان لوگوں نے جادو کرایا ہے توڑ کراؤ۔ میں بڑی ضد کی پکی کہ نمازی ہوں، قرآن کی تلاوت بلاناغہ کرتی ہوں۔ بس اللہ توکل۔ وہی مجھے سنبھالے۔ خیر چھ مہینے بعد بھلی چنگی ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے کہا یہ معجزہ ہے (بے شک اللہ سب سے بڑا ہے) سال بعد ایک اور بیٹا آپریشن سے ہوا۔

س۔ جوائنٹ فیملی میں رہنا چاہیے یا علیحدہ؟

ج۔ میرے تجربے کے حساب سے تو جوائنٹ فیملی ایک لعنت اور عذاب ہے۔ اپنے میکے اور خاندان کو دیکھوں تو جوائنٹ فیملی نعمت ہے۔ نماز اور قرآن پاک کی طاقت نے زندہ رکھا۔ ساتھ ہی شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کے توسط سے رائٹرز اور قاری بہنوں نے مدد کی۔ ''پیر کامل'' کی عمیمہ جیسی استقامت تو نہیں لیکن ان کی اور سالار سکندر کی زندگی کی مشکلات کے آگے اپنی مشکل کم لگنے لگی۔ جنت کے یاسین پڑھا تو اسکارف لینے لگی۔ ''معصف'' پڑھ کر ''سورۂ یٰسین، سورۂ حشر اور سورۂ رحمٰن'' کی تلاوت اتنی زیادہ کی کہ حفظ ہوگئیں الحمدللہ۔ تجھ سے ناتا جوڑا کے سلسلے نے بھی صبر شکر کی راہ ہموار کی۔ اسی لیے سوچا کہ میں بھی بہنوں کے ساتھ اپنی زندگی کا حال شیئر کروں۔

اللہ نے بڑی مدد کی۔ کمرے میں بند بچوں کو پڑھاتی رہتی تھی ہر سال کے ٹاپر رہے۔ پھر اسکالرشپ پر لندن کی ٹمبر ایک یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ اب اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اپنی یونی ورسٹی میں جاب بھی کررہے ہیں۔ باپ سے ضد کرکے مجھے اور چھوٹے بھائی کو بھی بلوالیا۔ وہ بھی ادھر ہی زیر تعلیم ہے۔

مہینہ پہلے شوہر صاحب نے اپنے مرتے ہوئے والد صاحب سے کی گئی قسم توڑ دی اور بیوہ، بے سہارا (ارب پتی) ماں، یتیم بہنوں، دو عدد جوان جہاں بھانجوں، چار عدد بھانجیوں اور ایک عدد بے آسرا بہنوئی (نوکروں کی فوج) کو اکیلا چھوڑ کر لندن تشریف لے آئے۔ میرے بڑے بیٹے اور بیٹی کو بہت کچھ یاد ہے اور وہ کہتے ہیں۔

''آپ نے یہ سب کیوں سہا؟'' میں ان کو یہ ہی کہتی ہوں کہ ''تم لوگوں کی خاطر۔ بچوں سے ان کا باپ دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بھائیوں کے پاس جاتی تو آج میرے بچے اس مقام پر بھی نہ ہوتے۔''

بابا جان کی زندگی تک، اس لیے بھی چپ رہی کہ وہ کیسے سہہ پائیں گے کہ ان کی لاڈو کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ اس کے بعد اذیت میں رہنے کی شاید عادت بھی ہوگئی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ اتنے مانوس ہوگئے صیاد سے اب رہائی ملی تو کدھر جائیں گے۔

شوہر صاحب اور میرے درمیان محبت بھی بہت تھی۔ بہرحال میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا۔ میں نے اپنی اور اپنے شوہر کی جوانی کھا جانے والی اور بچوں کا بچپن چھین لینے والی ان عورتوں کو معاف نہ تو کیا نہ کبھی کروں گی۔

☆☆

مقبول ڈراما نگار، ناول نگار

نادیہ احمد سے ملاقات

شاہین رشید

اگر آج آپ ڈرامہ رائیٹرز کی فہرست بنائیں تو اس میں زیادہ تر نام "خواتین ڈائجسٹ" سے وابستہ خواتین کے ہی ہوں گے۔ جنہوں نے خواتین کرن اور شعاع سے لکھنے کا آغاز کیا اور شہرت حاصل کی۔ چینلز والوں نے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا اور آج وہ مصنفہ کے ساتھ ایک کامیاب ڈرامہ رائیٹر کے حوالے سے بھی جانی پہچانی جاتی ہیں۔

نادیہ احمد کا شمار بھی ان مصنفین میں ہوتا ہے جو خواتین ڈائجسٹ سے میڈیا کی فیلڈ میں آئیں۔ نادیہ احمد کے آج کل دو ڈرامہ سیریل آن ائیر ہیں۔ اس سے پہلے بھی نادیہ کے کئی سلسلہ وار سیریلز آن ائیر ہو چکے ہیں۔ رمضان المبارک میں بھی "مکافات" سیریز کے کئی ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔

ڈراموں کے حوالے سے نادیہ احمد سے ایک گفتگو آپ سب کے لیے۔

"کیا حال ہیں جی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آج کل آپ کے دو سیریلز آن ائیر ہیں "دل ہی تو ہے" اور "نہیں کس سے" تو آپ تو آج کل ہواؤں میں اڑ رہی ہوں گی؟"

"ایسا نہیں ہے کہ میں ہواؤں میں اڑنے لگی ہوں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ جیسے جیسے اللہ تعالیٰ انسانوں کو پروگریس دیتا ہے، ویسے ویسے کئی معنوں میں خوف بڑھ جاتا ہے۔ ذمہ داری آجاتی ہے۔ کیونکہ آپ کو جب کوئی کام ملتا ہے تو آپ کے سر پر ایک بہت بڑی ذمہ داری آجاتی ہے۔ اسکرپٹ لکھنا ہی فقط معرکہ نہیں ہے۔ بلکہ اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ہماری تحریر، لوگوں کے معیار پر بھی پوری اترے۔ جب تحریر اسکرین پر آتی ہے تو اس وقت آپ ہواؤں میں نہیں اڑ رہے ہوتے بلکہ سہمے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک خاص معیار بن چکا ہے ریٹنگ کا..... کہ فلاں ڈرامے کی ریٹنگ بہت ہے۔ فلاں ڈرامہ وائرل ہو گیا ہے۔ تو بہت بڑی ذمہ داری کاندھوں پر آجاتی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ڈاؤن ٹو ارتھ (منکسر المزاج) رہنا پڑتا ہے۔

اور ہواؤں میں تو اڑنا بھی نہیں چاہیے کہ پھر پاؤں تو زمین پر ہی رکھیں گے۔ اور یہ محض اتفاق ہے کہ میرے دونوں ڈرامے ایک ہی وقت میں آن ائیر ہیں۔ جبکہ تیار تو مختلف اوقات میں ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے میرے جو دو سیریل آئے تھے "صلہ محبت" اور "تیری راہ میں" پہلے "صلہ محبت" ٹیلی کاسٹ ہوا "اور پھر تقریباً ڈھائی تین ماہ بعد "تیری راہ" میں ٹیلی کاسٹ ہوا۔ لیکن میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہوئی کہ ایک ہی وقت میں میرے ہی دو ڈرامے آرہے ہیں جبکہ میں چاہ رہی تھی کہ میرے دونوں ڈرامے مختلف اوقات میں ٹیلی کاسٹ ہوں اور دیکھے جائیں، اس لیے کہ بہت محنت اور پیار سے لکھے ہوئے ڈرامے تھے۔ ایک ہی وقت میں نشر ہونے کا مطلب تھا کہ مجھ سے ہی، میرا مقابلہ ہو رہا ہے اب میں کسی کو یہ نہیں کہہ سکتی کہ اسے دیکھیں اور اسے نہ دیکھیں۔

اور آج کل ایک پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوں۔ وہ بھی ان شاء اللہ جلد آن ائیر آئے گا ایک بڑے چینل سے اور اس کی شوٹ آج کل جاری ہیں۔

"چلیں۔ ٹھیک ہے۔ ڈراموں پہ بات کرنے سے پہلے آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

"میرا تعلق لاہور سے ہے اور ہم چار بہن بھائی ہیں۔ والد صاحب کا 25 اکتوبر 2023ء کو انتقال ہوا، بہت ہی مشکل اور بھاری وقت ہم پر گزرا ہے۔ ابھی تک میں اس غم سے نکل نہیں پائی ہوں۔ میں گھر میں بڑی ہوں۔ باقی بہن بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ شادی کو تقریباً انیس سال ہو گئے ہیں اور میرے دو بچے ہیں۔ والد صاحب بہت سپورٹیو تھے اور میرے کام سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اس طرح والدہ صاحبہ بھی بہت سپورٹیو ہیں میری بہن اور ایک بھائی شادی شدہ ہیں جب کہ ایک ابھی اچھی لڑکی کے انتظار میں ہیں اور ہاں میرے میاں صاحب یو اے ای میں ڈاکٹر ہیں۔"

"ڈائجسٹ کی دنیا سے ڈراموں کی دنیا میں کیسے آئیں؟"

"میں نے شروعات ڈائجسٹ سے کی 2014ء میں میرا پہلا ناول شعاع میں آیا تھا۔ میرے ناولز جو شعاع خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد 2015ء میں ہی "اے آر وائی" سے آفر آئی تھی ڈرامہ لکھنے کی اور یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات تھی۔ چونکہ میں بہت نئی تھی لکھنے کی دنیا میں تو "اسکرپٹ رائٹنگ" کو ہینڈل کرنا میرے لیے آسان نہیں تھا چنانچہ میں نے ان سے معذرت کر لی۔ اس وقت میری ایک کہانی اپروو بھی ہو چکی تھی۔ جو کہ معذرت کے بعد میں نے "ندامت" کے نام سے خواتین ڈائجسٹ میں بھیجا اور الحمدللہ اس ناول کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔"

پھر ایک اور چینل سے آفر آئی۔ ان سے بھی میں نے معذرت کر لی کہ ابھی مجھے اپنی تحریر میں نکھار لے کر آنا ہے کیونکہ میں ابھی، اس فیلڈ میں نام پیدا کرنا چاہتی ہوں اور اپنی تحریر میں پختگی لانا چاہتی ہوں۔

2018ء میں مجھے احساس ہوا کہ اب میں ڈرامہ رائٹنگ کی طرف آ سکتی ہوں۔ میں نے کچھ لوگوں سے اسکرپٹ کے لیے رابطہ قائم کیا۔ مگر بات وہی ہے کہ جب ایک چیز آپ کی جھولی میں آ کر گرے اور آپ اہمیت نہ دیں اور کچھ عرصے کے بعد خود کسی کے دروازے پر جائیں تو آپ "سائل" ہو جاتے ہیں۔ بہرحال تھوڑی سی جدوجہد کے بعد الحمدللہ 2019ء تک میرے چار سیریلز اپروو ہو چکے تھے۔ وہ بھی دبئی میں رہتے ہوئے کہ میں پرسنلی اپروچ نہیں کر سکتی تھی، ٹیلی فون کی حد تک ہی رابطہ تھا مختلف چینلز سے...... اور یہاں میں ایک شخصیت کا نام ضرور لینا چاہوں گی جنہوں نے میری بہت مدد اور حوصلہ افزائی کی اور وہ ان دنوں "بول" کے کونٹینٹ ہیڈ تھے۔ فصیح باری خان تو میں نے ان کو میسیجز کیے کہ۔

"فصیح بھائی، مجھے موقع دیجیے گا تو انہوں نے کہا بول تو اپنا کام سمیٹ چکا ہے اور بڑے اچھے انداز میں کہا کہ میں آپ کو کہیں ریفر کرتا ہوں؟"

میں تھوڑی سی مایوس ہو گئی کہ کہاں ریفر کریں گے۔ مگر چند دن کے بعد ان کا میسج آیا۔

"میں نے فلاں جگہ پر آپ۔ کے لیے بات کی کہ آپ اچھا لکھتی ہیں۔ آپ ان کے ساتھ رابطہ کریں۔"

مجھے احساس ہوا کہ ابھی کچھ لوگ اچھے ہیں جو

pklibrary.com

دوسروں کا خیال رکھتے ہیں، تو فصیح بھائی وہ نام ہے جس نے ۔۔ ایک پروڈکشن ہاؤس میں میرا تذکرہ کیا اچھے لفظوں میں۔

میں نے کہانی بھیج دی۔ اس سے پہلے میری اپنی کاوش پر بھی دو سیریلز اپروو ہو چکے تھے۔ مگر کووڈ کی وجہ سے کام سلو ہو گیا اور یہ وقت بھی گزر گیا۔ اور میرا سیریل "صلہ محبت" آن ایئر ہوا اور بس پھر اللہ نے ہاتھ تھام لیا، لوگ مجھ سے خود سے رابطہ کرتے ہیں اور مجھے اکثر اوقات معذرت کرنی پڑتی ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ مجھے پاپڑ نہیں بیلنے پڑے۔ حالانکہ پروڈکشن ہاؤسز کے پاس بے تحاشا اسکرپٹ ہوتے ہیں۔ بس مجھ پر اللہ کا کرم ہوتا چلا گیا۔ ورنہ مجھ سے پہلے اور مجھ سے بعد میں جدوجہد کرنے والی خواتین آج تک جدوجہد کر رہی ہیں۔

صلہ محبت میرے لیے بریک تھرو ثابت ہوا۔ لیکن اس سے پہلے میرا سب سے پہلے جو پروجیکٹ آن ایئر ہوا وہ مکافات کے سلسلے کے کچھ ڈرامے تھے جو ایک چینل کے رمضان کی تشریات کی سیریز تھی 2020ء میں یہ ڈرامے آن ایئر ہوئے اور اس کے بعد ہر سال "مکافات" میں میرے ڈرامے چلتے ہیں اور بہت ریٹنگ لیتے ہیں۔"

"کہانیاں تخیل کی پیداوار ہوتی ہیں یا اس معاشرے کی؟"

"کہانیاں کہیں نہ کہیں ہمارے معاشرے میں ہی گھوم پھر رہی ہیں اور ہم اپنے مشاہدے سے کوئی نہ کوئی پوائنٹ اٹھا لیتے ہیں اور اس سے "کھیلنا" شروع کر دیتے ہیں۔ اور کہانی کے حساب سے مسالہ شامل کرنا پڑتا ہے۔ مجھے "امثل" آپی کے وہ الفاظ، وہ جملے یاد ہیں جو انہوں مجھ سے کہے تھے کہ تمہاری تحریر میں ایک تازگی ہے۔ ایک نیا پن ہے۔ لہٰذا تم مجھے مزید کہانیاں بھیجو۔" اور آپ یقین کریں کہ جب مجھ سے لکھوانے کی بات ہو رہی ہوتی ہے تو امثل آپی والی بات ہی سب دہرا رہے ہوتے ہیں کہ "نادیہ کی کہانی میں ایک نیا پن ہوتا ہے" اور شاید ایسا اس لیے کہا جا رہا ہوتا ہے کہ میرا ایک اپنا تجربہ ہوتا ہے۔ ایک وژن ہوتا ہے۔ ایک مشاہدہ ہوتا ہے۔ تو میری یہ تعریف میرے لیے بہت حوصلہ افزا ہوتی ہے۔ باقی کچھ کہانیاں میری ہوتی ہیں۔ کچھ کہانیوں کے لیے لائسنز دی جا رہی ہوتی ہیں۔

"دل ہی تو ہے" سو فیصد میری کہانی ہے اس نام سے میرا ایک ناول بھی آ چکا ہے جو میں نے "دل ہی تو ہے" اور ندامت یعنی دو کہانیوں کو مکس کر کے لکھا ہے تو جو لائسنز دی جاتی ہیں ان پر بھی بہت ذہن لگانا پڑتا ہے۔"

"کہانیوں میں رائیٹر کی زندگی کا بھی عکس ہوتا ہے؟ اگر یہ سوال میں آپ سے بھی پوچھوں تو؟"

"رائیٹر کا مشاہدہ شامل ہوتا ہے عکس نہیں...... اور جو پوزیٹو چیز نظر آ رہی ہوتی ہے، وہ ہمارا عکس ہوتا ہے۔ اگر ایک کہانی ساس بہو کے مسئلہ پر چل رہی ہے تو اس میں ہمارا ذاتی عکس کہاں سے آ جائے گا۔ میرا عکس "دل ہی تو ہے" میں ہے جہاں میں ایک پرفیکٹ، پیاری سی ساس سسر دکھا رہی ہوں جو اپنی بہو سے اتنا پیار کر رہی ہے کہ اس کی خاطر اپنے بیٹے کو ڈانٹ رہی ہوتی ہے۔ ایک ایسی پھوپھو دکھا رہی ہوں جو بری نہیں ہے تو یہ میرا عکس ہے۔ ماشاء اللہ اس کی اتنی ہائی ریٹنگ آ رہی ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے اور اتنے اچھے کمنٹس آ رہے ہیں کہ حوصلہ بڑھ جاتا ہے کہ اتنے اچھے ساس سسر۔ اتنی اچھی پھوپھو، اتنے اچھے ماں باپ اور فیملی ممبر اتنے اچھے دوستوں کی طرح ہیں۔ اس میں جو ایشو ہیں وہ اور طرح کے ہیں۔ اپنی اصلی زندگی میں، میں بھی خالہ ہوں۔ پھوپھو ہوں تو جب میں ایسی نہیں ہوں تو کرداروں کو برا کیوں دکھاؤں...... اور جہاں ہم برا دکھاتے ہیں، وہاں ہماری مجبوری ہوتی ہے وہ ہمارا عکس نہیں ہوتا، ہمارا مشاہدہ ہوتا ہے۔"

"ایک ڈرامہ کی تیاری میں آپ کی کیا ذمہ

pklibrary.com

داری ہوتی ہے؟"

"بہ حیثیت رائیٹر کے ہماری ذمہ داری کہانی اور اسکرپٹ ہوتا ہے۔ اگر بہت تیز کام کیا جائے تو ایک اسکرپٹ کے مکمل ہونے میں ایک سال لگ جاتا ہے۔ جیسے کہ میں نے سیریل "من آنگن" لکھا تو اسے ایک سال لگ گیا اور ساتھ ساتھ آن ایئر بھی تھا اور ماشاءاللہ اسے پذیرائی بھی ملی۔

اور یہ پہلا اسکرپٹ تھا جو بہت جلدی آن ایئر بھی ہو گیا تھا۔ تو ایک سال سے دو سال کے عرصے میں اسکرپٹ مکمل ہوتا ہے اور اداکاروں کے بارے میں ہمیں صرف بتایا جاتا ہے باقی تمام ذمہ داری ڈائریکٹر اور پروڈکشن ہاؤسز کی ہوتی ہے اور لوکیشن کا بھی یہی حال ہے۔ میں تو ویسے بھی دبئی میں رہتی ہوں تو میرا کوئی تعلق نہیں ہوتا دیگر چیزوں سے۔

ڈائریکٹر سے میری بات کرواتے ہیں صرف "آئی ڈریم" پروڈکشن والے ان کے ساتھ "تیری راہ میں" اور "دل ہی تو ہے" کیا ہے میں نے۔ اور انہوں نے ہر چیز نہ صرف مجھ سے شیئر کی بلکہ یہ بھی کہا کہ جو لوکیشن ہم آپ کو بتا رہے ہیں، اس کو ذہن میں رکھ کر آپ اسکرپٹ لکھیں۔"

"سازشیں، غیبتیں، منافقت سے بھرے ڈرامے کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"ہمارے اردگرد بھی یہی کچھ تو ہو رہا ہوتا ہے۔ ہمارا تو سیاسی سسٹم بھی تو ایسا ہی ہو گیا ہے۔ آپ نیوز چینل لگائیں تو آپ کو سازشیں سنائی اور دکھائی دیں گی اور یہ تو ہیومن نیچر ہے اور سوشل میڈیا اور پھر اسکرین شارٹس۔ سب غیبتیں ہی تو ہیں۔ سب ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں اپنی رائے کا اظہار بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ اور لگائی بجھائی بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہم پی ٹی وی کے ڈرامے "وارث" کا ذکر کریں تو کیا وہ سازش کے بغیر تھا۔ کیا اس میں سازشیں نہیں تھیں؟ غیبت نہیں تھی؟ "عروسہ" ڈرامہ جسے ہم آج تک یاد کرتے ہیں، کتنا بہترین ڈرامہ

تھا۔ کیا وہ سازش اور غیبت کے بغیر تھا؟ اس میں بھی ساس بہو کے مسائل تھے۔ تینوں نے بھابھی کو نکلوا دیا تھا۔ ایک بیٹی چھین لی گئی تھی اور ایک باپ کے پاس تھی تو ایک ماں کے پاس تھی تو کیا وہ سازش نہیں تھی؟ سازشیں اور غیبتیں ہمیشہ ہمارے ڈراموں کا حصہ رہی ہیں۔ ہمارے ناولز کا بھی حصہ رہی ہیں۔ اس کے بغیر تو کوئی تحریر مکمل نہیں ہے۔"

"ہمارے یہاں لوگ ڈرامے تو بہت شوق سے دیکھتے ہیں مگر کسی کو رائیٹر کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا ہوا کہ آپ کے ڈرامے کی تعریف ہو رہی ہو اور آپ پاس ہی بیٹھی ہوں اور دل چاہتا ہے کہ پہچان جاؤں؟"

"سراہے تو سامنے سے ہی جاتے ہیں عدم موجودگی میں تو رائیٹر کو برا بھلا ہی کہا جاتا ہے کہ کیسے رائیٹر ہیں۔ مگر اب سوشل میڈیا آ گیا ہے اور اس کے ذریعے سے لوگ آپ کو بھی جانتے ہیں اور آپ کے نام کو بھی۔ اب گمنامی والی بات نہیں رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں تو رہتی ہی دبئی میں ہوں، جب بھی پاکستان جانا ہوتا ہے تو میری فیملی نے پہلے سے ہی میرا تعارف کروایا ہوا ہوتا ہے۔ تو مجھے عام

جگہوں میں نہ پہچانا جائے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اور ایسا اتفاق ہوا نہیں کہ میرے ہی ڈرامے کا ذکر میرے سامنے کیا جارہا ہو اور ذکر کرنے والوں کو میرا پتا نہ ہو۔ بچوں میں ہماری طرح کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ان کی اپنی کریٹویٹی ہے اور وہ ماشاء اللہ ابھی پڑھ رہے ہیں ان میں ٹیلنٹ نظر آتا ہے کہ وہ تقریری مقابلوں کے لیے خود تقاریر وغیرہ لکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"اب کچھ نجی سوال؟"

"گھر اور سسرال میں کون آپ کی تحریروں کو ڈراموں کو پسند کرتا ہے۔"

"میکے میں تو سب ہی میرے ڈرامے پسند کرتے ہیں۔ سسرال میں بھی ذکر نہیں ہوا۔ ہاں ایک فیملی نے ذکر کیا تھا۔ مجھ سے پوچھا تھا مگر پھر دوبارہ ان سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب کہ میکے کے تو سب لوگ میری والدہ سے میری پھوپھو وغیرہ پوچھتی رہتی ہیں کہ کب آرہا ہے ڈرامہ اور وہ خود بھی پروموو دیکھ کر رابطہ کرتی ہیں کہ کب آن ائیر ہوگا تمہارا ڈرامہ اور پھر آگے اپنے جاننے والوں کو اور سسرال والوں کو بتاتی ہیں کہ نادیہ کا ڈرامہ آنے والا ہے، نہ صرف دیکھتے ہیں سب بلکہ پسند بھی کرتے ہیں۔

میرا ستارہ "ورگو" ہے اور ورگو والے تھوڑے جذباتی ہوتے ہیں۔ حساس ہوتے ہیں اس لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر میں اپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔ لیکن بہ حیثیت ایک انسان کے میں بہت اسٹرونگ ہوں۔

مجھے بیکنگ بہت پسند ہے۔ مجھے ٹریولنگ بہت پسند ہے اور سیاست سے بہت لگاؤ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست میرا سبجیکٹ رہا ہے۔ سیاست میں بات چیت بحث مباحثہ بھی ہوتا رہتا ہے، میرے میاں صاحب سیاست پر بہت بحث کرتے ہیں۔

اور لکھنے کے علاوہ میں ایک بہت ہی گھریلو خاتون ہوں۔ جیسا کہ آپ کو بتایا کہ میں دبئی میں رہتی ہوں اور میرا بہت بڑا حلقہ احباب نہیں ہے۔ مجھ سے اتنے سارے لوگ میچ نہیں ہوتے تو میں چند لوگوں کے بیچ میں ہی رہنا پسند کرتی ہوں۔ زیادہ لوگوں کے درمیان رہنے سے ٹائم بھی بہت ضائع ہوتا ہے۔ آپ کسی کو اپنا وقت دے رہے ہوتے ہیں تو آپ اپنا بہت نقصان کر رہے ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی بہت تیز رفتار ہے اور آپ کی بہت سی ذمہ داریاں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کو خود اٹھانی ہوتی ہیں، آپ کا کوئی دوسرا مددگار نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی آپ چاہتے ہیں کہ آپ دوسروں پر انحصار کریں۔

میرے لکھنے کا وقت صبح کا ہوتا ہے۔ صبح کے وقت بچوں کو ڈراپ کرتی ہوں اور واپس آ کر جو چند گھنٹے مجھے تنہائی کے ملتے ہیں ان میں، میں اپنا کام کرتی ہوں۔ پھر میرا فیملی ٹائم شروع ہو جاتا ہے۔ کوکنگ سے مجھے بہت دل چسپی ہے اور میرے گھر والوں کو میرے ہاتھ کے پکے کھانے بہت پسند ہیں۔ اور سسرال والوں کو بھی میرے ہاتھ کا ذائقہ اچھا لگتا ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو بہت شوق سے میرے کھانے کھاتے ہیں۔ مطلب میرے پکے ہوئے۔

تو بس زندگی رواں دواں ہے۔ اور وقت اچھا گزر رہا ہے، آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے موقع دیا بولنے کا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نادیہ احمد صاحبہ سے اجازت چاہی، اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆☆

pklibrary.com

نئے سال کی دہلیز پر

ادارہ

رتیں بدلتی رہتی ہیں۔ موسم آتے جاتے رہتے ہیں
زندگی بھی اسی طرح کئی موڑ لیتی ہے کبھی گرم، کبھی سرد، کبھی خزاں اور کبھی بہار..... وقت گزر جاتا ہے لیکن ہماری زندگی پر گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ خوش گوار لمحات، کچھ تلخ یادیں، کچھ آنسو، کچھ مسکراہٹیں۔ یہ سب زندگی کے رنگ ہیں، ان ہی سے زندگی تشکیل پاتی ہے۔

حسب روایات نئے سال کے آغاز پر ہم نے پرچے میں اپنی قارئین کی شمولیت کے لیے سروے کیا ہے۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ گیا سال آپ کو کیا دے گیا۔ کوئی خوشی، کوئی دکھ، کوئی پچھتاوا یا آگہی کا کوئی لمحہ۔

2۔ پچھلے سال کتنی تقریبات اٹینڈ کیں، کسی تقریب کا کوئی یادگار واقعہ لکھیں

3۔ موسم سرما میں کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ آپ کے گھر میں موسم سرما میں کون سی ڈش یا حلوہ جات خاص طور پر بنائے جاتے ہیں؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

سونیا ربانی قاضیاں محلہ بالا

1۔ دسمبر سے بڑا ہی عجیب سا رشتہ ہے میرا اور اکثر ہی دسمبر، میرے لیے کچھ نہ کچھ عجیب لے کر آتا ہے تو دسمبر کے ساتھ ہی عجیب سی اداسی بھی آجاتی ہے۔ خیر ہم بات گزرے سال کی کر رہے ہیں تو جناب یہ سال بلکہ یہ دسمبر ہمیں ڈاکٹر فوزیہ کا یہ پیغام دے گیا کہ سونیا تم اب ٹھیک ہو۔ دوائی کی ضرورت نہیں ہے جو تھوڑا سا مسئلہ باقی ہے وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ خوش رہا کرو اور ٹینشن بالکل نہیں لینی کبھی بھی۔

(یعنی میری دوائی سے گولیوں سے جان چھوٹ گئی ہے)

اور خوشیاں؟ تو جناب، جب جب ہمارے افسانے لگے۔ ہمیں خوشیاں ملیں۔

پچھتاوا؟

میں نے کبھی کہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے۔ سوئی کو چھوڑے گے کام پہ، چھوڑی گئی چیزوں اور باتوں پہ کبھی پچھتاوا نہیں ہوگا مگر یا خدا کاموں، چیزوں اور باتوں کی الگ بات ہے مگر کسی رشتے کو کسی اپنے کو چھوڑنا الگ بات؟

لیکن مر جاؤں تب بھی نہ مانو کہ میں کبھی کسی لمحہ پچھتاتی ہوں لیکن صبح، ناشتے میں پراٹھے کے ساتھ ملائی نہ کھانے پر اب پچھتاوا ہوتا ہے کبھی کبھی ہاہاہا۔

2۔ جناب، ہماری طرف تقریبات شادی کی ہی ہوتی ہیں۔ تو جنوری میں بچوں کے چاچو ضیاء کی شادی ہوئی تھی مگر تب صحت خراب رہتی تھی۔

اور اب سال کے آخر میں اللہ اللہ کر کے ہمارے فیورٹ اور بہت ہی لاڈلے کزن نبیل بھی شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ثمرہ، دلہن بن کر ان کے آنگن اتر آئیں۔

(ویسے نبیل ابھی تک یقین نہیں آرہا ہے کہ تم

بھی کسی کے سرتاج بن چکے ہو)

اس شادی میں بہت دل سے شرکت کی اور یادگار لمحے کہہ لیں۔ جس رشتے دار نے دیکھا کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ اپنے گاؤں کے لوگ مجھے اماں کی بہو سمجھ کر ملتے رہے۔ اور جب پتا چلا تو حیران رہ گئے کہ کہاں یہ صحت مند عورت اور کہاں وہ پتلی سی اسمارٹ سوہنی۔

3۔ پیاری لڑکیوں! میں تو کوئی بھی حلوہ نہیں کھاتی ہوں۔ ولید پہلے کھاتا تھا کدو کا حلوہ، وہ بھی اپنی بتول کے ہاتھ کا، بتول بی بی زیبی کو پیاری ہوئی تو میرے بچے نے حلوہ بھی چھوڑ دیا۔ میرے دونوں بچوں کو مونگ پھلی پسند ہے۔ تو میرا کام ہوتا ہے وہ اچھی اور تازہ لے لوں ویسے سسرال میں اور میکے میں بھی کدو، گاجر کے حلوے بنائے جاتے ہیں۔

صدف ناصر گوجرانوالہ

1۔ گزرا سال اللہ کا شکر ہے بے حد اچھا رہا۔ شاید اس لیے کہ سال کے پہلے دن ہی ہم سب (میں اور بچے) ابو (مسز) کی سرپرائز برتھ ڈے کرتے ہیں۔ ان کی دعاؤں سے پورا سال اچھا گزرتا ہے۔ فروری میں بچوں کے شان دار رزلٹ، حفظ کی سعادت، قربانی کی توفیق، شعاع اور خواتین میں تبصروں اور سروے میں مسلسل شرکت، بارا ربیع الاول کی لازوال خوشی غرض کہ خوشیاں ہی خوشیاں نصیب ہوئیں۔ الحمدللہ! اللہ سب کو خوشیاں دے (آمین)

دکھ بھی زندگی کا حصہ ہی ہیں۔ ان سے فرار ممکن نہیں۔ آگہی کا لمحہ ہے یا کوئی خوب صورت ترین تحفہ ملا ہے۔ ماہ نومبر میں، رات تہجد نائم خواب دیکھا کہ (صدف، آپ نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے۔ اس کو کسی کو نہ بتائیں)

2۔ پورے سال میں تین شادیاں، دو بڑی قربانیاں، ''ایک عقیقہ'' ایک منگنی اور پانچ سے چھ محفل نعت اور یٰسین مبارک کی تقریبات اٹینڈ کیں۔ سب ہی کو خوب انجوائے کیا۔ ہر فنکشن اور محفل ہی یادگار ٹھہری۔

3۔ جی بالکل! بجا فرمایا آپ نے۔ سرما تو نام ہی نت نئے کھانوں کا ہے۔ جب سرما کے آتے ہی گلی سے پہلے ساگ والے کی آواز سنائی دیتی ہے تو بے اختیار خوشی سے اچھل پڑتے ہیں۔

پھر جناب، سردیاں اور ہمارے گھر کی مشہور اور مخصوص ڈشیں ہوتی ہیں۔ جن میں سرفہرست ساگ، مکس سبزیاں (آلو، مٹر، گاجر، میتھی) مٹر پلاؤ، گاجر کا حلوہ (دیسی گھی کا) گجریلا، آلو، مولی اور مکس سبزی کے پراٹھے ہیں۔ جو نا صرف ہم خود کھاتے ہیں بلکہ ہمسایوں اور رشتہ داروں کو بھی کھلاتے ہیں۔ ہمارے رب نے صحیح فرمایا نا ''پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

جویریہ مریم

1۔ گیا سال کیا دے کر گیا۔ بہت سے خواب تھے جو پورے نہیں ہوئے۔ اس سال سرفہرست اپنے پیارے ابو جی کے لیے کچھ کرنے کا خواب، میں اس سال لکھ بھی نہیں پائی، بہت کوشش کے باوجود جس کا دکھ ہے پچھتاوا..... پچھتاوے بھی ہیں ایک دو..... کہ مجھے صرف لکھنے پہ فوکس رکھنا تھا۔ میں نے کچھ زیادہ اور نیا کرنے کے چکروں میں خود پہ بوجھ لے لیا۔ نہ وہ کام کر پائی جو کرنا چاہتی تھی۔ نہ ڈائجسٹ کے لیے یکسوئی سے لکھ پائی۔ امی نے میری حالت دیکھ کر کہا۔ ''بیٹا، سارے جھنجھٹ چھوڑو اور اپنے رسالوں میں باقاعدگی سے لکھو۔''

جہاں تک بات ہے خوشیوں کی۔ تو اللہ نے خوشیاں بھی دیں ابو نے لیپ ٹاپ لے کے دیا لکھنے کے لیے جو کہ میرے لیے بہت بڑی خوشی تھی۔ پھر موبائل لے کے دیا اور اس سال میری تین کہانیاں شائع ہوئی ہیں، خواتین میں، کرن میں بھی۔ اس سال میری دوستی ہوئی میری کومل آپی سے، یہ میرے لیے بہت بڑی خوشی ہے۔ تین سال کا تعلق دھیرے دھیرے بہنوں جیسی محبت اور دوستی میں ڈھل گیا۔ اور اس سال آگاہی کا در بھی وا ہوا۔ کہ یہ دولت، شہرت سب آنے جانے والی ہوتی ہیں۔ سکون کسی چیز میں نہیں ملتا سوائے اللہ کی یاد کے۔ اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف۔

2۔ کوئی تقریب اٹینڈ نہیں کی تو یادگار لمحہ کہاں سے آئے۔

3۔ سردیوں میں ہمارے گھر ویسے تو ساگ،

مچھلیاں وغیرہ بنتے رہتے ہیں لیکن جو خاص چیز اور جو سردیوں میں اہتمام سے بناتے ہیں وہ ہے بہت ہی مزے دار حلوہ جس میں ڈھیروں ڈھیر دودھ، ایلو ویرا، بادام، دیسی گھی، کھوپرا، چاروں مغز اخروٹ، کاجو، شکر وغیرہ ڈال کے بناتے ہیں اور اچھی خاصی انرجی ملتی ہے اس کو کھا کے۔

انیسہ عائش......کوٹ رادھا کشن قصور

1۔ ہائے بڑا مشکل سوال پوچھ لیا آپ نے، جی تو گزرا سال سب کچھ ہی دے کر گیا۔ خوشیاں، دکھ، پچھتاوا اور آگہی بھی۔ گزرے سال میں گھر سے نکل کر پہلی بار جاب کے تجربے سے گزرنا پڑا۔ بہت سے تجربات، بہت کچھ نیا سیکھنے کو ملا۔ تلخ گزرا کہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ خوشی کی بات کی جائے تو ہمارے لکھنے کے شوق میں پیش رفت آئی۔ تحریر شائع ہوئی پہلی بار اعزازیہ ملا، جسے ہم نے ابھی تک اعزاز سمجھ کر سنبھال رکھا ہوا ہے (ہاں جی مسکرالیں ہمارے بچپنے پر)

2۔ پچھلے سال واقعتاً کئی تقریبات اٹینڈ کیں مگر یادگار تقریب، گزشتہ ماہ میں ہونے والی ہماری کولیگ ثناء کی شادی رہی۔ وہ یوں کہ ثنا کی ڈیٹ فکس ہوتے ہی ہم پر ایکسائٹمنٹ سوار ہوگئی۔ تیاریاں، گفٹ کی خریداری، خیال ہی خیال میں تقریب سے لطف اٹھانا۔ عین شادی والے دن گویا سانحہ ہوگیا (وہ نہیں بتائیں گے) خراب طبیعت رورو کر مزید خراب کرلی۔ صبر کرکے بیٹھ گئے۔ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کی امید رہ گئی۔ ہر راہ مسدود اور پھر عین وقت پر آناً فاناً ہر کام ہوتا چلا گیا اور ہم تقریب میں پہنچ ہی گئے۔ اس واقعے سے اللہ تعالیٰ پر بھروسا اور ایمان مضبوط ہوگیا کہ ورنہ ساری عمر کا پچھتاوا رہتا تھا کہ کیوں نہ گئے۔

3۔ ڈشز اور حلوہ جات کوئی خاص تو نہیں بنتے مگر موسم سرما، کھانوں پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے کہ سارے خشک سالن آلو گاجر، آلو گوبھی، شلجم، مولی، آلو بینگن وغیرہ وغیرہ، شوربے والے سالن کے لیے ترس جاتے ہیں۔ اور تو اور ابا جان کو میتھی، پالک پسند ہے تو امی کو ساگ سے لگاؤ، یوں سرما میں ہمارے والدین کو اپنی ہری ہری سوجھتی ہے کہ ہم بس کراہ کر رہ جاتے ہیں۔

امی کا بس چلے تو ساری سردی ساگ ہی کھلائے جائیں بس۔

حلوہ جات میں گاجر کا حلوہ کئی بار بنتا ہے اور ہر بار انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔ چاول کی پنی پنیاں، سوجی کی ٹکیاں اور ڈھیر ساری چیزیں ڈال کر بنائی جانے والی پنجیری، سرما کا لطف دوبالا کر جاتی ہیں۔

رضوانہ وقاص......کرلاں ہری پور

1۔ گیا سال ہمیں الحمدللہ اللہ پاک کا شکر ہے جس نے ہمیں اتنی بڑی خوشی دی، میں پھپھو بن گئی عدنان دیا اللہ تعالیٰ نے، اللہ پاک عدنان کو صحت وتندرستی والی لمبی زندگی دے (آمین ثم آمین)

سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ بھی ہوئی احمد

pklibrary.com

نے قرآن پاک پڑھ لیا۔ اللہ پاک میرے بچوں کو کل کے بچوں سمیت صحت والی زندگی عطا کرے اور میں اپنے بچوں کو کامیاب دیکھ سکوں (آمین ثم آمین)

2۔ پچھلے سال میں نے دو تقریبات اٹینڈ کیں دونوں شادی کی، ایک رفاقت کا ولیمہ دوسرا محسن کا ولیمہ، یادگار بات یہ ہوئی کہ جس دن محسن کا ولیمہ تھا تو اس دن ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ ولیمہ عثمان میرج ہال میں تھا تو میں اپنے شوہر کے ساتھ اور پوری فیملی بھی تھی ساتھ، بلکہ خاندان ایک ساتھ گئے۔ بہت ہی مزہ آیا کیونکہ میں اب کہیں آجا نہیں سکتی تو یہ یادگار رہا کہ میرے شوہر میرے ساتھ میں ان کے ساتھ۔

امی کو بتایا کہ میرا ابھی لکھنا کہ میں بھی اتنے ٹائم بعد راولپنڈی ولیمہ اٹینڈ کرنے گئی۔ ابھی صبح گیارہ تاریخ کا سموہ والی سائیڈ بھی ولیمہ کی دعوت ہے دل بہت کر رہا ہے لیکن خود اب چل نہیں سکتی تو نہیں جا رہی اب زیادہ وہیل چیئر استعمال کرنے لگ گئی ہوں۔ اپنی بیماری کے حوالے سے ایک شعر عرض کر رہی ہوں ضرور جلد دینا ہے شکریہ۔

نہ چلتی تیز ہوائیں نہ گرتے پھول بہاروں کے
نہ ہوتی میں بیمار نہ بچھڑتی اپنے پیاروں سے

(رضوانہ! آئندہ خط لکھیں تو اپنا فون نمبر ضرور لکھیں آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔)

3۔ سرما میں ہر چیز کا مزہ اس لیے آتا ہے کہ گرمی نہیں ہوتی۔ اور گرم چیز کھانے میں مزہ آتا ہے کہ بندہ گرم ہو جائے ساگ بنتا ہے۔ مکئی کی روٹی اور گاجر کا حلوہ بچے اتنا نہیں کھاتے کہنا تو مونگ پھلی اور پتا نہیں کیا کیا ڈالتی ہیں۔ شکر قندی کراچی سے نانو بھیجتے ہیں۔ وہ بہت ہی مزے کی ہوتی ہے ابال کر بھی کھاؤ اور تندور میں یا چولہے میں کوئلوں پر بھی پک جاتی ہے۔ چاٹ مسالہ ڈال کر کھاؤ بہت ہی مزہ آتا ہے۔ مونگ پھلی، گڑ اور مچھلی پسند ہے کھاتے کھاتے آخر میں جو آخری مونگ پھلی کڑوی آجاتی ہے۔ ہمارا مزہ خراب ہو جاتا ہے۔ ناں آپ کے ساتھ ہوا ہے کبھی۔ (ایک بار نہیں بہت بار ایسا ہوا ہے ہمارے ساتھ بھی)

میشے علی خان...... خانیوال

سب سے پہلے تو ادارہ کے تمام اراکین اور تمام قارئین کو سال نو مبارک، اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ سال نو ڈھیروں مبارک ساعتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو (آمین) اور میرے وطن پہ "اترے وہ فصل گل کہ جسے اندیشہ زوال نہ ہو" آمین ثم آمین

1۔ گیا سال مجموعی طور پر اچھا ہی گزرا خوشی جو بلاشبہ میرے لیے میری زندگی کی اب تک کی سب سے بڑی خوشی ہے، وہ یہ کہ میری جان سے عزیز دوست عائشہ خان (جو کہ میرے ساتھ اسکول میں پڑھاتی بھی ہیں) نے مجھے برتھ ڈے گفٹ دیا دراصل ہمارے ہاں سالگرہ منانے کا رواج نہیں، ہاں تحائف دینے پر کوئی پابندی نہیں (لیکن مجھے تو کبھی وہ بھی نہیں ملا) تو یہ میری زندگی کا سالگرہ کا پہلا باقاعدہ تحفہ تھا۔

دکھ بھی عائشہ کی طرف سے ہی ملے۔ بہت ہرٹ ہوئی لیکن پھر بھی عائشہ سے محبت جوں کی توں برقرار ہے۔ آگہی یہ ملی کہ آج کے دور میں طاقت ہی سب کچھ ہے، ورنہ آج فلسطین کے نہتے مسلمانوں پر جبر و ظلم کی نئی داستان نہ رقم ہو رہی ہوتی۔

2۔ تقریبات تو یہ کہ چھ نومبر کو چھوٹی کی انگیجمنٹ ابھی تو بہت یادگار رہی، مزے دار واقعہ اس حوالے سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرے ہونے والے بہنوئی (چھوٹی کے فیانسی) آئی ٹی آفیسر ہیں اور ہیں بھی پٹھان فیملی سے۔ (میں اپنے نام کے ساتھ خان عائشہ کی وجہ سے لگاتی ہوں)

یادگار واقعہ یہ کہ پچیس نومبر کو اسکول کے ساتھ ٹرپ پر گئی، تو یہ اس لحاظ سے یادگار ہے کہ یہ بھی میری زندگی کا ایسا پہلا ٹرپ تھا جس میں کوئی فیملی ممبر ساتھ نہ تھا۔ (ورنہ تو اس سے پہلے تعلیمی ادوار اور پھر اسکول جاب میں نبیلہ ساتھ ہی ہوتی تھی میرے)

3۔ جی ہاں بالکل درست، موسم سرما میں کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور مجھے تو موسم سرما میں بھوک بھی بہت لگتی ہے تو نمکو بسکٹ، سموسے اس طرح کی چیزیں بہت کھائی جاتی ہیں اور رات کو بستر میں گھس کر مونگ پھلی کھانے کا مزہ ہی اور ہے۔

pklibrary.com

پکوڑے اور گاجر کا حلوہ، بیسن کا حلوہ بہت بنائے جاتے ہیں اور یہ چیزیں تو میری قاری بہنوں کو بنانی آتی ہوں گی، پھر بھی بیسن کے حلوہ کی ترکیب لکھ رہی ہوں چکی اس ترکیب سے بہت مزے کا بنتا ہے۔

بیسن	ایک کپ
چینی	آدھا کپ
انڈے	دو عدد
گھی	حسب ضرورت
الائچی، بادام، ناریل	حسب پسند

ترکیب:

سب سے پہلے دودھ میں چینی، انڈے ڈال کر اچھی طرح پھینٹ کر لیں چینی اچھی طرح مکس ہوجائے۔ برتن میں گھی گرم کرکے اس میں الائچی کڑکڑائیں پھر بیسن ڈال کر اتنا بھونیں کہ بیسن خوشبو دینے لگے اور گھی الگ آجائے پھر اس میں دودھ، انڈے اور چینی کا مکسچر ڈال کر پانچ سے سات منٹ کے لیے بھونیں پھر اتارنے سے پہلے حسب منشا بادام (کٹے ہوئے) اور ناریل پسا ہوا۔ ڈال کر نیچے اتار لیں۔ حلوہ تیار ہے۔

ریحانہ چوہدری...... مدو کے اندھیر

تین سو پینسٹھ اوراق پر مشتمل ڈائری کے آخری صفحات لکھے جارہے ہیں۔ ہماری عمر عزیز کا ایک اور قیمتی سال ختم ہونے والا ہے، گزرے ایام پر نظر دوڑانے کی کوشش کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ مگر غور کریں تو ایسا لگتا ہے کہ روزانہ طلوع آفتاب سے شروع ہونے والا دن غروب آفتاب ہونے تک ہماری جھولی میں مختلف تجربات کی سوغاتیں ڈال کے جاتا ہے۔ کبھی خوشی، کبھی غم، جب ہمیں زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولے جھلاتی دکھائی دیتی ہے اور کسی دن ہماری آنکھیں غموں کے دھوئیں سے غبار آلود ہوکر اشکبار ہوتی ہیں۔

خوش رہنے کو تو یہی بہت ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حرص سے پاک دل عطا فرمادے۔

ریحانہ چوہدری کے لیے بھی یہ سال بہت پرمسرت رہا۔ اللہ کے کرم سے بڑی صاحبزادی ارجمند شاہین کی شادی کے فرض سے اللہ تعالیٰ نے سبکدوش کیا۔ الحمدللہ اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ اللہ تیرا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔ ارسلان جو کہ میری اکلوتی اولاد نرینہ ہے۔ میری آنکھوں کا تارا ہے میرے دل کی ٹھنڈک ہے۔ چمن ہے ماشاء اللہ سے اس کی منگنی ہوئی ہے۔ دل کو بہت سکون ہوا ہے۔ ارسلان اور ارجمند کا ایل ایل ایم اور ایم فل مکمل ہونے پر انہیں ڈگریاں ملیں۔ میری ماہ نور گجرات یونی ورسٹی کی کوئز کمپٹیشن کی ونر بن کر ماشاء اللہ ٹاپ کوئز رہی اور سارہ نے بھی حسب معمول اپنے اسکول اور اپنی کلاس کی بہترین آل راؤنڈر اسٹوڈنٹ کے اعزاز کو برقرار رکھا اللہ تعالیٰ نے میرے بھانجے رضوان تارڑ کو شادی

pklibrary.com

کے چھ سال بعد بیٹی کی رحمت سے نوازا۔

خاندان میں ہونے والی تین اموات ایسی ہیں جنہوں نے دل کو دکھ دیا اور بہت زیادہ دیا۔ ایک میری بہن شمع نورین کے ہسبنڈ مبشر آفتاب کی موت ،ماموں زاد شہباز مرحوم کے نوجوان بیٹے فہد کی موت اور اس کی موت کے دوسرے دن میرے جواں سال چچازاد بھائی نعیم عباس کی موت کا دکھ بہت شدید تھا۔

اس سال کا سب سے بڑا دکھ، سب سے بڑا المیہ تو میرے خیال میں دیکھا جائے تو من حیث القوم اسرائیل کا فلسطین پر ظالمانہ حملوں کی صورت میں ہماری روحوں کو زخمی کرنے کا باعث بنا ہے۔

کوئی پچھتاوا یا آگاہی کا کوئی لمحہ؟

خوشی ہو یا غم کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کو ہم بہت عزیز سمجھتے ہیں مگر ان کے رویے ہمارے لیے آگاہی کے ایسے ایسے در وا کرتے ہیں جن سے نظر آنے والی صورت حال ہمیں پچھتاوں میں مبتلا کر دیتی۔

2۔ تقریبات تو ماشاء اللہ سے بہت اٹینڈ کی ہیں۔ سب سے یادگار شادی تو ارجمند کی ہی رہی۔ وہ رسومات کے سخت خلاف تھی نہ تو اس نے تصاویر اور مووی وغیرہ بنوائی نہ اسٹیج پر بیٹھی۔ اس کے سسرال والوں نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ بالکل سادگی سے سب انتظامات کیے مگر اس پر دنیا والوں اور فیملی والوں کو بہت اعتراض ہوئے۔

3۔ جی جناب سردی کا موسم ہو اور ساگ کا ذکر نہ ہو یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ جی تو نمبر ون چہ ہے ساگ اس کے بعد گڑ والے چاول۔

اللہ آپ کا بھلا کرے پھر نشاستہ ہے جو مجھے اور ارسلان کو بہت پسند ہے۔ (یہ گندم کو کچھ دن بھگو کر رکھ دیتے ہیں صبح شام اس کا پانی تبدیل کرتے ہیں کچھ دن بعد اس کو کوٹ کر گندم کا دودھ نکالتے ہیں پھر اس کو خشک کر کے دوبارہ آٹا بنا کر اسے سکھا لیتے ہیں بہت لمبا اور مشکل پراسس ہے پھر دیسی گھی میں بھونتے ہیں اور خشک میوہ جات ڈال کر برفی جیسی ٹکڑیاں بنا لیتے ہیں) وہ ضرور بنتا ہے۔

اس کے بعد چنے اور مونگ کی دال کے حلوے بناتے ہیں۔

حلوہ جات میں سرفہرست ہے گاجر کا حلوہ پھر سوجی کا حلوہ کبھی کبھی سوہن حلوہ اور انڈے کا حلوہ ہے۔

اور اسی کی پنیاں ہمیں ہمیشہ باجی کوثر بنوا کر دیتی ہیں مگر اس سرما ہم ان سے محروم ہی رہیں گے کیونکہ اس بار باجی امریکہ چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہم آپ سب دسمبر کو الوداع کہتے ہیں، 2023 کو الوداع کہتے ہیں۔ 2024 کو خوش آمدید کہتے ہیں اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ہمیں اپنے پسندیدہ لوگوں میں شامل فرمائے۔

فرحت ہاشمی ..... گوجرانوالہ

زندگی تو خوشی اور دکھ کے گہرے اور ہلکے رنگوں کے امتزاج سے ہی بنتی ہے مستقل تو کچھ بھی نہیں۔ خوشی ہو، غم ہو یا پچھتاوا، وقت کی سرکتی چادر سب کو ڈھانپتی جاتی ہے۔ وہ وقت بھی گزر گیا جو لگتا تھا کہ نہیں گزرے گا۔ اور وقت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ "یہ گزر جاتا ہے۔"

تقریبات کے معاملے میں ہم اتنے خود کفیل نہیں ہیں۔ (اب یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ ہمیں کوئی بلانا پسند نہیں کرتا..... ہاہاہا۔) بس اتفاقاً کوئی ایسی تقریب ہوئی ہی نہیں کہ ہم سج دھج کے اپنی خوب صورتی سے اس میں چار چاند لگا سکتے۔

موسم سرما میرا پسندیدہ موسم ہے۔ کمبل میں بیٹھ کے مونگ پھلی کھانا، ٹھنڈ میں چھت پر بیٹھ کے کافی پینا کیا اس کا جوڑ کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ ہاں جی شش (ہم ہم) ہمارے گھر میں موسم سرما کی تمام سبزیاں پورا ہفتہ بہت اہتمام سے پکتی ہیں (یہ اور بات کہ کھاتا کوئی کوئی ہے وہ بھی دل پر پتھر رکھ کے..... ہاہاہا) ہاں لیکن حلوہ جات، مچھلی اور چاول کے لڈو بنتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ شوہر نامدار کو (ہمارے بھئی) پنیاں بہت پسند ہیں تو میں نے اور باجی نے مل کر پنیاں بنائیں (مطلب میں بس چیزیں فراہم کر رہی تھی اور باجی (نند) بنا رہی تھیں)

لیس جی بنا کے اوپر ڈبائی فروٹ سے ڈیکوریشن کرکے فوراً تصویر لے کر شوہر حضور کو سینڈ کیں۔ (مجھے کیا پتا تھا کہ "شکل مومناں کرتوت..... کافراں") خیر وہ بھاگے گھر آئے تو میں نے ان کے سامنے پنیاں پیش کیں۔

اب وہ دانت کاٹنے کی کوشش میں بے حال اور چنیاں ٹوٹنے کو تیار ہی نہیں اور میں مجسم اس کی تفسیر کہ "وہ کہاں رہتے ہیں جو کہیں کے نہیں رہتے۔"

خیر انہوں نے یہ کہتے ہوئے واپس کردی کہ ان کو سنبھال لو میری دفتر میں کسی سے لڑائی ہوئی تو میں ان کے سر میں مار کے ان کے سر پھوڑوں گا۔"

میں نے خود بھی کچن میں جا کے لڑائی کی اس پر چھری رکھ کے زور سے ڈنڈا مارا اور وہ گیند کی طرح اچھل کے کچن سے باہر۔ بالآخر میں نے باجی کو ہی دے دیں کہ آپ کوئی جگاڑ کرلیں میرے دانت، ہمت اور شوہر اس سلسلے میں معذرت کر چکے ہیں۔

کائنات لیاقت

ہم سے اگر کوئی پوچھے کہ گزرا سال کیا دے کر گیا تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا سارے عذاب سمیٹ کر لے گیا شکر ہے اس پاک ذات کا، بڑا سخت عذاب جھیلا ہے۔ کبھی لگتا ہی نہیں تھا کہ ختم ہوں گے خوشی تو جناب اب سارے کام خوشی سے ہی ہیں۔ اب خود کو پتھر کرلیا ہے۔

اس سال ہمارا شعاع خواتین کرن سے باقاعدہ رشتہ جڑ گیا، ہر ماہ پڑھتے ہیں۔ اب رویوں کو مثبت رکھتے ہیں۔ جو جیسا ہے اس کے ساتھ اب ویسے ہی رہنا ہے۔ ہمارا اس سال بلکہ اس ماہ دسمبر ہی میں رشتہ ہوگیا (یہ واحد خوشی ہے جو دسمبر نے دی) ورنہ اس ماہ کا نام ہمارے نزدیک اداسی اور غم ہی ہے۔

وہ دن ہمیں کبھی بھولتا ہی نہیں جب ہماری پیاری سی دوست ہنستی مسکراتی قبر میں جا کر لیٹ گئی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔

تقریبات اب اٹینڈ نہیں کرتے۔ دو سال ہوگئے۔ ہر رشتہ، ہر تعلق، ہر تقریب چھوڑے پچھلے سال ہم نے صرف ایک مہنگی اٹینڈ کی مہنگے کپڑے اور میک اپ کے باوجود بھی خوش نہیں لگ رہے تھے۔

سردی کا موسم ہو اور ساگ کی بات نہ کی جائے تو یہ تو ناانصافی ہوگی ہم تو ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جو جہاں ملے کھا جاتے ہیں، کوئی حلوہ ہو یا پنیاں چاول کی ہوں یا دال کی ہم نہیں چھوڑتے، سوہن حلوہ ہو یا دیسی گھی کی مٹھائی سب ہضم کر جاتے ہیں ہمارے گھر میں خاص طور پر چاولوں کی پنیاں بنائی جاتی ہیں۔

چاولوں کا آٹا دو کلو، میوہ ایک پاؤ، بادام کی گریاں ایک کلو، گڑ ایک کلو، گھی دو کلو۔

دیگچی یا کڑاہی کو چولہے پر رکھیں آٹے کو چھان لیں گڑ کی چاشنی بنالیں جب لیس بننے لگے تو آٹا، میوہ، جو بادام ڈال کر چمچہ ہلاتے رہیں تاکہ جلے نہ، دو منٹ بعد آگ بند کردیں اور اٹھا اٹھا کر ہاتھ میں لڈو کی طرح، دباتے جائیں لڈو کی شکل دے کر گول

گول دوسرے برتن میں رکھتے جائیں اسی طرح باقی سب بناتے جائیں۔

عینا عمران......کراچی

بہت سارے ایسے لمحے ہیں زندگی میں جن کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا جن میں سرفہرست اپنے پیاروں کی جوان موت ہے جو میں کبھی بھول نہیں سکتی سب سے پہلے ابو کی اچانک موت۔ جان سے پیاری خالہ اور پھوپھو کی موت۔ میرے ماموں کو شہید کردیا گیا اور میرا سات سالہ بھانجا مزمل، اب بھی کبھی کبھی میرا بہنوئی مزمل کی تصویریں فیس بک پر لگادیتا ہے اور وہ دیکھ کر آج بھی میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جب میں خالہ ہوکر تڑپ جاتی ہوں اور رونے لگتی ہوں تو آپ سوچیں کہ ان ماں اور باپ کا کیا حال ہوگا جن کی وہ اولاد تھا۔

اور خوشی کا وہ لمحہ میں کبھی نہیں بھلاسکتی جب میں پہلی بار ماں بنی میرا بیٹا عمر میری گود میں آیا اور دوسرا وہ لمحہ جب عمر نے قرآن پاک حفظ کیا میں خوشی سے رو رہی تھی آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے اتنا بڑا اعزاز مجھے اللہ پاک نے دیا، میرے بیٹے کو حافظ قرآن بنایا (جب عمر پیدا ہوا تھا تب میں نے زبیر سے کہا تھا کہ میرا بہت بڑا ارمان ہے کہ میرا بیٹا حافظ قرآن بنے یاد رکھنا اگر میں مر بھی گئی تو میری یہ خواہش پوری کرنا عمر کو حافظ قرآن بنانا) میں کہتی ہوں ساری دنیا کی خوشیاں ایک طرف ہوجائیں اور یہ ایک خوشی ایک طرف ہوجائے اس خوشی کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ کوئی ایسا دکھ یا پشیمانی، میں نہیں سمجھتی کہ میری کوئی بات کسی کو دکھ میں مبتلا کرے گی کیونکہ میں بہت سوچ سمجھ کر بولتی ہوں میری کوشش ہوتی ہے کہ میری کسی بات سے کسی کو تکلیف نہ ہو کہیں بچپن میں پڑھا تھا پہلے تولو پھر بولو اور میں اس پر سختی سے عمل کرتی ہوں۔

دیکھیں کسی مسلمان کی مدد کرکے جتانا ایسا ہے جیسے نیکی کر دریا میں ڈال۔ اگر میں کسی کی کوئی مدد کروں تو زبیر کو نہیں بتاتی آپ کو کیسے بتاسکتی ہوں میں اس بات کی قائل ہوں کہ ایسے دو کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ مگر روحانی خوشی کا واقعہ لکھ دیتی ہوں پچھلے سال جب پورے ملک میں سیلاب آیا تھا تب ایک بوڑھی عورت میرے گھر آتی تھی وہ سندھ سے آئی تھی سیلاب سے اس کا گھر متاثر ہوا تھا وہ اکثر آتی تھی سندھی بولتی تھی مجھے اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھی (اب پٹھانوں کو سندھی کہاں سمجھ آتی ہے) خیر اس کی ٹوٹی پھوٹی اردو سے میں گزارا کرلیتی تھی حسب توفیق اس کی مدد بھی کردیتی تھی۔ ایک دن امی آئی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ساتھ ڈونٹس بنا کر لائی تھی اتنے میں وہ سندھی عورت بھی آگئی وہ جب آتی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتی اور آواز لگاتی باجی او باجی اللہ خوش رکھے اللہ بہت دے، اس دن بھی وہ آوازیں لگاتی ہوئی اوپر آئی اور بیٹھ گئی۔ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے کہا خالہ چائے پئیں گی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے چائے نکال کردی اور ساتھ ڈونٹس بھی پلیٹ میں رکھ کر دے دیے اس وقت اس عورت کے چہرے پر جو تاثرات تھے اسے ڈونٹس پسند آگئے تھے اور چائے بھی اس نے ہاتھ اٹھا کر جو دعائیں دی آپ یقین کریں سچی خوشی اور روحانی خوشی کا مفہوم مجھے اس وقت سمجھ میں آیا تھا اس نے مجھے اور امی کو جو دعائیں دی (میں نے بتادیا تھا کہ ڈونٹس امی بنا کر لائی ہیں) کسی کو چائے پلادینا کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر یا تو وہ بھوکی تھی اس نے کھانا نہیں کھایا ہوا تھا یا جو بھی وجہ تھی مگر اس کے چہرے پر جو تشکر کا احساس تھا اور جو میری روحانی خوشی کا احساس تھا وہ کہنے سے میرا قلم قاصر ہے۔

جی تو میرا میکہ اور سسرال دونوں کراچی میں ہیں اس لیے سفر کا حال ایسے تو نہیں لکھ سکتی مگر کیماڑی سے ماڑی پور جانے کا ایک واقعہ لکھ رہی ہوں اس سروے میں شرکت کرنے کا مقصد یہ واقعہ ہے دلچسپ نہیں ہے مگر آپ مجھے بتانا کہ میں نے صحیح کیا یا غلط۔ عمر کو میں نے بس میں جانے پر راضی کرلیا تھا۔ شان کے

pklibrary.com

اسٹاپ سے ہم بس میں سوار ہوئے تھوڑی دیر میں بس چلنے لگی تھوڑا آگے جا کر رک گئی ایک لڑکی اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت اوپر چڑھی میرے سامنے کی سیٹ خالی تھی وہ بوڑھی عورت جیسے ہی آگے ہوئی بیٹھنے کے لیے ساتھ بیٹھی عورت نے خالی جگہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی آپ یہاں نہیں بیٹھ سکتیں ہم نے اس سیٹ کے پیسے دیے ہوئے ہیں، ابھی آگے سے ہمارے رشتہ دار آئیں گے بوڑھی عورت رک گئی ان کے ساتھ جو لڑکی تھی اس نے بس رکوائی اور وہ دونوں اتر گئیں۔ جب تک مجھے بات سمجھ میں آئی وہ اتر چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر بس رکی اور ایک عورت اوپر آئی اب خالی سیٹ دیکھ کر ہر کوئی لپکتا ہے بیٹھنے کے لیے۔ جیسے ہی وہ عورت بیٹھنے لگی پہلی عورت نے پھر سیٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہی بات آپ یہاں نہیں بیٹھ سکتیں ہم نے پیسے دیے ہوئے ہیں (بس چڑھ گیا غصہ پٹھانی کو) میں نے اس عورت سے کہا کہ آپ بیٹھیں کوئی آپ کو یہاں سے نہیں اٹھا سکتا۔ "ایسے کیسے بیٹھ جائے گی ہم نے پیسے دیے ہوئے ہیں۔"

"یہ بھی پیسے دے کر بغیر پیسوں کے سفر نہیں کر رہی آپ بیٹھیں یہاں۔" وہ عورت جلدی سے بیٹھ گئی۔ پہلی عورت نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اب میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ پیچھے مردوں کی سیٹ تک ایک ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی وہ سب شروع ہو گئیں اس عورت کے پیچھے لگ گئیں کہ انھوں یہاں سے ہم نے پیسے دیے ہیں۔ کنڈیکٹر بھی آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس عورت سے کہا کہ آپ اٹھتا نہیں یہاں سے کرایہ دے کر سفر کر رہی ہیں۔ "تم کیوں اس کی اتنی سائیڈ لے رہی ہو یہ تمہاری رشتے دار ہے۔"

"انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے میں نے کہا یہ میری رشتہ دار نہیں ہے مگر میں حق کی بات کروں گی یہ پہلے آئی سیٹ خالی ہے اس کا حق ہے یہ بیٹھے یہی اصول ہے بس میں سفر کرنے کا جو پہلے آئے گا وہ بیٹھے گا جو بعد میں آئے گا وہ کھڑا ہو گا۔"

"مگر ہم نے پیسے دیے ہیں آپ کنڈیکٹر سے پوچھ لو۔"

"اگر آپ کے پاس اتنے پیسے ہیں تو جائیں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رکشے میں یا ٹیکسی میں جائیں بار بار پیسوں کی بات کر رہی ہیں اس پوری بس میں کون ہے جو بغیر پیسوں کے سفر کر رہا ہے۔"

"بس کرو بس کرو۔" آگے سے ڈرائیور نے آواز لگائی۔ "معاملہ ختم کرو۔" عمر نے مجھ سے کہا کہ چپ ہو جائیں ورنہ میں ابو کو بتا دوں گا خیر میں چپ ہو گئی اس کے بعد بھی اور عورتیں اوپر آئیں مگر انہوں نے کسی کو بیٹھنے نہیں دیا اب میں کیا بولوں جب خود کوئی اپنے حق کے لیے نہیں بولتا تو دوسرا کتنا بولے گا پھر ان کے رشتہ دار بھی آ گئے اور مزے سے بیٹھ گئے۔ آپ

بقیہ صفحہ نمبر 207

اَمتُ العزیز شہزاد

والعصر

وری اپنی نانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مرچکی ہے۔ گھر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عباد ان کا بیٹا ہے۔ جو وری کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔

بی ذی ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ نانی وری کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آجاتی ہے۔

پولیس کا نام سن کر بی ذی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پرسکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جونیئر فاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو تربیتی ورکشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ فاروق احمد تھوڑا اکھڑ ہے۔

عباد، وری کو پڑھانے آتے ہیں، وری بتاتی ہے کہ وہ کمبائن امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر سبجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کردیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔

شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہ رہے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خودسر ہے۔ وہ عیسٰی سے بہت چڑتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسٰی کو بالکونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔

وری کو سہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ عیسٰی سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔

بی ذی کو آتش فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ٹی وی آن کر کے دیکھے علائنہ سے متعلق خبر آرہی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ علائنہ کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔

وری پیپر دینے خوب تیار ہو کر جاتی ہے، اسے مفتاح چھوڑنے جاتا ہے، وانطہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

رینا عامر سے کہتی ہے کہ عیسٰی سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروادے۔

سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسٰی کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

pklibrary.com

وریٰ جلدی سے پیپر ختم کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔
آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے خولہ کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ فون کر لے وہ فون کرتی دوسری طرف فون اٹھا لیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملاتی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔
شریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور بظاہر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دل ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر ہنستا ہے۔ فاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ علائنہ خان کے قتل کے تانے بانے آتش کدہ سے ملتے ہیں۔
عامر، عیسیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کر دیا عیسیٰ کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو سخت سست کہتی ہیں اور عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ عیسیٰ واپس آتا ہے تو وہاں سے اس کا جرنل غائب ہوتا ہے۔
بی ذی اپنا پروموشنل ٹریپ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارٹی رکھتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک فون آتا ہے۔ وہ علائنہ خان قتل کیس کے سلسلے میں بی ذی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بی ذی خوف زدہ ہو کر لائن کاٹ دیتی ہے۔
شاکر کی بیوی فرح عیسیٰ اور عامر کی بحث کو بڑھا چڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کینیڈا یا امریکا جانے کے سلسلے میں بات کا کہتی ہے۔
وریٰ ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ وریٰ حامی بھر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی کے سامنے عیسیٰ آجاتے ہیں۔ وریٰ ڈر جاتی ہے۔
عامر بالی سے مل کر ماں اور عیسیٰ کی شکایت کرتا ہے۔ بالی اپنی کم عمری کی شادی اور غصیل شوہر کی وجہ سے

pklibrary.com

پہلے ہی ناراض تھی۔ وری بھاگم بھاگ گھر پہنچتی ہے۔ گھر میں سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ خاقان سر آتش سے اجنبی لڑکی کے فون استعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے۔
نمبر نہ نوٹ کرنے پر آتش اسے سخت سست سناتا ہے۔
سہراب وری کے بچ نکلنے پر غصہ ہوتا ہے۔ اسے فکر ہوتی ہے کہ عیسی نے اپنے گھر والوں کو سب بتا نہ دیا ہو۔
وری رجا سے بات کرتی ہے۔

پچیسویں قسط

ابن سلیمان!
اے صاحب نسیاں
منکر احسان!
سوچا ہے کبھی تم نے
کہ
صحرا میں پھول کھلنا کیا ہے؟
اور کیا ہے شوریدہ لہروں کے درمیان سے
راہ کا نکلنا؟
اور ظلمت بحر میں ڈوب کر بھی نہ ڈوبنا
اور سالم ابھر آنا؟
اور دہکتی چنگاڑتی آگ کا گلشن میں
بدل جانا؟
اگر نہیں جان سکے
تو سن لو اے ابن سلیمان!
کہ جو کچھ ہے
وہ شعلوں کے وادی گزار ہونے کے
درمیانی واقعہ میں ہی تو ہے!!

اور وہ کہ جس کا جسم برف کی بھاری سل بنا ہوا تھا اور فضا میں معلق ذہن نا جانے کیسی کیسی گناہ ثواب کی کہانیاں اسے سنائے چلا جاتا تھا، وہ دروازہ کھلنے کی آواز سن نہ سکی اور سن بھی لیتی تو شاید پھر بھی وہ یونہی ساکت وصامت کھڑی رہتی کہ کمرے میں داخل ہونے والی بی ذی گویا ہوا کی رفتار سے اس کے عین سر پر پہنچ چکی تھی۔
''تم ڈور لاک کیے اندر کر کیا رہی تھیں؟ اور یہ..... یہ میرا لاکٹ!''
متعجب لہجے میں استفسار کرتے کرتے دفعتاً اس کی نگاہ خولہ کے لرزیدہ ہاتھ میں موجود اس آب دار شے پر پڑی تھی۔ وہ شے جو متاع جاں تھی..... اور وہ کہ جس کے ''کھو جانے'' کا اسے سہائے رکھتا تھا، تب بھلا کیوں کر نہ وہ دیوانوں کی طرح چلاتی؟
''ہاؤ ڈیئر یو ٹو ٹچ مائے لاکٹ؟''
وہ آج ہال میں گئی تو اس کے ساتھ تھی مگر پھر دس پندرہ منٹ بعد ہی نامحسوس انداز سے اس کے عقب سے

ہٹ کر اندر چلی آئی تھی۔ پھر ماحول وہاں کچھ ایسا بن گیا کہ اس کی جانب بی ذی کا دھیان ہی نہ جا سکا۔ لیکچر تو آج وقت سے کہیں پہلے ہی اختتام پذیر ہو گیا تھا۔ اور اب ظاہر ہے کہ وہ اتنی پراعتماد تو ہو ہی چکی تھی کہ خود کا رونیل چیئر کے ذریعے ادھر سے ادھر جا سکے، سو وہ شرر کی روانگی کے بعد اپنے کمرے کی سمت آ گئی۔ یہ اور بات کہ کمرہ اس نے جب اندر سے مقفل پایا تو ذرا فکر مند ہو کر آگے بڑھی اور مدد کے لیے کسی کو پکارا تو جھٹ رضیہ مدد کو حاضر ہو گئی۔

اس نے خاقان کو اس امر سے آگاہ کیا کہ میم کے کمرے کا دروازہ نہیں کھل رہا۔ اس نے آ کر ماسٹر کی کی مدد سے اسے باآسانی کھول دیا اور یوں وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ اور سامنے بو منظر دکھائی دیا۔

"کیا ہوا میم؟" خاقان جو دروازے ہی سے واپسی کے لیے مڑ گیا تھا، بی ذی کی طیش آمیز بلند آواز سن کر الٹے قدموں دوڑ چلا آیا۔

"یہ..... یہ میرا لاکٹ" بے پناہ اشتعال غالب آ جانے کے باعث اس کی آواز پھٹ سی گئی اور بات مکمل ہی نہ کی جا سکی۔ مگر سفاک صورت خاقان بات کے مکمل کیے جانے کا محتاج کب تھا؟

"چوری کر رہی تھیں تم؟" وہ لپک کر اس کے سامنے پہنچا اور سرسراتی آواز میں سوال کیا۔ تو ایک بیک خولہ جھرجھری سی لے کر لیے عالم ہوش میں واپس پلٹی۔

"بتاؤ جواب دو۔" خاقان تفتیشی انداز میں چلایا۔ "چوری کر رہی تھیں؟"

"نہیں..... نہیں۔" وہ گھگیا کر بولی۔ "میں تو بس..... میں تو بس صفائی کر رہی تھی یہاں۔"

"صفائی کر رہی تھیں یا صفائے کا ارادہ تھا جو دروازہ لاک کر رکھا تھا۔" وہ طنز آمیزی لہجے میں بولا۔

"لاکٹ..... لاکٹ۔" اس سے اس استفسار کا کوئی جواب نہ بن پڑا وہ پھر بھی جان خلاصی کے لیے کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"وہ شاید بٹن دبا رہ گیا ہوگا۔"

"تم ایسے نہیں مانو گی۔" خاقان قہر بار نگاہوں سے اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھتا ہوا بولا۔ "ٹھہر میں ابھی بلاتا ہوں پولیس کو۔"

"نہیں..... نہیں میم نہیں۔" وہ خوف زدہ سی ہو کر محاورتاً نہیں حقیقتاً بی ذی کے قدموں میں گر گئی۔ "پولیس نہیں..... ہاں میں نے آپ کا یہ لاکٹ نکالا ضرور تھا مگر میں اسے چرا نہیں رہی تھی۔"

یہاں جاری شور شرابے کی آواز باہر تک جا رہی تھی تو اس وقت گھر میں موجود سارے ہی ملازمین بشمول رضیہ ماجرا جاننے کی غرض سے کمرے میں اکٹھا ہو گئے تھے۔

"چرا نہیں رہی تھیں تو اسے نکالا کیوں؟" اپنے "غیر متحرک" پیروں میں گری اپنی "مستعد خدمت گار" کو اس حالت میں دیکھ کر بی ذی کے احساسات عجیب سے ہو گئے تھے، تب ہی اس بار نسبتاً دھیمی آواز میں بولی۔

"نکالا کیوں؟" اس سوال کو دہراتے سمے بے اختیار اس کی نگاہ "ہاتھ آئی شے، ہاتھ سے پھسل جائے" کے غم میں مبتلا کھڑی رضیہ کی سمت اٹھی تو وہ بے طرح ٹھٹھک گئی۔

(یہ پاگل کہیں سچ تو نہیں پھوٹنے چلی ہے)

اس سوچ نے اسے سراسیمہ سا کر دیا تھا سو وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے کی جانب ہٹ گئی۔

"میں بس اس "نام" کی ہیبت اور لاکٹ کی خوب صورتی کو قریب سے چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی۔" اس نے رضیہ کے فق ہوتے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے اس بار پورے اعتماد سے کہا تو چند ثانیے خاموشی سے بس ٹکر بی ذی اس کا چہرہ دیکھے گئی۔

"بس؟" کچھ دیر بعد وہ لب کشا ہوئی تو لہجے میں غم تھا۔
"بس!" خولہ نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ "آپ چاہیں تو میں "قسم" اٹھانے کو تیار ہوں۔"
"کس کی قسم؟" بی ذی نے بے چین ہو کر پوچھا۔
"اس کی..... خولہ نے بعد عقیدت واحترام وہ لاکٹ اپنی دائیں ہتھیلی پر رکھ کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔
تب یک لخت بی ذی نے خولہ کے چہرے کی جانب دیکھا اور دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی۔ بے تحاشا اور بے وجہ..... مگر نہیں..... وجہ تو تھی..... وجہ تو بہر حال تھی اس مجنونانہ قہقہوں کے پیچھے۔
"تم جاؤ خاقان!" ہنستے ہنستے تھک کر وہ رو پڑی تھی۔ "اسے چھوڑ دو۔ یہ سچ کہہ رہی ہے۔"

☆☆☆

"ہمیں معاملات میں صاحب الرائے سے مشورے کی تعلیم دی گئی ہے، سو میں نے آپ سے مشورہ کیا، اور آپ کے مشورے پر استخارہ بھی۔"
وہ جب وردی کی ناقابل فہم کم شدگی کی بابت از خود سوچ سوچ کر نیم دیوانہ سا ہو گیا، تب اس نے بڑی بے بسی سے صوفی صاحب کی راہ لی تھی۔ وہ اس وقت نماز مغرب کی ادائی کے بعد اپنے حجرے میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ چونک کر اسے دیکھنے لگے کہ آج وہ اپنی عادت کے برعکس خلاف تہذیب ان کے حجرے میں بنا دستک دیے داخل ہوا تھا اور آتے ہی بنا علیک سلیک ایک عجب مجنونانہ سے انداز میں ان سے مخاطب ہوا۔
"کیا بات ہے بیٹے؟" ایک پل کو ان کا متواتر دانے گراتا ہاتھ تھا۔ پر دوسرے ہی پل وہ ایک بار پھر اپنا معمول دہراتے ہوئے بہت حلیم و شفیق سے لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے تھے۔
"بیٹھ جاؤ..... بیٹھ کر اطمینان سے بات کرو۔"
"کیسے بیٹھ جاؤں۔" وہ جو اڑتالیس گھنٹوں سے مستقل جاگ رہا تھا، رقت زدہ سے لہجے میں بولا۔
"اطمینان ہی تو نہیں آ پا رہا ہے۔"
"اس طرح اطمینان کا رخصت ہو جانا ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔" انہوں نے وہی مخصوص انداز فکر اختیار کیا، جس کی اس صورت حال میں قطعاً ضرورت نہیں تھی۔
"گناہوں کا نتیجہ ہے؟" اس نے از حد صدمے سے ان کے دل شکن جملے کے موخرانہ الفاظ کو دہرایا۔
"میں نے تو ایک مصیبت میں گرفتار پریشان حال لڑکی کی درخواست پر اس کی مدد کرنے کا ارادہ کیا تھا۔
تو کیا یہ گناہ ہے آپ کی نظر میں؟
"استغفر اللہ، استغفر اللہ۔" صوفی صاحب تھرا کر مزید شد و مد سے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بولے۔
"میں کیا اور میری نظر کیا۔"
"تو پھر آپ یہ کیسے کہہ گئے کہ میری بے اطمینانی دراصل میرے گناہوں کا نتیجہ ہے؟ اگر کسی کی بھلائی سوچنا گناہ ہے تو پھر اس گناہ میں تو آپ بھی حصے دار ہوئے کہ یہ قدم میں نے آپ ہی کے مشورے سے تو اٹھانے کی ہمت کی تھی۔"
"کیسا مشورہ بیٹے؟" گناہ میں حصے دار بننے والی بات پر صوفی صاحب نے ہڑبڑا کر تسبیح ایک طرف رکھ دی اور اس بار ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہو کر ذرا تشویش سے گویا ہوئے۔ "کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟"
اور جب اس نے مختصر بتا دیا کہ ہوا کیا ہے تو وہ حقیقتاً متاسف سے لہجے میں بولے۔
"اللہ اکبر..... یہ تو بہت برا ہوا۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔" وہ بے قراری سے بولا۔ "پھر میرا سوال یہی تو ہے کہ جب میں نے مشورہ بھی کیا اور استخارہ بھی تب یہ ہزیمت میرے حصے میں کیوں آئی؟"

"ہوگی اس کی کوئی مصلحت۔" وہ انگشت شہادت چھت کی جانب کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولے پر وہ ماننے کو تیار نہ ہوا۔

"اس کی مصلحت ہمیشہ اس کے ماننے والوں ہی کے آڑے کیوں آتی ہے؟"

"جن سے تعلق ہو بیٹے! مداخلت بھی تو ان ہی کے معاملات میں کی جاتی ہے، ورنہ غیر کی پروا کون کرتا ہے۔"

"پر وہ تو سب ہی کا ہے نا۔" وہ دکھی سے لہجے میں بولا۔ "پھر ہم جیسوں ہی پر اس کی خاص الخاص نظر کرم کیوں ہوتی ہے؟"

"بیٹے!" چوں کہ صوفی صاحب اس کی قلبی کیفیت کی اکھاڑ پچھاڑ بھانپ ہی نہیں پائے تھے۔ برنا گواری سے اسے ٹوکتے ہوئے بولے۔ "ایسی باتیں کرنا گناہ ہے۔"

"اور بھروسا کرنے والے کا بھروسا توڑنا؟" وہ پاش پاش سے لہجے میں بولا۔

"وہ کیا ہے؟"

"دیکھ بیٹے۔" وہ اس کے انداز جراح پر ذرا متفکر سے ہو کر بولے۔ "میں جانتا ہوں کہ تم ابھی صدمے میں ہو، پریشان ہو مگر میں تمہیں ہی کہوں گا کہ اس کے در سے ناامید مت ہو۔ کھو جانے والوں کو دوبارہ ملا دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟ تم ایسا کرو کہ روز وقت تہجد نماز حاجت پڑھ کر دعا مانگو۔ مجھے یقین ہے۔ ان شاءاللہ وہ بچی جلد تمہارے سامنے آجائے گی۔"

☆☆☆

"کیا ہوا امی! اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟"

یوں تو وہ اپنی "سلطنت" سے باہر "دیار غیر" میں عموماً قدم رکھنے سے دانستہ گریزاں ہی رہا کرتا تھا، مگر ابھی یوں باہر نکل آیا کہ طاری سناٹا شاید تھا کہ وہ اس وقت یہاں تنہا ہے۔ سو وہ اس "نعمت" کا فائدہ اٹھانے کی غرض سے باہر نکل آیا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا فیروزہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے کو اس نے رینا کے لاکھ زور لگانے پر بھی کسی اور کے تصرف میں نہیں آنے دیا تھا۔ یہ کمرہ اس کی جنت تھی۔ سکون تھا۔ قرار تھا..... اور..... دل شکستہ کا ہر بار نئے سرے سے پارہ پارہ ہو جانے کا سبب بھی۔

وہ اس وقت پلنگ پر عین اس مقام پر براجمان تھا کہ جہاں چند برس پرانی سیاہ چھوٹے چھوٹے پھولوں والی سرمئی ساڑی میں ملبوس فیروزہ بیٹھی بڑی بے بسی سے رو رہی تھیں۔

وہ اب بیساکھی کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا سو ان دنوں جامعہ کراچی میں داخلے کے حصول کی خاطر تگ و دو کر رہا تھا۔ آج صبح بھی وہ اس سلسلے میں گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ لوٹا تو عادتاً سب سے پہلے ان کے کمرے میں چلا آیا اور یہاں دیکھا تو.....

"اے بابو" فیروزہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئیں چنانچہ جلدی سے اپنے آنسو دائیں ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر مامتا بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوئیں۔ "تم آ گئے؟"

"بتائیں اس طرح کیوں رو رہی ہیں آپ....." اس نے ان کی بات بدلنا محسوس کر کے مزید بے قراری سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے اور..... یہ"

ان کے سامنے صاف طور پر "بچی گئی" کھانے کی ٹرے پر اس کی نظر اب جا کر پڑی تھی۔ "یہ کیا کھا رہی

ہیں آپ؟'' پانی میں تیرتے سفید چاول کے دانے اور اس کے ساتھ دھرا اچار کا بڑا ذبہ۔
''وہ ہم سے بازار کا روٹی نہیں کھایا جاتا۔'' وہ کچھ غم زدہ سے انداز میں چاروناچار بتانے لگیں۔ ''اس لیے ہم کا دلہن یہ کھانا دے گئی ہیں۔''
''یہ..... یہ کھانا ہے؟'' طیش کی ایک شدید لہر نے اسے لپیٹ میں لے لیا تھا۔
ایک وقت تھا کہ ان کا دسترخوان انواع واقسام کی نعمتوں سے بھرا رہا کرتا تھا اور آج.....
''ہم بولے کہ دلہن ہمیں جیرے کا پھوڑن (زیرے کا بگھار) ڈال کر بھات تل کردے دونے..... تو وہ یہ دے دی نے۔''
وہ بڑی بے چارگی سے کہہ رہی تھیں۔ وہ کہ جو اس عالی شان گھر کی مالکن تھیں۔ وہ کہ جن کے نام پر ان کے مرحوم شوہر لاکھوں، کروڑوں کی جائیداد چھوڑ گئے تھے۔ وہ کہ ڈھاکہ سے خرچے کی مد میں آنے والی رقم آج بھی ان ہی کے نام پر آتی تھی اور فائدہ جس سے اس گھر کے تمام نفوس ہی اٹھاتے تھے۔ وہ بھات کے نام پر پانی میں تیرتے چند چاول اپنے سامنے رکھے بے بسی سے رونے پر مجبور کردی گئی تھیں۔
''آخر کیا سمجھ کر وہ یہ سب آپ کے سامنے رکھ گئی ہیں؟'' وہ ضبط کھو کر ایک دم ہی دھاڑا۔
''اے بابو.....'' فیروزہ اسی لیے اس سے یہ بات چھپا لینا چاہتی تھیں تب ہی خائف سے لہجے میں بولیں۔
''خاموش ہو جاؤ نے۔ ہمیں جھگڑا لڑائی سے بڑا بولاہٹ (گھبراہٹ) ہوتا ہے نے۔''
''بات جھگڑے لڑائی کی نہیں، احساس کی ہے۔'' وہ ہنوز اسی آہنگ میں بولا۔
''ہاں تو کب احساس نہیں کیا میں نے ان کا۔'' رینا جو ان دنوں تیسری بار امید سے تھی، سوتی نائٹ گاؤن میں بنا دوپٹے، اس بدتمیز ناہنجار کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے گویا تیر کی طرح اپنے کمرے سے نکل کر ادھر آئی تھی۔
''میری اپنی خود کی طبیعت ٹھیک نہیں، پھر بھی اپنا آپ بھلا کر میں سب سے پہلے ان کا خیال کرتی ہوں اور تم یہاں کھڑے مجھ پر چلا رہے ہو؟ غلام نہیں ہوں میں تم لوگوں کی..... ذرا اسلام کا مطالعہ کرو جا کر، بہو اگر خدمت کرے تو احسان ہے اس کا، اس پر فرض نہیں۔''
''اور آپ کے خرچے اٹھانا بھی آپ کے شوہر کا فرض ہے۔'' وہ اس کی تقریر سے ذرا بھی متاثر نہ ہوتے ہوئے چبا چبا کر بولا۔ ''ساس کا نہیں..... اگر وہ آپ کی رہائش سے لے کر کھانے پینے اور دوادارو تک کا خیال رکھ رہی ہیں تو یہ آپ پر ان کا بھی احسان ہے۔ اور اسلام تو یہ بھی کہتا ہے کہ احسان کا بدلہ بجز احسان اور کچھ نہیں۔''
''ہائے مورے۔'' اس نے لاجواب ہو کر تلملاتے ہوئے دہائی دینا شروع کردی۔
یہی طعنے سننے کہ رہ گئے تھے۔ ہائے کیا کوہی صلہ ہے خدمت گزاری کا..... آج آجائے عامر..... میں بات کرتی ہوں اس سے..... مجھے اب نہیں رہنا یہاں پر.....''

☆☆☆

''خولہ!''
وہ بوقت تہجد آج اپنا پردہ رہ جانے پر رب کے حضور سجدہ شکر ادا کر رہی تھی۔ اور خلاف معمول آج بی بی ذکی یک ٹک اسی پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ حالانکہ بتی بجھی ہوئی تھی اور محض زیرو پاور کا بلب روشن تھا مگر پھر بھی وہ خولہ کے اردگرد ایک ناقابل بیان سا پرسکون ٹھنڈا میٹھا سا حصار قائم دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی کس قدر مشقت سے عبارت تھی پھر بھی وہ کیسے..... آخر کیسے اتنی مطمئن مکمل اور راضی بہ رضا دکھائی دیتی تھی۔ آخر کیسے؟ اس سوال نے

اسے اس قدر مضطرب کیا کہ وہ بے اختیار اسے پکار بیٹھی۔
"جی میم!" خولہ جو نماز ختم کر کے اب دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہی تھی، اس کی پکار پر چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔ "کچھ چاہیے تھا؟"
"ہاں..... سکون۔" بے بسی کا مظہر یہ ایک غیر متوقع جواب تھا، جسے پا کر چند ثانیے خولہ بالکل چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر مدھم سی آواز میں بولی۔
"بہت عرصہ پہلے مجھے بھی اس کی تلاش تھی۔"
"پھر کہاں ملا؟" بی ذی نے بے قراری سے پوچھا۔ تو وہ اداس سی ہنسی ہنس دی۔
"مجھے بھی نہیں ملا اب تک۔"
"مگر یہ اسٹوپڈ لوگ تو ہمیں سکھاتے ہیں کہ سکون تو صرف ذکر اللہ میں ہے۔"
"اسٹوپڈ لوگوں نے نہیں۔" وہ اس کی تصحیح کرتے ہوئے بولی۔ "یہ تو خود اللہ نے کہا ہے۔"
"اللہ نے کہا ہے تو تمہیں پھر کیوں نہ ملا؟" اس نے طنزیہ پوچھا۔ "جب کہ تم تو روز خوب اس کا ذکر کرتی ہو۔"
"سکون کئی طرح کے ہوتے ہیں میم!" وہ گہرے لہجے میں بولی۔ "اور جو سکون۔"
"سوچا و خولہ۔" بی ذی نے اس کی بات کاٹ کر حکمیہ آواز میں کہا تھا۔ سو خولہ سمجھ گئی کہ وہ اب مزید بات نہیں کرے گی۔ لہٰذا اس نے ایک بار پھر نماز کی نیت باندھ لی۔
اور بی ذی..... وہ اب پہلے سے بھی زیادہ بے چین ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"امی چپ ہو جائیں، ایسے تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"
لیاقت بیگم کو اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوئے آج پورے چالیس روز ہو گئے تھے۔ اتنے دن سے ان کا کمرہ یوں ہی بند پڑا تھا کہ یہاں داخل ہونے کی ہمت ان میں سے کسی میں بھی نہیں تھی۔ پر آج عارفہ نے کچھ سوچ کر حوصلہ مجتمع کر ہی لیا تھا۔ ارادہ تھا کہ ان کے زیر استعمال کپڑے و دیگر اشیا کچھ بطور نشانی رکھ کر باقی مستحقین کے حوالے کر دی جائیں۔ مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نگاہ جوں ہی ان کی خالی مسہری اور سرہانے رکھی تسبیح پر پڑی، ان کا دل گویا آنکھوں کے راستے بہہ نکلا۔
یہ فسانہ عدم بھی کیا شے ہے، جب بھی سنوں دل ہر بار نئے سرے سے پاش پاش ہونے لگتا ہے۔
رجا ان کے پیچھے پیچھے مدد کروانے کی غرض سے کمرے میں وارد ہوئی تھی اور اب پچھلے دس، پندرہ منٹ سے انہیں چپ کروانے میں لگی ہوئی تھی۔
"اے کاش کہ بھابھی بیگم عباد کے لیے راضی ہو جاتیں تو آج یہ کمرہ یوں خالی نہ پڑا ہوتا۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے بولیں۔ اب اس بات پر رجا کیا کہتی..... سو خاموش ہی رہی۔ مگر وہ ملول لہجے میں بولے چلی جا رہی تھیں۔
"یا میں عرصم ہی کو سنبھال لیتی۔ بہت برا کر گئی وریٰ..... بہت برا کر گئی۔ تم سے تو بہت دوستی تھی اس کی۔" انہوں نے روتے روتے اچانک اس کا چہرہ دیکھا۔ "تم سے کیسے اس کے دل کا حال مخفی رہ گیا۔ وہ نادان بچی۔ پر تم تو سمجھ دار تھیں نا..... تمہیں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ تم سے کیسے چوک ہو گئی۔" وہ بے ربطی سے کہتی چلی گئیں یہ اور بات کہ ان کا ایک ایک لفظ رجا کے دل کے بوجھ کو بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔
"ہاں مجھے خیال رکھنا چاہیے تھا۔" وہ بڑبڑاہٹ نما لہجے میں خود کلامی کرتے ہوئے بولی۔ "ہاں مجھ سے

چوک ہوگئی۔ کہ نادان وہ نہیں میں تھی۔'' وہ ماں کو چپ کرواتے کرواتے خود پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

''تمہاری محبت نے بہت ذلیل کروایا ہے مجھے عامر..... لیکن بس اب بہت ہوا۔''

وہ اب فیروزہ کے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں داخل ہو رہا تھا۔ خیال تھا وہاں کچھ دیر بیٹھے گا مگر یہ کیا..... لاؤنج کے صوفوں کی جگہ اب دوسرے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ جہازی سائز کھانے کی میز کی جگہ اب چھ کرسیوں والی شیشے کی میز رکھی تھی۔ وہ مہمان خانے میں ابھی گیا نہیں تھا، جاتا تو دیکھتا۔ ''اشیا کی ادل بدل'' کا یہی فارمولا وہاں بھی لاگو کر کے گھر کے ساز و سامان کے ''حق ملکیت'' کا دعوے دار ''تبدیل'' کیے جانے کی بھونڈی سی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ اسے قدرتی طور پر والدین کے بڑے چاؤ سے خریدے گئے ساز و سامان سے فطری انس تھا سو اس نئی صورت حال نے اسے افسردہ کر دیا۔

''آخر لالچ میں اندھا ہو کر کوئی کیا کچھ کر سکتا ہے۔''

وہ بیٹھا نہیں..... بس وہاں کھڑے کھڑے سوچے گیا۔

اور سامنے موجود بند کمرے کی دیواروں کے اس طرف ایک نظر جو اس نے کبھی دیکھا نہیں مگر اس گھر کے در و دیوار جس کے گواہ تھے، وہ تازہ ہو رہا تھا۔

رینا کو عیسیٰ کے آئینہ دکھانے نے زخمی ناگن بنا دیا تھا۔ لہٰذا رات عامر کے لائے گئے چرغے سے اچھی طرح انصاف کرنے کے بعد وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور ہو گئی شروع۔

''کیا ہوا؟'' عامر جس نے نیا نیا کیبل لگوایا تھا، اور اب بڑے مزے سے پاؤں پسارے، ریموٹ ہاتھ میں لیے، پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے چینل پر چینل تبدیل کرنے میں مشغول تھا۔ کچھ چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''کیا پھر کوئی بات ہوئی ہے؟''

''بات تو یہاں روز ہی ہوتی ہے۔'' وہ نچلا ہونٹ لٹکا کر بولی۔ ''آج تو میری ایسی ـــ بے عزتی کی ہے تمہارے بھائی نے کہ کیا بتاؤں؟''

''کیا کہا اس نے؟'' عامر کے ابرو تن گئے تھے۔ اس نے ریموٹ یوں ہی رکھ دیا۔

''تم تو بہت بڑے بڑے دعوے کر کے مجھے گھر لائے تھے نا کہ سونے میں تول دوں گا، گھر تمہارے نام کر دوں گا۔''

رینا نے نمک مرچ کے علاوہ پورا گرم مسالہ اپنی طرف سے لگا کر اسے دوپہر میں ہونے والی جھڑپ کے بارے میں بتانے کے بعد اس کی ''غیرت عاشقانہ'' جگاتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا نکلی ان دعوؤں کی حقیقت وہی نا کہ جس کا میری بہنوں کو اندیشہ تھا۔''

''رینا..... رینا۔'' ہائے..... کیسا ''نکما'' تھا وہ..... تب ہی اس کے سامنے ذرا شرمندہ سا ہو کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ کچھ دن صبر کر لو۔''

''کچھ دن..... کچھ دن کا راگ الاپتے تو تم نے چار سال نکال دیے ہیں۔'' رینا طنز سے بولی۔ ''اور کتنا صبر کروں؟''

''کہہ رہا ہوں نا بس کچھ ہی دن اور۔'' اس بار وہ بہت معنی خیزی سے بولا۔ تو رینا جھٹ اس کے برابر آ بیٹھی۔

''اچھا؟'' اس نے بظاہر بے یقینی مگر درحقیقت بے اندازہ دل چسپی سے پوچھا تھا۔

''ایسا کیا کر رہے ہو تم؟''

''میں گھر کے کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ اس کے کندھے پر بازو حمائل کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بتانے لگا۔ ''امید ہے جلد کامیابی ملے گی۔ اس کے بعد دیکھنا کہ میں اس عیسیٰ کا کیا کرتا ہوں۔''

☆☆☆

''بات سن، یہ تو نے کیا کیا ہے کل؟''

اگلی صبح جب خولہ بی ذی کے لیے ناشتا تیار کر رہی تھی، تب ساری رات زخمی ناگن کی طرح بل کھا کھا کر گزارنے والی رضیہ، کام پر وارد ہوئی اور موقع پا کر پہلی فرصت میں خولہ کے سر ہو گئی۔

''کیا، کیا ہے؟'' خولہ نے بی ذی کے لیے بنایا گیا پورج احتیاط سے رکابی میں منتقل کرتے ہوئے ذرا کی ذرا اس کی جانب دیکھ کر کچھ اس معصومیت سے استفسار کیا کہ رضیہ کھول گئی۔

''ایک تو تجھ سے وہ کام ڈھنگ سے نہیں ہوا، اوپر سے وہاں تو چوری کے سوال پر میری جانب ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کام پر میں نے تجھے مجبور کیا ہو۔''

چوری اور سینہ زوری کی مجسم صورت یقیناً ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ سو خولہ کو اس کے منہ سے یہ سن کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی مگر اس نے ضرور رضیہ کو حیران کرنے کی ٹھان لی تھی۔ سو ٹرے میں بی ذی کے ناشتے کے لوازمات ترتیب دیتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولی۔

''تو پھر اور کس نے مجبور کیا تھا؟''

''ہیں..... ہیں۔'' رضیہ حیرت سے اس کی جانب دیکھ کر بولی۔ ''میں نے مجبور کیا تھا تجھے؟''

''میں نے ابھی یہی کہا ہے۔''

''بات سن۔'' رضیہ نے بہت چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''کن ہواؤں میں ہے تو..... تیرے ذہن میں چل کیا رہا ہے؟''

''جو بھی چل رہا ہو۔'' وہ بلیک کافی کی پیالی طشتری میں رکھتے ہوئے بے پروائی سے بولی۔ ''میں تمہیں بتانے کی پابند نہیں ہوں۔''

''اے میڈم.....'' وہ بھڑک گئی۔ ''جانتی ہے نا تو کہ تیری جان میرے فون میں ہے، سو زیادہ بہادر بننے کی اداکاری مت کر میرے سامنے ورنہ منٹ بھی نہیں لگے گا، مجھے وہ نمبر خاقان صاحب تک پہنچانے میں اور اس کے بعد تیرا جو حشر ہوگا وہ تو خود سوچ سکتی ہے۔''

''سوچ لیا ہے رضیہ۔'' وہ قاب بڑی مضبوطی سے تھام کر اٹھاتے ہوئے، اس سے کہیں زیادہ مضبوط لہجے میں دھیمی سی مسکان لبوں پر سجاتی ہوئے بولی۔

''جس لمحے میں نے وہ لاکٹ برے ارادے سے اٹھایا، اور میرے ضمیر مجھے نے جھنجوڑ کر کے رکھ دیا۔ میں نے اسی وقت تمہارے ہاتھوں مزید بلیک میل نہ ہونے کی نیت کر لی تھی رضیہ..... اور دیکھو۔ میرے نیت کرنے کی دیر تھی۔ میرے رب نے کیسے مجھے ذلیل ہونے سے بچا لیا۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔'' رضیہ ڈھائی تین لاکھ ہاتھ سے جاتا دیکھ کر خوں خوار ہو گئی۔ ''جانتی ہے اگر وہ نمبر میں خاقان کو دے دوں تو وہ تیرا کیا حشر کرے گا؟''

''اندازہ کر سکتی ہوں۔'' وہ دل گیر سے انداز میں مسکرائی۔ ''پر اب اتنا یقین ہے کہ جو بھی ہو، میرا رب مجھے بچا لے گا۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی اور ایک تمکنت سے چلتی باورچی خانہ عبور کر گئی۔

اپنے عقب میں رضیہ کو ہکا بکا چھوڑ کر۔

☆☆☆

''رجا''
رات وہ اپنے پلنگ پر لیٹی خالی خالی نگاہوں سے، متوازی رفتار سے گھومتا چھت کا پنکھا دیکھنے میں منہمک تھی کہ تب ہی بے آواز ٹی وی کی دھندلی سی متحرک تصویروں پر خوامخواہ نظریں جمائے بیٹھی، واثلہ نے اچانک اس کی جانب دیکھتے ہوئے اسے پکارا۔

''ہوں؟'' وہ چونکی نہیں کہ آج کل بہت کم آوازیں اسے چونکا پاتی تھیں۔

''وہ......وہ کہاں ہوگی؟'' اس نے رنج بھرے لہجے میں پوچھا۔ اگر اسے علم ہوتا تو پلک جھپکتے اسے واپس لے نہ آتی۔ سو اس استفسار کا کیا جواب دیتی؟ بس خاموش ہی رہی پر واثلہ شاید آج خاموش ہونے کا ارادہ نہ رکھتی تھی سو معصوم سے لہجے میں مزید بولی۔

''رات کو جب بھی اس کا خیال آتا ہے تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے رجا۔ کیا اسے نہیں لگتا ہوگا؟''

''پتا نہیں......'' ہر چند کہ اسے اس جملے نے اندر سے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا، تاہم وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

''بے عقل، بونگی تو تم سب مجھے سمجھتے تھے مگر دیکھو۔'' واثلہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اصلی بے وقوف تو وہ نکلی جو اس طرح گھر چھوڑ گئی۔ پر گھر چھوڑ کر آخر وہ گئی کہاں ہوگی رجا؟ یہ سوال مجھے روز پریشان کرتا ہے۔''

''نہیں پتا۔'' بالآخر رجا بے حسی کا چولا اتار کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں گئی ہے؟ تایا جان اور ابو اسے ڈھونڈنے کی اپنی سی کوشش کر تو رہے ہیں۔''

''پھر ملی کیوں نہیں وہ اب تک۔'' واثلہ ضبط کھو کر بے اختیار رو پڑی۔ اس کا خالی بیڈ دیکھتی ہوں تو مجھے رونا آتا ہے۔ مجھے نہیں رہنا اس کمرے میں یہاں سے چلی جاؤں گی میں۔''

''نہیں واثلہ نہیں۔'' رجا نے تڑپ کر اسے گلے لگایا تھا۔ ''اگر تم بھی چلی گئیں تو ادھر اکیلی کیا کروں گی میں۔ کیا کروں گی؟'' اب وہ دونوں گلے لگی اونچی آواز میں اس کی محبت میں رو رہی تھیں کہ جو ''محبت'' کی تلاش میں ''محبتوں'' سے منہ موڑ کر نکلی تھی۔

☆☆☆

''پڑھائی کیسی جا رہی ہے تمہاری؟''
کوئی نامعلوم سا ساز دفعتاً لاؤنج میں گونجا تو وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا آخر یہ کس شے کی آواز تھی؟ مترنم سا ساز ایک بار پھر ہوا میں منتشر ہوا تھا۔ اس بار بے ساختہ اس کی نگاہ آواز کے منبع کی جانب گئی تھی۔ ٹیلی فون اسٹینڈ پر سرمئی ڈائل والے فون کی جگہ اب سیاہ بٹنوں والا سیٹ رکھا تھا۔ وہ پہلے چونکا......پھر ایک دم ہی بے اندازہ رنج سے سر جھکا لیا۔ بات تغیر، پر افسردگی کی نہیں۔ رنج اس احساس کے ڈھیرے ڈھیرے فنا کیے جانے کا تھا جو اس گھر کی چھوٹی چھوٹی اشیاء کے ساتھ جڑا تھا۔ ان دنوں کسی کے گھر میں فون کا لگ جانا بڑا معرکہ سر کر لینے والی بات تھی۔ سوچوں ہی یہ پہاڑ فتح ہوا۔ وہ چوں کہ بچہ ہی تھا، سو بچوں ہی کی طرح بڑے شوق سے شاکر کے ساتھ جا کر وہ سیٹ خود اپنی پسند سے لے کر آیا تھا۔

فون کی نامانوس سی گھنٹی پھر بج رہی تھی مگر اس بار، وہ اس کی توجہ حاصل نہ کر سکی کہ دھیان کا پرندہ کسی اور سمت اڑان بھر چکا تھا۔ اس وقت شاکر کا فون آیا ہوا تھا، اور وہ اس سرمئی فون کا چونگا پکڑے ان سے مودبانہ لہجے میں محو گفتگو تھا کہ جواب یہاں نہیں تھا۔

''جی بھائی......!'' اس نے شاکر کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''ٹھیک جا رہی ہے۔''

pklibrary.com

''تمہارے ساتھ والے کہاں سے کہاں نکل گئے ہیں۔'' وہ تبصرہ کرتے ہوئے بولے۔ ''اب تم بھی محنت سے دھیان لگا کر پڑھنا۔''

''کوشش تو پوری کرتا ہوں پر دھیان امی کی جانب لگا رہتا ہے۔'' اس نے بڑا بھائی ہونے کے ناتے نئے گھر کی پریشان کن صورت حال سے انہیں آگاہ کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' شاکر ذرا چونکے۔ ''امی کو کیا ہوا؟''

اس نے مختصر اً بتایا تو محتاط سے لہجے میں بولے۔

''یہ تو بھئی ہر گھر کی کہانی ہے۔ تم اتنا محسوس مت کرو اور بس اپنی پڑھائی پر فوکس کرو۔''

''اور امی؟'' وہ ان کے ردعمل پر ذرا حیران سا ہو کر بولا۔ ''امی کا خیال کون رکھے گا۔''

''ہم سب رکھ رہے ہیں۔'' اس بار ان کا لہجہ ڈپٹنے والا تھا۔ ''تمہیں اتنا اوور سینسیٹو ہو کر سوچنے کی ضرورت نہیں...... تمہارا کام پڑھنا ہے۔ تم صرف وہی کرو۔ ریئلٹی کو فیس کرنا سیکھو۔

تمہیں جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ کوئی بھی ہو...... کب تک کسی کو سپورٹ کرسکتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''

ان کی بات وہ تو بخوبی سمجھ رہا تھا پر شاید اپنی سمجھانے میں ناکام رہا تھا۔ تب ہی انہوں نے اس کی کچھ بھی سنے بغیر ڈھیروں روایتی قسم کی نصیحتوں سے اسے نواز کر فون بند کر دیا تھا۔

''یہ تمہاری جنگ ہے، تمہیں ہی لڑنا ہو گی۔''

یہ الوداع سے قبل ان کا آخری جملہ تھا۔

''مگر ماں تو آپ سب کی بھی ہے نا۔'' اس نے بے بسی سے جھٹ پٹاتے ہوئے سوچا۔

''وہ اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ہو رہی ہیں۔ خدارا انہیں تو ایسے مت چھوڑیں۔''

☆☆☆

''یہ تم نے کیا کر دیا بی ذی؟''

دو دن قبل، دوران ''درس'' بی ذی کی زبان سے بے سوچے سمجھے نکلنے والے الفاظ بذریعہ انٹرنیٹ جنگل کی آگ سے بھی زیادہ تیزی سے پھیل چکے تھے۔ حال آں کہ اس بات کو یقینی بنایا جاتا تھا کہ آتش کدے میں منعقدہ کسی بھی قسم کی نشست وغیرہ کی ویڈیو کوئی اپنے ذاتی فون سے نہ بنا سکے مگر ''اللہ جانے کیسے اس بار یہ بے احتیاطی ہو گئی تھی اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بی ذی کو اب عوام الناس کی جانب سے سخت تنقید...... بلکہ دشنام طرازی کا سامنا تھا۔

اس نے تو معمول کے مطابق اپنا انسٹاگرام کھولا تھا۔ وہاں دیکھا تو ''ملعونہ'' کے خطاب کے ساتھ اس کے بیان کا وہی ٹکڑا جگہ جگہ ''بکھرا'' ہوا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

صرف اسی پر بات ختم نہیں ہوگئی تھی بلکہ سوشل میڈیا پر موجود طرح طرح کے ''مولانا حضرات'' و ''مفتیان کرام'' بھی اس کے خلاف باقاعدہ پروگرام کر کر کے، اس سے اس کے ان الفاظ کی وضاحت طلب کر رہے تھے کہ جن کی حساسیت کا صحیح طور پر ادراک اسے تھا ہی نہیں۔ مگر اپنے خلاف لوگوں کے جذبات سن سن کر اسے یقیناً اب ہو رہا تھا۔

یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔ یہ اس کا کام نہیں تھا۔ اسے اس کی چاہت کے برخلاف زبردستی سونپا گیا تھا سو ایسے میں شاید یہی ہونا تھا کہ جو ہو رہا تھا۔ وہ تو ابھی اپنے ساتھ ہو جانے والے حادثے کے صدمے ہی سے باہر نہیں آپائی تھی اور اب یہ مصیبت۔

وہ آتش کو فون کر کے بے طرح رو پڑی تھی۔ آتش چوں کہ وہاں گوناگوں مصروفیات میں گھرا ہوا تھا۔ اور سوشل میڈیا کو وقت نہیں دے پا رہا تھا سو اسے یہاں کی صورت حال کا اندازہ نہیں تھا۔ مگر جب بی ذی کے کہنے پر اس نے ذرا توجہ دی تو پہلی بار..... یقیناً پہلی بار وہ بی ذی پر ہر لحاظ، ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس بری طرح دہاڑا کہ وہ سہم گئی۔

"اتنے عرصے میں نے تمہاری تربیت پر محنت کی، اس کا یہ نتیجہ دیا ہے۔ تم نے؟" وہ سخت برافروختی سے بولا۔ "بی ذی مزید شدت سے رونے لگی۔

"میرے برسہا برس کی ریاضت، محنت، ساکھ سب خطرے میں ڈال دی ہے۔ تمہاری زبان کی ذرا سی لغزش نے۔" اس کا طیش کسی طور پر کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ "جب میں تمہیں سب کچھ لکھ کر دے گیا تھا، پھر کیا ضرورت تھی تمہیں اپنی جانب سے کچھ بھی بولنے کی؟"

"لیکچر تو لکھ کر دے گئے تھے۔" وہ بھی اس بار ذرا چڑ کر بولی۔ "مگر ان سوالات کے جواب تو نہیں جو وہ اسٹوپڈ مجھ سے کرنے والے تھے۔"

اب اس پر وہ کیا کہتا۔ سچ ہے کہ اپنے "شاگرد" کو تعلیم دی جا سکتی ہے اس کی تربیت کی جا سکتی ہے مگر اسے اپنا "کلون" تو نہیں بنایا جا سکتا۔

"خیر..... خیر....." کچھ دیر سوچ بچار کے بعد آتش گمبھیرتا سے آگے کا لائحہ عمل بیان کرتے ہوئے بولا۔

"اب ایسا ہے کہ کچھ دن تم لیکچر ہال سے دور رہو۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔"

"شرر نے اس دن میری بہت مدد کی تھی۔" وہ رومال سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔ "تم چاہو تو اس سے کام لے سکتے ہو۔"

"میں کرتا ہوں کچھ۔" اس نے کہا۔ "فی الحال تم پس منظر میں چلی جاؤ اور اپنے سوشل میڈیا ہینڈلز کا استعمال ترک کر دو۔ اگلے ہفتے میری کتاب کی رونمائی ہے۔ اس وقت میں کسی بھی قسم کا اسکینڈل برداشت نہیں کر سکتا۔"

☆☆☆

"پہلے پہل تو مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ یہ کیا کر گئی کم بخت....."

عینا کے ہاں بیٹا ہوا تھا..... وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھی مگر اس کے سسرال والوں کا خیال تھا کہ رسم کے مطابق اسے چھلہ اپنے میکے ہی میں کرنا چاہیے۔ سو یوں وہ ان دنوں گوشہ عافیت میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کا کمرہ تو ظاہر ہے کہ اوپر تھا مگر اب جب کہ "ایک خالی کمرا" نیچے بھی موجود تھا سو اس کے آرام کے خیال سے شریفہ نے وہ کمرہ اس کے حساب سے تیار کروا دیا تھا حالانکہ وہ معترض تھی مگر شریفہ نے اپنی سی کر کے دم لیا۔ اور اس وقت نقاہت زدہ چہرے پر مامتا کا نور لیے بیٹھی عینا کے سامنے بڑے غصے سے براجمان، بہت شاد سے لہجے میں گویا تھیں۔

"مگر اب محسوس ہو رہا ہے کہ جو ہوا اچھا ہی ہو گیا۔"

"دادی بیگم اس کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔" عینا خود ابھی موت کی دہلیز چھو کر آئی تھی، سو ماں کی بات پر ذرا ناگواری محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "اور آپ کہہ رہی ہیں کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔"

"ارے چھوڑو....." شریفہ نے گردن مارتے ہوئے کہا۔ "ان کی ایسے ہی لکھی تھی۔"

وقتی صدمہ اپنی جگہ پر اب وہ دوبارہ اپنی جون میں لوٹ چکی تھیں۔

اور بھانجے سے ملنے کے شوق میں کمرے کی جانب آنے والا مفتاح، جو اتنے دن سے یہ سمجھ رہا تھا کہ

حالات نے شاید شریفہ کا دل نرم کر دیا تھا، جہاں کی تہاں ٹھہر گیا۔
"چلیں، ان کی ایسے ہی لکھی تھی۔" عینا کچھ خفگی سے بولی۔ "اور اس ذلت کا کیا جو اس کی اس حرکت کی وجہ سے ہم سب کی ہو رہی ہے۔"
"ہیں؟" شریفہ تعجب سے بولیں۔ "اس بھگوڑی کے بھاگ جانے سے ہماری بھلا کون سی ذلت ہو رہی ہے؟"
"کس دنیا میں رہتی ہیں مام آپ؟" عینا کو حقیقتاً ان کی بے پروائی پر حیرت ہوئی تھی سو وہ سنجیدگی سے بولی۔ "مجھ سے پوچھیے کہ جسے دن رات اپنے سسرال میں کیسے کیسے سوالات کا سامنا ہے۔"
"وہ کوئی مڈل کلاس نہیں جو تجھ سے سوالات کرتے پھر رہے ہیں۔" شریفہ تلملا گئیں۔ "اپر کلاس والوں کی طرح اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھ رہے۔"
"کیوں کہ کلاس چاہے مڈل ہو یا اپر۔" عینا بولی۔ "یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس پر ردعمل ایک ہی طرح کا آتا ہے۔"
"دفع کرانہیں۔" ان کا مشورہ حاضر تھا۔ "کسی کو جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں۔"
"آپ نے ٹھیک کہا۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔ "مجھے کسی کو واقعی جواب دینے کی ضرورت نہیں پر برہان کے آگے میں شرمندہ شرمندہ سا محسوس کرتی ہوں خود کو۔"
"کیوں؟" شریفہ بڑے زور سے چونکیں۔ "کیا اس نے کچھ کہا ہے تجھ سے؟"
"کہا تو نہیں۔" اس نے گمبھیرتا سے بتایا۔ "پر پوچھا تھا کہ تمہاری کزن ایسے کیسے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔"
"وجہ تھی نا۔" دروازے کے دوسری جانب کھڑے مفتاح کے اعصاب تن گئے۔
"وجہ تو تھی۔"
"تو کہہ دیتی کہ مجھے کیا پتا کہ کیا وجہ تھی۔" شریفہ پہلی بار ذرا پریشان سی ہو کر بولیں کہ ظاہر ہے "اپنے داماد" کا معاملہ تھا۔
"جی مام..... انہیں تو میں نے کچھ نہ کچھ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا پر، اب یہ بتائیں کہ آپ نے واشلہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"
"کیا سوچنا ہے؟" وہ اپنے آئندہ منصوبے سے اسے آگاہ کرتی ہوئی بولیں۔
"سہراب کو فون کروں گی کہ لے کر آئے اپنے ماں باپ کو۔"
"سہراب کو؟" عینا حیرت سے بولی۔ "اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی؟"
"ارے کچھ نہیں ہوا۔" شریفہ اپنے زعم میں پورے یقین سے بولیں۔
"وہ تو بے کار میں اسی بھگوڑی کا عاشق الزام لگا رہا تھا بچے پر، اس کے دل میں کوئی چور ہوتا تو یہاں آتا ہی کیوں؟"
"ہاں خیر..... یہ بھی ہے۔" عینا کے برابر میں لیٹا نومولود کسمانے لگا تھا، سو اس کی ساری توجہ اس جانب مبذول ہو گئیں۔
"سوچ رہی ہوں تمہاری طبیعت ذرا سنبھل جائے۔" شریفہ ایک لحظہ توقف کے بعد بولیں۔ "تو پھر عافیہ باجی کی طرف چلتے ہیں۔"
وہ کس لیے۔" عینا احتیاط سے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگائے ہوئے بولی۔

''ارے عباد کے لیے فرحی کا ہاتھ مانگنے اور کس لیے۔'' وہ بولیں۔ ''اب دیر نہیں کرنی، واثلہ اور عباد کو ساتھ ہی نمٹانے کا ارادہ ہے میرا۔''

وہ اپنی کہنے میں مصروف تھیں جب کہ مفتاح یہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

''کیا کر رہی ہیں، سو رہی تھیں کیا؟''

وہ لاؤنج کے در و دیوار سے کسی اجنبیت سے اکتا کر ایک بار پھر فیروزہ کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اور ابھی وہ کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ جیسے کسی نے بٹن دبا کر، ایک جھماکے سے وہ منظر روشن کر دیا تھا کہ جس میں وہ اپنے بے طرح الجھے سرمئی بالوں کے درمیان سے دو حصے کیے، ہاتھی دانت سے بنی کنگھی بمشکل تمام ان میں پھیرنے کی کوشش میں ہانپ رہی تھیں۔ عامر جو اس وقت ان کے کمرے میں وارد ہوا تھا۔

''ارے ناہی رے بابو۔'' وہ سادگی سے بولیں۔ ''اپنے سر میں کنگھی نہیں نا کیے تھے اتنے روز سے، ابھی وہی کرنے کا کوشش کر رہے ہیں۔ پر لگتا ہے کہ نا ہی کر پائیں گے نے۔'' ان کا نحیف بازو اس معمولی مشقت ہی سے درد کرنے لگا تھا۔ سو انہوں نے تھک ہار کر کنگھی تھاما ہاتھ پہلو میں گراتے ہوئے مایوسی سے کہا۔

''اب آئے گی نے جب شونا تو اس سے کہیں گے کہ چٹیا گوندھ دے ہماری۔''

''یہی...... '' وہ جو ڈھیلا ڈھالا سا بیٹھا ہوا تھا، فیروزہ کی اس بات پر معاً تیر کی طرح سیدھا ہوتے ہوئے تملا کر بولا۔ ''آپ کی یہی باتیں ریتا کو سب کی نظروں میں ذلیل کروانے کا باعث بنتی ہیں۔''

''اے بابو......'' وہ حیران سی ہو کر بولیں۔ ''ہم تو دلہن کا نام بھی نہیں نا لیے ہیں پھر تم کاہے ہمرے سر ہو رہے ہو؟''

''سر اس لیے ہو رہا ہوں کہ بالوں میں کنگھی کروانے کے لیے آپ شونا باجی کا انتظار کیوں کر رہی ہیں، ریتا سے کہیں...... وہ آپ کا خیال نہیں رکھتی کیا؟''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی تیزی کندی تھی کہ فیروزہ بے چارگی محسوس کرتے ہوئے وضاحتاً بولیں۔

''ہم کب انکار کیے ہیں بابو۔ پر ہمیں اچھا نہیں نا لگتا ہے اسے ایسی حالت میں تکلیف دینا۔''

''ابھی کتنی اچھی اچھی باتیں کر رہی ہیں آپ۔'' وہ عورتوں کی طرح دو بدو بحث کرتا ہوا بولا۔ ''یہی باتیں عیسیٰ کے سامنے بھی کیا کریں نا آپ...... اس سے تو بیٹھ کر آپ میری بیوی بے چاری کی شکایتیں لگاتی ہیں۔''

''ہم کب شکایت لگائے ہیں اس سے؟'' وہ ناخلف کے لہجے پر رنجیدہ خاطر ہو کر بولیں۔

''بس...... بس سب جانتا ہوں میں۔'' وہ طنز سے منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو میری بیوی کی اچھائی ہے جو اس ماحول میں گزارا کر رہی ہے۔ ہوتی کوئی اور تو آپ کو زہر دے کر کب کی فارغ ہو چکی ہوتی۔'' اسے خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ رعونت میں کیا بول گیا تھا، پر جو بول گیا تھا اس جملے نے فیروزہ کے دل کو زخم زخم کر دیا۔

''ہم کو زہر دے کر فارغ کر چکی ہوتی۔'' وہ صدمے سے چور لہجے میں بولیں۔

''ہم کا ایسے خراب آدمی ہیں۔''

''بس...... بس۔'' وہ بے زاری سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''اب رونے دھونے مت بیٹھ جایئے گا۔ میں اس وقت آپ کے پاس ذرا ایک اہم کام سے آیا تھا۔ یہ بتایئے کہ گھر کے کاغذات کہاں رکھے ہیں آپ نے؟''

''گھر کے کاغذات سے تم کا کیا کام ہے نے؟'' فیروزہ ذرا چونک کر بولیں تو وہ بھانپ گیا۔

''آج کل کے حالات کا کوئی بھروسہ نہیں، گھر میں چوریاں ہو رہی ہیں۔ ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ کل کلاں کوئی گھر کے کاغذات لے اڑا تو ہم کہاں خوار ہوتے پھریں گے۔''

pklibrary.com

''تم کا پریشان ہونے کا کوئی ضرورت نہیں۔'' فیروزہ خفگی سے بولیں۔ ڈاکو اگر لے گیا نے ہمرا کاغذ سیو تو ہم کچھ کر ہی لیں گے نے۔''

☆☆☆

''کیسے ہو شرر؟''

ہر پہلو سے غور و خوض کے بعد بالآخر آتش اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ فی الوقت ''شرر'' کو ''استعمال'' کر کے حالیہ تنازعہ کو کسی طور پر دبا دیا جائے۔ اسی اثنا میں اس کی کتاب بھی بازار میں آجاتی، یوں اس جانب سے فراغت پا کر آتش کدے میں منعقدہ نشستوں کی ''قیادت'' ایک بار پھر وہ خود کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ حالانکہ اسے کچھ دن مزید ابھی وہیں ٹھہرنا تھا، مگر بذریعہ انٹرنیٹ اپنے ارادے کو عملی جامعہ پہنانا اس کے لیے کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔ دشواری تو فی الحال یہ تھی کہ شرر سے رابطے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس موجود نہ تھا۔ نہ تو اس کا فون نمبر، نہ ہی اتا نہ پتا۔ متفکر بی ذی رہ رہ کر افسوس کر رہی تھی کہ اے کاش اس کا نمبر ہی حاصل کر لیا ہوتا! مگر اب وہ کرے تو کیا کرے؟

لیکچر کا دن نزدیک آرہا تھا اور ایسے میں اس کی بے چینی اور آنے والوں کا سامنا کرنے کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ آتش اب اس بات پر بحالت مجبوری غور کر رہا تھا کہ کیوں نہ کچھ عرصے کے لیے نشستوں کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے کہ تب ہی، بی ذی کے لیکچر سے ایک روز قبل وہ اس سے کیا گیا مدد کا وعدہ نبھانے کی خاطر آتش کدے چلا آیا۔

اسے روبرو پا کر بی ذی کی کو جیسے جان میں جان آگئی اور اس نے بنا وقت ضائع کیے اپنے فون سے آتش کا نمبر ملا کر فون شرر کو یہ کہہ کر تھما دیا کہ سر آتش اس سے کچھ بہت ہی خاص بات کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یوں اب رابطہ قائم ہونے پر اس کے ''آداب'' کے جواب میں یک بیک چونک جانے والے آتش نے اپنی مخصوص گمبھیر و پراثر آواز میں اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

''میں جیسا بھی ہوں اس سے کسی کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔'' وہ جیسے خود پر ہنس کر بولا۔

''اس لیے میری رہنے دیجیے۔ آپ اپنی سنایے سر آتش کہ آپ کیسے ہیں؟''

''تم سے رابطے کی کوئی صورت نہ پا کر ذرا متفکر تھا۔'' وہ لہجے کو لطافت کا پیراہن پہنا کر بولا۔ ''پر اب بہت مطمئن ہوں۔''

''اب میں اس کے جواب میں زہے نصیب تو کہہ نہیں سکتا کہ یہ نصیب، مقدر، قسمت جیسے بقول آپ کے ''اریلی ونٹ'' الفاظ کی استعمال تو آپ کے ہاں ممنوع ہے۔''

''ہیں.....'' وہ ذرا سا مسکرا کر بولا۔ ''تم چاہو تو اس لفظ کو ادبی پیرائے میں استعمال کر سکتے ہو۔''

''رہنے دیجیے سر.....!'' وہ ترنت بولا۔ ''میں اتنا بے ادب نہیں ہوں۔''

''تمہاری یہی بے باک حاضر جوابی تمہارا طرہ امتیاز ہے شرر۔'' آتش کو واقعتاً اس سر پھرے سے گفتگو کر کے لطف آتا تھا سو برملا بولا۔

''ممنون ہوں سر۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''مگر کیا کہتے کہ ''مکھی اور مکڑی'' کی نظم میں نے پڑھ رکھی ہے۔''

''خوب بہت خوب۔'' آتش کو اس کے جواب نے محظوظ کیا تھا۔ تب ہی وہ داد دیے بغیر رہ نہ سکا۔ ''اس لیے تو میں سمجھتا ہوں کہ تم بہت آگے جاؤ گے۔''

''بی ذی نے بتایا کہ آپ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں۔'' چوں کہ اسے اپنے متعلق آتش کی کی

جانے والی پیش گوئی میں کوئی دل چسپی نہیں تھی سو وہ اس کی بات نظر انداز کر کے گمبھیرتا سے گویا ہوا۔
''مجھے تمہید باندھ کر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اب جب کہ شرر سیدھا مطلب کی بات پر آ ہی گیا تھا سو وہ بھی درجہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''ساری صورت حال تمہارے سامنے ہے میں بی ذی کو بہت اعتماد سے اپنا قائم مقام بنا کر ادھر آیا تھا۔ مگر اس سے کام خراب ہو گیا۔ انٹرنیٹ پر اس کے خلاف ایک طوفان بپا ہے اسے شدید ردعمل کا سامنا ہے۔''
''یہ سب میں جانتا ہوں سر آتش۔'' وہ بے تاثر سے لہجے میں مگر کچھ سوچتی نگاہوں سے سامنے براجمان، کچھ بے چینی، کچھ پریشانی سے شرر کو سنتی بی ذی کا چہرہ دیکھ کر بولا۔ ''آپ وہ بتایئے کہ جس کی خاطر مجھ سے رابطہ کیا ہے۔'' اس کے بنا لاگ لپٹ سیدھے سوال پر آتش کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر بہت ہموار و نپے تلے سے لہجے میں بولا۔
''میں چاہتا ہوں کہ آتش کدے کے لیکچر ہال میں کچھ دن اب صرف تمہاری آواز گونجے۔''
''اور اتنی بڑی ذمے داری آپ مجھے کیوں کر سونپ رہے ہیں۔'' اس نے حیران ہوئے بغیر مگر ذرا الجھ کر پوچھا تھا۔
''کیونکہ تم میری خاص نشست کا حصہ رہے ہو۔'' وہ بولا۔
''خاص نشست کا حصہ تو وہ یونیورسٹی بھی رہا ہے۔'' وہ کج بحثی سے بولا۔
''اس طرح تو یہ کام آپ اسے بھی دے سکتے ہیں۔''
''نہیں دے سکتا۔'' آتش خشک سے لہجے میں بولا۔
''کیوں نہیں دے سکتے؟'' سوال کرنے میں تو وہ ماہر تھا۔
سو اسی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔
''کیوں کہ اس کا ایک نیوٹرل امیج ہے۔'' آتش کو جواب دینے میں کبھی بھی کوئی دقت نہیں ہوتی تھی سو اس وقت بھی بڑے آرام سے اس کی تشفی کی خاطر بولا۔ ''اور اس کا یہ امیج ہمارے لیے بہت کارآمد ہے۔ تم کرو یہ کام۔ تمہیں کون جانتا ہے؟''
''ہاں واقعی۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''مجھے کون جانتا ہے؟''
''مگر اب چوں کہ آتش کدہ تمہارا حوالہ بننے جا رہا ہے سو میری نصیحت ہے کہ الفاظ کا چناؤ کرنے میں خاص احتیاط برتنا۔'' وہ ناصحانہ بولا تو شرر مضطربانہ کہہ اٹھا۔
''لیکن سر..... یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔''
''ہاں ہے۔'' اس نے انکار نہیں کیا۔ پر جانے کیوں مجھے بھروسا ہے تمہاری فصاحت و بلاغت پر..... اور بلاشبہ زبان دانی پر بھی۔ اس لیے یقین ہے کہ تم یہ ذمے داری بہ احسن طریق نبھا لو گے۔''
وہ انکار کر کے یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر.....
کچھ تھا..... کچھ تھا کہ جس نے اس کے قدم زنجیر کر لیے تھے۔

☆☆☆

''لنچ یوں ہی اب تک میز پر پڑا ہے۔ کیا پرابلم ہے کھانا کیوں نہیں کھایا تم نے؟''
وہ پچھلے ایک ماہ سے اس بنکر نما قید خانے میں ''بند'' تھی۔ اس کے کھانے پینے کا بندوبست و دیگر اشیائے ضروریہ کا خیال سرور شاہ ہی کے ذمے تھا۔ وہ یہاں مستقل رہتا نہیں تھا۔ بس دو چار دن میں کسی وقت چکر لگا کر اس کا حال احوال، اور ضرورت دریافت کرتا، دو چار عامیانہ جملے اس کی جانب اچھالتا اور اپنی راہ لیتا تھا۔

یوں تو اتنے دن سے ڈبہ بند اشیائے خورد و نوش پر اس کا گزارہ تھا پر آج وہ کسی ہوٹل سے گرما گرم تازہ کھانا لے کر آیا تھا۔ جسے اس نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ یہاں گزار کر جب وہ عادتاً سیٹی پر ایک انگریزی نغمے کی دھن بجاتا واپسی کے لیے نکل رہا تھا، تب اس کی نگاہ میز پر رکھے کھانے پر پڑی اور اس کے شیشے کی سطح سے آب و باد ماتھے پر بل پڑ گئے۔ جا کر اس کا مقفل دروازہ کھٹ کھٹایا جو اس نے بنا ہچکچاہٹ کھول بھی دیا۔ اور اس کے استفسار پر چیخ کر بولی۔

"مجھے نہیں کھانا۔"

"کیوں نہیں کھانا؟" اس نے آنکھیں ذرا میچ کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے میری بات کرواؤ سہراب سے۔" اس کا آج بھی وہی مطالبہ تھا۔

"کتنی بار سمجھاؤں کہ اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر میرے پاس نہیں ہے، وہ جب چاہتا ہے خود رابطہ کر لیتا ہے مجھ سے۔" وہ بے زار ہو کر بولا۔

"پر کیوں کر رہا ہے وہ ایسے۔" وہ اچانک ہذیانی ہو کر چلائی۔ "آخر کیا مصیبت پڑی ہے اسے..... وہ اب تک آیا کیوں نہیں یہاں؟"

وہ پچھلے ایک ماہ سے صبر، صبر، صبر کی تلقین سن رہی تھی۔ اس عرصے میں دو تین بار ہی سہراب سے فون پر بات ہو سکی تھی۔ آخر اور کتنا صبر کرتی وہ؟

"تمہاری فیملی پولیس کی مدد سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔" اس نے چڑ کر بتایا۔

"ذرا سی بھی بے احتیاطی انہیں سہراب تک سے لے آئے گی۔ اور پھر وہ لوگ سہراب کے ذریعے ایزی لی (با آسانی) تم تک پہنچ جائیں گے۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تمہارے..... میں جانتا ہوں کہ تم سہراب سے ملنے کو تڑپ رہی ہو مگر بلڈ آن بے لی..... ایسی بھی کیا بے تابی؟"

"بکواس بند کرواپنی....." اس کا لہجہ کچھ ایسا بے باک تھا کہ وریٰ خفت سے سرخ پڑ گئی۔

"اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"اے....." سرور شاہ کے لبوں پر در آنے والی معنی خیز مسکراہٹ پل میں معدوم ہوئی اور وہ یک بیک غراتے ہوئے بولا۔ "یہ گھر میرا ہے، اور تم اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو اس لیے زبان سنبھال کر بات کرو مجھ سے، مجھے ایسے لہجے سننے کی عادت نہیں۔ آئندہ مجھ سے اس طرح بات کی تو میں بھول جاؤں گا کہ تم سہراب کی ہو۔"

وہ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑاتے لہجے میں کہہ کر فی الفور یہاں سے جا چکا تھا۔ اور وریٰ..... وہ خوف کے ایک نئے ذائقے سے۔ آشنا ہوئی تھی۔ سو کچھ دیر تو ساکت و صامت یونہی کھڑی رہی۔

پھر احساس تذلیل سے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

"کیا بات ہے؟ آج بڑی فریش فریش سی لگ رہی ہیں؟" وہ میکانکی انداز سے کمرے سے نکل کر اب اجاڑ حال لان میں آ بیٹھا تو کتاب زیست کا ایک اور لمحہ بڑے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے اس کے ساتھ ہی آ بیٹھا تھا۔

اس نے ان دنوں پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹیوشنز بھی پڑھانا شروع کر دی تھیں۔ یوں وہ قدرے مصروف ضرور ہو گیا تھا مگر فیروزہ سے غافل نہیں..... اس وقت سہ پہر کے چار بجنے والے تھے اور اسے ایک ٹیوشن کے لیے نکلنا تھا سو عادتاً فیروزہ کو الوداع کہنے کے لیے ان کے کمرے میں جھانکا۔ اور انہیں وہاں نہ پا کر ذرا تشویش

سے سارے گھر میں انہیں تلاش کرتا پھرا۔ وہ اندر کہیں نہیں تھیں سو بڑی تیزی سے لان کی جانب آیا اور انہیں وہاں کین کی کرسی پر براجمان پا کر اسے یک گونہ قرار سا ملا تھا۔ سو وہ ان کے برابر میں گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے شوخی سے بولا۔

حالانکہ خاکی رنگ کی سلوٹ زدہ ساڑی میں ملبوس وہ بہت ویران بہت اداس اور کسی گہری سوچ میں مستغرق دکھائی دیتی تھیں پر اس کے شوخ لہجے پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیں۔ پر بولیں کچھ نہیں۔ تب اس نے ذرا سنجیدہ سا ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا امی؟ طبیعت ٹھیک ہے۔ کیا سوچ رہی ہیں؟"

"ہم سوچ رہے ہیں کہ تیرے ابو نہ جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔" وہ غمگین سے لہجے میں بولیں تو وہ اداس ہو گیا۔

"آپ کو ابو یاد آ رہے ہیں؟" حالانکہ یہ سوال غیر ضروری تھا مگر.....

"ہاں....." انہوں نے انکار نہیں کیا۔ "یاد تو آ رہے ہیں نے آج بہت۔"

"کیا ہوا۔" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ "کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا کر لفظی جواب دے کر بے ساختہ رو پڑی تھیں۔

ضبط کی یوں بھی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے اور یہاں تو بات ہی ایسی تھی کہ جس کے بوجھ تلے وہ دبی جاتی تھیں۔

"امی....." وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پیروں میں آ بیٹھا۔ "بتائیں نا کیا ہوا؟"

"وہ عامر وابو ہم کو کہ اس کی بیوی کا جگہ کوئی اور ہوتا تو ہم کو زہر دے دی ہوتی۔" بڑی شدت سے لگی تھی ان کے دل کو یہ بات، تب ہی وہ کسی کو نہ بتانے کے ارادے کے باوجود عیسیٰ کے سامنے عیاں ہو گئی تھیں۔

"کیسے زہر دیں گی۔" اس کی کن پٹی میں ٹھوکر کی طرح لگا تھا یہ جملہ سو وہ قہر آلود سے لہجے میں بولا۔ "میں جان سے نہیں مار دوں گا ان کو۔"

"ایسا نہیں نا بولتے بابو۔" عیسیٰ کے خوف ناک تیور دیکھ کر فیروزہ گھبراہٹ زدہ سے لہجے میں بولیں۔ "وہ اپنا زبان خراب کیا ہے۔ تم تو نہیں نا کرو نے۔"

"پر..... ان کی ہمت کیسے ہوئی یہ بکواس کرنے کی۔" اس کا طیش کسی طور کم ہی ہونے میں نہ آ رہا تھا۔

فیروزہ کو افسوس ہوا کہ ناحق اسے بتا دیا۔

"جانے دو نے۔" فیروزہ بولیں۔ "بچپن سے چوٹا ہے۔ ابو بولے تھے نا تم سے کہ یہ غلاظت کمائے گا، تو سارا زندگی یہی کرے گا کم بختوا۔ (کم بخت)"

"پر امی! ان کو سبق سکھانا ضروری ہے۔" وہ جذباتیت سے بولا تو فیروزہ اس کے جذبات محسوس کر کے یاسیت سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"تم چھوٹے ہو، اپنا بڑے بھائی کو کیسے سبق سکھاؤ گے رے بابو۔ اس کا چھوڑ دو نے اس کا حال پر..... ایسا لوگ کو وقت برابر سبق سکھا دیتا ہے۔ تم جاؤ نے..... تم کا دیر ہو رہا ہوگا۔"

"ہاں دیر۔" وہ ان کی بات پوری توجہ سے سن رہا تھا، احساس دلانے پر کلائی میں بری چمڑے کے پٹے والی گھڑی دیکھ کر چونکا۔ "دیر تو واقعی ہو رہی ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔

"اچھا امی چلتا ہوں آپ زیادہ ان کی باتوں کو دل پر مت لیا کریں۔ اپنا خیال رکھیں بس۔"

"آؤ تم کا دروازہ تک چھوڑ دیں۔" وہ اس کی باتوں کے جواب میں بمشکل تمام اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش

کرتے ہوئے بولیں۔
"ارے رہنے دیں کیا ہو گیا۔" اس نے منع کرنا چاہا۔ "میں چلا جاؤں گا نا۔"
"تم چلے جاؤ گے بابو۔" وہ اٹھ کر اس کے برابر میں کھڑی ہوتے ہوئے بولیں۔
"تو ہم بھی تو چلے ہی جائیں گے نے...... چلو ذرا کواڑ (دروازے) سے باہر جھانکیں ایسا ہی اندر بند بند دل گھبرانے بھی تو لگتا ہے نے۔"
ان کی توجیہ پر عیسیٰ مسکرایا۔ پھر ان کا ہاتھ چوم کر بولا۔
"خدا حافظ امی...... میں آتا ہوں۔"
"جاؤ بابو۔" وہ اس کے بالوں سے بھرے سر پر جھریوں زدہ لرزیدہ مگر ممتا کی حدت سے بھرپور دست شفقت پھیرتے ہوئے اسے پچکارتے لہجے میں بولیں۔ "اللہ کی امان میں۔"

☆☆☆

"آپ نے لاسٹ لیکچر میں کہا تھا کہ بی۔ ذی میم کے کہنے کا وہ مقصد نہیں تھا کہ جو انہوں نے کہا، تو پھر ان کی گستاخانہ بات کا آخر مقصد کیا تھا؟"
آج شررکا آتش کدے میں بطور مقرر پہلا بیان تھا۔ آتش کے لیکچرز کا پلندہ اس کے کہنے پر بی۔ ذی بعید مسرت اسے تھما کر اپنی گلوخلاصی پر بہت مطمئن ہو گئی تھی اور اب غیر مطمئن ہونے کی باری شرر کی تھی۔ اگرچہ آج کے بیان کا موضوع کچھ اور تھا، یہ الگ بات کہ شرر نے اس پر زیادہ توجہ یوں نہ دی کہ واقف تھا کہ آج کا موضوع خواہ کیسا بھی ہو بات صرف بی۔ ذی ہی پر ہو گی۔
وہ جس سے اپنے ازلی لاپرواہ حلیے میں لیکچر ہال میں داخل ہوا، سامنے دکھائی دیتے معمول سے زیادہ رش نے اسے باور کروا دیا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔
چونکہ یہاں کسی کو اس کے تعارف سے دلچسپی نہیں تھی اور اس کا کوئی لمبا چوڑا تعارف تھا بھی نہیں، سو جوں ہی اس نے محض اپنا نام بتا کر لب کشائی کی ابتداء کی، توں ہی ایک جذباتی سے نوجوان نے سوال کا گولہ اس پر داغ دیا۔ کوئی اور ہوتا تو پہلے ہی مرحلے پر اس کے پرخچے اڑ گئے ہوتے، مگر جو پہلے ہی سے ریزہ ریزہ ہو، اسے کیا فرق پڑ جانا تھا۔
سو اس نے پہلے تو بڑے آرام سے اپنے سینے پر ہاتھ باندھے۔ پھر جذبات سے عاری نگاہ مسئول پر ڈالتے ہوئے بہت مزے سے بولا۔
"آپ بھولے نہیں وہ بات۔"
"کیا وہ بات اتنی ہی معمولی ہے کہ باآسانی بھلا دی جائے؟" وہ چیک دار نیلی قمیض و ڈھیلی سی پتلون پہنے بیٹھا گہری نگاہوں والا پریشان صورت شخص کچھ خفگی سے بولا تو شرر نے اس بار ایک گہری سانس لی اور اس کی جانب گھوم کر کھڑا ہوتا ہوا بولا۔
"مجھے آپ کے سوال کا مفصل جواب دے کر مسرت حاصل ہو گی مگر اس سے قبل میں آپ سے متعارف ہونا چاہوں گا۔"
"میرا نام واجد علی ہے اور میں فلسفے کا طالب علم ہوں۔"
"بہت خوب۔" شرر نے سراہنے والے انداز سے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "تو سب سے پہلے آپ یہ بتائیے کہ فلسفہ ہوتا کیا ہے؟"
"فلسفے کی تعریف تو کچھ یوں ہے کہ وہ علم جو کسی بھی شے کی ماہیت؟ ان کے وجود کے اسباب و حقیقت پر

بحث کرتا ہے۔"

"اور بحث اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ جب کوئی اختلافی رائے موجود ہو۔" وہ بولا۔ "ہے نا واجد علی؟"

"ایسا ہی ہے۔" وہ سر ہلاتا ہوا بولا۔

"تو جب ایسا ہی ہے تو اختلاف رائے کا احترام کرنا بھی ضرور فلسفہ سکھاتا ہوگا؟"

"بالکل!" اس پر شرر بڑے دل سے مسکرایا۔ پھر چٹ کرنے والے لہجے میں بولا۔

"تو سمجھ لیجیے بس یہی میرا جواب ہے۔"

"شرر! آپ بات کو گھما رہے ہیں۔" اس بار وہی نوجوان بحث میں کودا تھا کہ جس کو اس روز بی۔ ذی جواب دے کر آج تک زیر عتاب تھی۔ "بی۔ ذی میم نے جو کہا اس کا جواب یہ کیسے ہو گیا؟"

"وہ ایسے ہو گیا کہ جہاں مذہبی کتابوں کے بارے میں نظریہ حمایت موجود ہے، وہیں ایک نظریہ مخالفت بھی وجود رکھتا ہے۔" شرر نے فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"مگر انہوں نے جو کہا اس کا صاف صاف مطلب کفر ہے۔" وہ جذباتیت ہی سے بولا کہ ظاہر ہے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تھی۔

"آپ کے نزدیک اتنا ہی آسان ہے کسی پر کفر کے فتوے لگانا؟" وہ تاسف سے بولا۔ "انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ کتابوں میں درج بہت سے نظریات کو آج کی سائنسی تحقیق یکسر غلط ثابت کر چکی ہے۔" اس سے مراد بنیادی مذہبی نظریات نہیں تھے۔

"سائنس تو آئے روز خود اپنے ہی پرانے نظریات کو باطل قرار دے دیتی ہے۔" وہ شد و مد سے بحث کرتا ہوا بولا۔ باقی سارا ہال دم سادھے یہ مکالمہ سن رہا تھا۔

"ہاں تو ہو سکتا ہے کہ کل خود سائنس بھی۔ رجوع الی اللہ کر لے تو میرے بھائی! اس میں تمہیں اور مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

شرر کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اس کی اس بات پر ہال میں ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

"تو پھر کیا خیال ہے؟ چلیں آج کے موضوع کی جانب؟"

اس نے بڑی خوبی سے بی۔ ذی کی فاش غلطی سنبھال لیا تھا کچھ اس انداز سے کہ رات اس لیکچر کی ویڈیو اپنے فون میں دیکھتے آتش نے اپنی چبھتی تیز روشنی سے بھری آنکھوں میں معنی خیز مسکراہٹ لا کر اس مرد بے پرواہ مگر پراسرار وکار آمد کے لیے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

"سہراب تم کہاں تھے؟ کہاں رہ گئے تھے سہراب؟"

پورے دو ماہ بعد، ایک رات جیسے دبے پاؤں بہت آہستگی سے، بالکل اچانک سہراب آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ کر کہ اس کی نظر کا دھوکا ہے مگر جب اس نے قلب کو منجمد کر دینے والی آواز میں اسے پکارا۔

تب وہ دیوانہ وار اس کے سینے سے لگنے کو آگے بڑھی مگر پھر فوراً ہی جھجک کر اپنی جگہ ٹھہر گئی۔ یہ اور بات کہ وہ جذبہ سارے کا سارا اس کے لہجے میں سمٹ آیا تھا۔

"دیکھو، میں محبت میں سرخ رو ٹھہری۔ میں تمہاری ایک پکار پر اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑ آئی سہراب۔"

"ہاں!" وہ چند ثانیے یوں ہی بنا پلک جھپکے اسے دیکھا کیا پھر عجب سرد سے انداز میں مسکرا کر بولا۔ "مگر ایک چیز اپنے ساتھ لے کر آ گئی ہو ناز آفرین۔"

"وہ کیا؟" یقیناً اس کا محبوب اس کی "قربانی" کا قدر دان تھا، تب ہی تو اس کی آندھی طوفان کی محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے تمہید باندھ رہا تھا۔ اسے یہی گماں گزرا تھا تب ہی بڑے ناز سے مسکائی تھی۔

"وہ جوڑا، جو میں نے اپنی ہونے والی دلہن کو بڑے چاؤ سے دیا ہوگا۔" وہ مسکرا کر کہتا، دھیرے دھیرے چلتا اس کے انتہائی نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کک..... کک کیا کہہ رہے ہو؟" اس کے پھیلے لب یک دم سکڑے۔

"وہی جو تم نے سنا۔" وہ ہنوز نافہم سے انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔ "وہ جوڑا تم نے آئی ہونا۔"

"ہاں تو اور کیا کرتی۔" وہ الجھن محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "وہ جوڑا تو میں نے پہن رکھا تھا نا۔"

"کیوں پہن رکھا تھا؟"

"سہراب.....؟ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" اس کا رنگ اڑ گیا تھا سہراب کی آنکھوں میں دیکھ کر۔

"میں نے بتایا نا کہ۔"

"شش..... شش۔" وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کی بات درمیان سے قطع کرتا ہوا اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"مجھ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا تو تم اس کی دلہن بننے چلی دیں؟"

"سہراب؟" وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"بتاؤ نا حور جہاں؟"

"میں کیا کرتی؟" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ میری تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔"

"سمجھ میں نہیں آ رہا تھا؟ یا ارادہ بدل گیا تھا؟"

"کیا کہہ کر رہے ہو؟" وہ اس الزام پر ششدر رہ گئی۔

"بتاؤ نا ماہ تاب، جان خانہ خراب۔"

"مم..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے تم سے۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔ "تم مجھ سے اس طرح بات کیوں کر رہے ہو؟"

"ڈرو مت غنچہ دہن۔" وہ سفاکی سے بولا۔ "میں تو وہی ہوں تمہارا سہراب جس سے تم بے وفائی کرنے چلی تھیں۔"

"کوئی بے وفائی نہیں کر رہی تھی تم سے۔" معاً وہ چلا اٹھی۔ "خیال یہی تھا کہ ابھی جو ہو رہا ہے اگر وہ ہو بھی گیا تب تم واپس آ کر سب سنبھال لو گے۔ اتنا بھروسا تو تھا مجھے تم پر..... تم چاہو تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

"ویسے ہی جیسے پہلے کھائی تھی، اس خدائی فوج دار کو پھنسانے کے لیے۔" اس نے مسکراتے لہجے، مگر سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

وہ دم بخود رہ گئی۔

"بتاؤ نا جام سرور..... جواب دو نا۔" اچانک ہی اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھرا کرسٹل کا گل دان اٹھا کر آئینے میں دے مارا تھا۔ سنگھار میز کا آئینہ ایک دھماکے سے زمین بوس ہوا تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی اپنے خوش رنگ خوابوں کا تعاقب کرتی غور کے بیاباں میں بھٹک جانے والی وہ حسین تتلی بھی۔

جس کی پنڈلی میں ایک ٹھوکر مار کر وہ غصے میں بپھرا "محبوب" کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

"عامر کہہ رہا تھا کہ بس کچھ دن اور صبر کرلو۔ میں گھر کے کاغذات حاصل کرلوں پھر دیکھنا اس عیسیٰ کا کیا کرتا ہوں۔"

وہ سر جھکائے ہنوز لان کی گھسی ہوئی کرسی ہی پر بیٹھا ہوا تھا کہ نا جانے کیا بات تھی کہ وہ اٹھ کر اندر جانے کی سکت خود میں فی الوقت نہ پاتا تھا۔ پر اس کا شعور ایک ایسے منظر کو تھام رہا تھا کہ جو اس نے من کی آنکھ سے بار بار دیکھا تھا۔ فیروزہ جس سے عیسیٰ کو الوداع کر کے اندر لوٹیں، رینا اس وقت لاؤنج میں لگے فون پر صاعقہ سے محو گفتگو تھی کہ ایک ٹینشن میں کچھ مسئلہ آ گیا تھا ورنہ تو وہ اپنے کمرے ہی میں فون پر بات کرلیا کرتی تھی۔

"کیا کرے گا وہ اس سر پھرے کا؟" صاعقہ جو اپنے پانچویں شوہر سے خلع اور حق مہر کے نام پر لاکھوں لے چکی تھی اور ان دنوں اپنے میکے ہی میں رہائش پذیر تھی، موٹے موٹے رسیلے انگور حرے سے ٹونگتی ہوئی بولی۔

"صرف باتیں ہی ہیں تیرے شوہر کی...... میری مان تو یہ صبر و بر چھوڑ اور کوئی قدم اٹھا لے اپنے روشن مستقبل کے لیے۔"

"تو کیا کروں؟" رینا سخت برا مان کر بولی۔ "کیا تمہاری طرح اپنے شوہر سے طلاق لے لوں؟"

"تجھے تو طلاق لے کر بھی کچھ نہیں ملنا۔" صاعقہ اس کے "واجبی" سے حق مہر کا مضحکہ اڑاتی ہوئی بولی۔ "اس سے بول گھر میرے نام کرتا ہے تو بات کرے۔"

"کاغذات مانگے تھے بڑھیا سے۔" وہ آواز دبا کر ادھر ادھر محتاط انداز سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "اس نے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ کہاں رکھے ہیں۔"

"ہاہاہا۔" صاعقہ دل جلانے والا قہقہہ لگا کر بولی۔ "وہ کیوں بتانے لگی۔ تو ہی کچھ کوشش کر۔"

"کیا کروں؟" رینا غصے سے دانت پیس کر بولی۔ "کیا جان سے ماردوں اسے؟"

"ہاں مار دے۔"

وہ ابھی اپنی اہم باتوں میں مشغول تھی کہ تب ہی فیروزہ کے کمرے کی جانب سے ایک دھماکے سے کچھ گرنے کی آواز آئی تھی۔

"ہائے!" رینا نے بے ساختہ فیروزہ کے کمرے کی سمت گھوم کر کہا۔ "کہیں گر گرا تو نہیں گئی بڑھیا۔"

"کیا ہوا؟" صاعقہ نے پوچھا۔

"بڑھیا کے کمرے سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی ہے۔" اس نے ذرا تشویش سے بتایا۔

"تو؟"

"تو یہ کہ بیٹیاں سکھا کر گئی تھیں بڑھیا کو کہ دروازے کی کنڈی کھول کر واش روم جایا کریں۔ کبھی خدانخواستہ اگر گر ورگئیں تو بھابھی آ کر دیکھ تو سکتی ہیں۔" وہ نغمی کی نقل اتارتی ہوئی بولی تھی۔

"ہاں تو تو باہر ہے کیا؟" صاعقہ سفاکی سے مسکرا کر بولی۔ "مت دیکھ جا کر۔"

"کیا مطلب؟" رینا چونکی۔

"مطلب یہ کہ فون بند کر اور اپنے کمرے میں جا کر مزے سے سو جا، آیا کچھ سمجھ میں؟"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

pklibrary.com

حمیرا شفیع

سالک نوا اور آنٹی پرابلم

pklibrary.com

چار جنوری کی یخ بستہ رات تھی۔ سردی ہڈیوں میں گھسی جارہی تھی۔ مگر احمد منزل کے مکین سرد موسم سے بے نیاز مہندی کی تقریب کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ویسے بھی جب گھر پر خوشیوں کی بارات اتری ہو تو پھر گھر والوں کو سردی گرمی کی بھلا کب پروا ہوتی ہے۔ اس وقت بھی افراتفری کا سا سماں تھا۔

لڑکیاں بالیاں خوب صورت پیراہن میں ملبوس تتلی کی مانند اڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ کی تیاری مکمل تھی اور کچھ کی آخری مراحل میں تھی۔ سولہ سنگھار کے باوجود کوئی بھی مطمئن نہیں تھی۔ کسی کو اپنا ہیر اسٹائل نہیں جچ رہا تھا۔ اور کسی کا آنچل ہی سیٹ نہیں ہو رہا تھا۔ گھر کے مردوں نے الگ جلدی جلدی کا شور مچا رکھا تھا۔ دراصل پہلے تو گھر کے آنگن میں ہی تقریب منعقد کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر مہمانوں کی اتنی بڑی تعداد کے لیے وہ کم پڑ رہا تھا تو گھر سے قریب ہی ایک وسیع خالی پلاٹ کے اردگرد قناتیں وغیرہ لگا کر اندر اسٹیج بنا دیا تھا۔

عورتوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو کر وہاں چلی بھی گئی تھی۔ فقط رائمہ اور دو کزنز وانیہ اور ثانی تیار ہو رہی تھیں۔ وانیہ اور ثانی کے تو دوپٹے ہی ورزن نے بنارسی پن لگا کر، ابھی ابھی بھجوائے تھے اور رائمہ بے چاری کا عین وقت پر پراندہ گم ہو گیا تھا۔

"ہائے اللہ! میرا پراندہ نجانے کہاں کھو گیا۔" وہ پریشان ہوئی جارہی تھی۔ دوپہر کو ہی تو ڈریسنگ ٹیبل پر چوڑیوں، نیکلس اور بندیا کے ساتھ ہی رکھا تھا مگر اب سب کچھ وہیں موجود تھا مگر پراندہ غائب ہے۔ "ہائے اللہ..... اب کیا کروں.....؟؟"

"پراندہ نہیں مل رہا تو کوئی میچنگ پونی وغیرہ ہی لگا لو۔" وانیہ اور ثانی بھی پراندہ ڈھونڈ واتے ہوئے عاجز آ چکی تھی۔

"ہرگز نہیں..... سارا اسٹائل برباد ہو جائے گا۔"

پیلے غرارہ سوٹ اور سبز دوپٹے کے ساتھ ہرا شیشوں والا پراندہ، اس نے ساری مارکیٹ خوار ہو کر لیا تھا۔

"چچی وہاں ہمیں کوس رہی ہیں کیونکہ لڑکیوں کو مہندی کے تھال ہم نے ہی تقسیم کرنے ہیں۔" ثانی جھنجھلا کر بولی۔

"تم دونوں جاؤ۔ میں کسی بچے کو ساتھ لے کر آجاؤں گی۔"

یہ طے تھا کہ اس نے ہر حال میں پراندہ ڈھونڈ کر ہی دم لینا تھا۔ وانیہ اور ثانی چلی گئیں۔ وہ ادھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی کہ ایک صوفے پر دھرے ایک کشن کے نیچے دبا پراندہ مل گیا۔ اس کی سانس میں سانس آئی۔ کام والی برتن دھو رہی تھی۔

"پروین! میرے پراندا تو ڈال دو۔"

پروین سے پراندہ ڈلوا کر، اس نے ایک آخری بھرپور نظر اپنی تیاری پر ڈالی پھر چھوٹی آپا کے گڈو کو ہمراہ لیا اور ہال کی جانب چل پڑی۔ بچہ اس سے آگے بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ غرارے کی وجہ سے سج سج کر قدم اٹھا رہی تھی۔ ہال سے ابھی چند گز دور تھی جب پاؤں کسی پتھر سے ٹکرایا اور اس کی نازک سی ستاروں موتیوں والی چپل عین درمیان سے کھل گئی۔

"ہائے اللہ! اب کیا کروں۔ سارے حادثے آج ہی ہونے ہیں۔"

اس نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کا کزن فرقان موٹر سائیکل پر آ رہا تھا۔

"کیا ہوا رائمہ.....؟؟"

"میری چپل ٹوٹ گئی ہے۔ میرا خیال ہے میں واپس چلی جاؤں۔"

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"اس ٹوٹی چپل کے ساتھ اب واپس بھی کیسے جاؤ گی؟ ایسا کرو موٹر سائیکل پر بیٹھ جاؤ۔ ہال کے دروازے پر اتار دیتا ہوں۔ اندر جا کر پروین کو فون کر دینا۔ وہ جب گھر کو تالا لگا کر آئے گی تمہارے لیے کوئی جوتا لیتی آئے۔"

اسے فرقان کی تجویز معقول لگی۔ ویسے ہی

واپس جانے میں مزید وقت ضائع ہوتا تھا۔ وہ اچک کر موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ ذرا سا تو فاصلہ تھا۔

جب وہ دروازے پر اتری تو فرقان موٹر سائیکل اڑا کر لے گیا، اس نے سامنے دیکھا تو آنٹی رابعہ چلی آ رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائیں اس کی جان ہوا ہو گئی۔ کتنے غلط وقت پر اس کا ان سے ٹکراؤ ہوا تھا، دزدیدہ انداز سے انہیں دیکھتی ہوئی تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔

شادی ختم ہوئی تو زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ رائمہ اور فرقان دونوں اس چھوٹے سے واقعہ کو بھول بھال بھی گئے۔ ایک دن فرقان یونی ورسٹی سے واپس آیا تو دیکھا کہ سارا گھر چوپٹ پڑا تھا اور امی جان اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی تھیں۔ ورنہ عام طور پر تو وہ اس وقت کچن میں مصروف ہوتی تھیں۔

"کیا ہوا ہے اماں جان!" اس نے تشویش سے چادر کا کونہ ہٹایا۔

"کیا طبیعت ناساز ہے؟"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے......" انہوں نے شدید خفگی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"جس کی تم جیسی اولاد ہو اس کی طبیعت ٹھیک رہ سکتی ہے بھلا۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"ہیں...... ان کو کیا ہوا......؟ صبح تک تو بالکل مطلع صاف تھا۔"

وہ شدید حیران ہوا۔ دل ہی دل میں اپنے چند روز قبل کے حالات و واقعات، ذہن میں دہرائے کہ غلطی کیا ہوئی تھی۔ اب تو کتنے دن سے اس نے کوئی آن لائن شاپنگ بھی نہیں کی تھی۔ نہ ہی نیا موبائل لیا تھا اور نہ ہی کسی دوست کو گھر بلا کر رات گئے تک محفل سجائی تھی۔ ہاں البتہ ماموں جان سے تین ہزار ادھار ضرور لیے تھے۔ وہ بھی اتنے تنگ دل تو نہ تھے کہ اماں سے اس کی شکایت جڑ دیتے۔ اس سے بڑی رقم تو وہ کئی بار ان سے لے کر ہضم کر چکا تھا۔ پھر آخر ہوا کیا ہے؟؟ یہی سوال تڑپ کر اس کے لبوں سے نکلا۔

"اماں جان! آخر ہوا کیا ہے......؟؟"

"بے حیا! بتاؤں تمہیں ہوا کیا ہے......؟" وہ تڑپ اٹھیں، چادر پرے پھینکی اور سیدھی ہو بیٹھیں۔

"نا...... میں نے اپنی بہن کے ہاں تمہاری منگنی تمہاری رضا مندی سے کی تھی نا...... بتا مجھے تم سے پوچھا تھا نا کہ رابعہ سے منگنی پر تم راضی ہو یا نہیں۔"

وہ ایک غیر متوقع بات کر رہی تھیں۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں تو میں نے کب انکار کیا ہے؟ میں نے کب کہا ہے کہ مجھے رابعہ سے منگنی پر اعتراض ہے۔" ٹوٹ ٹوٹ کر جملے اس کے منہ سے نکلے۔

"اگر اعتراض نہیں ہے تو پھر سکینہ کے بیٹے کی مہندی پر تم رائمہ کے ساتھ کہاں رنگ رلیاں مناتے پھر رہے تھے۔" وہ شیر کی مانند گرجیں۔

"میں...... کیا...... رائمہ کے ساتھ......"

الزام سن کر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور پھر یک لخت اس کے ذہن میں مہندی کی رات ہونے والا واقعہ گھوم گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آ گیا کہ جب وہ رائمہ کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر ہال تک لایا تھا تو آنٹی رابعہ نے، ان دونوں کو دیکھ لیا تھا اور آج غالباً وہی گھر آئی تھیں اور سارا واقعہ اپنی مرضی کا سیاق و سباق دے کر اماں کو سنا کر بلکہ ایک طرح سے بھڑکا کر گئی تھیں۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ویک اینڈ ہمیشہ ہی خواتین کے لیے مصروفیت بھرا ہوتا ہے۔ پھر ایک ورکنگ ویمن کے لیے تو اور بھی زیادہ ہنگامہ خیز ہوتا ہے، کیونکہ اس نے ہفتہ بھر کے تمام وہ ضروری امور سر انجام دینے ہوتے ہیں جو باقی دنوں میں ممکن نہیں ہوتے۔ صائمہ اور اس کے میاں دونوں ہی نوکری پیشہ تھے۔ ویک اینڈ کے لامتناہی کام دونوں نے برابر برابر بانٹ رکھے تھے۔

صائمہ تمام سودا سلف لاتی اور اس کے میاں گھر کے باقی کام نمٹاتے پہلے تو اس کے الٹ ہوتا تھا۔ میاں سودا سلف لاتے تھے۔ مگر انہیں خریداری کی زیادہ سمجھ بوجھ ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہ دوکان دار سے

pklibrary.com

زیادہ بھاؤ تاؤ کر سکتے تھے۔ خراب سامان مہنگے داموں لے آتے تھے۔ اس لیے صائمہ نے اب یہ شعبہ خود سنبھال لیا تھا۔ اس وقت بھی وہ بچوں کو سلا کر شاپنگ پر جا رہی تھی۔

"آپ یہ لہسن پیاز غیرہ کاٹیں۔ میں جلد واپس آجاؤں گی۔" اس نے لہسن پیاز کی ٹوکری ان کے سامنے دھری۔

"دیکھیے! پیاز ذرا لچھے دار کاٹیے گا ورنہ قورمہ مزے دار نہیں بنے گا۔" وہ جاتے جاتے ہدایت دینا نہیں بھولی۔

"بیگم! میں نہ تو لچھے دار باتیں کرنا جانتا ہوں اور نہ ہی لچھے دار پیاز کاٹ سکتا ہوں۔" وہ خوش دلی سے مسکرائے اور وہ انہیں بائے بائے کرتی ہوئی رخصت ہوئی۔

وہ اپنے دھیان میں لہسن چھیل رہے تھے۔ دروازے پر ذرا سی دستک ہوئی اور پھر کوئی اندر داخل ہوا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔

آنٹی پرابلم چلی آرہی تھیں۔

"آئیں خالہ جان! تشریف لائیں۔" وہ اخلاقاً کھڑے ہوئے۔

"صائمہ ذرا مارکیٹ تک گئی ہے۔"

"ہیں..... کیا خود گھومنے نکل گئی ہے اور تمہیں ہانڈی چولہے پر لگا گئی ہے۔" انہوں نے بظاہر شیریں زبان میں زہریلا جملہ ادا کیا۔

"نہیں خالہ!..... دراصل اسے سودا سلف کی خریداری کی زیادہ تجربہ ہے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے وضاحت کی۔

"میرا تو خیال ہے کہ اسے میاں کو بے وقوف بنانے کا زیادہ تجربہ ہے۔" وہ پھنکاریں۔

"یہ نوکری پیشہ عورتیں، مردوں کو ایسے ہی گھریلو امور میں الجھا کر خود سیر سپاٹے کرتی پھرتی ہیں۔ ورنہ اس نے کون سا خرید و فروخت میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ ویسے بھی آج کل تو ہر چیز کی فکس پرائس ہوتی ہے۔ بارگیننگ کا تو رواج ہی نہیں رہا۔"

وہ تو پندرہ منٹ بیٹھ کر چلتی بنیں مگر صائمہ کے میاں کو شش و پنج میں ڈال گئیں۔ انہوں نے ذرا گہرائی سے سوچا تو انہیں، آنٹی پرابلم کی باتیں ٹھیک ہی لگیں۔ صائمہ خود تو آدھا دن بازار میں گزار آتی تھی اور وہ بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ، گھر کے کام کاج میں گھن چکر بنے رہتے تھے سارا ویک اینڈ اسی طرح گزر جاتا تھا۔

کئی کئی ہفتے وہ اپنے دوستوں کی محفل میں بھی نہ جا پاتے تھے۔ اگر وہ نوکری کرتی بھی تو ان پر کوئی احسان تو نہیں کرتی تھی۔ وہ بھی تو آفس میں اوور ٹائم لگاتے تھے۔ بچوں اور اس کو سہولت دینے کی خاطر شام کو بھی ایک پارٹ ٹائم جاب کرتے تھے۔ لے دے کر ایک ویک اینڈ ہی تو بچتا تھا وہ بھی غارت ہو جاتا تھا۔ انہوں نے تنفر سے چھری پرے پھینکی اور بیڈ پر چت لیٹ گئے۔

☆☆☆

بہو کے کمرے سے منے کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ انہوں نے اپنی نماز مکمل کی اور اندر چلی آئیں۔

"کیا بات ہے رومینہ! منا کیوں روئے جا رہا ہے۔"

"پتا نہیں اماں جان! کب سے بہلا رہی ہوں چپ ہی نہیں ہو رہا۔"

"لاؤ! مجھے دو" انہوں نے دیکھا کہ بچے کا ایک کان سرخ تھا اور وہ مسلسل اسے مسلے جا رہا تھا۔

"بیٹا! اس کے تو کان میں درد ہے۔ ڈراپ ڈالو اور ساتھ میں کوئی پین کلر سیرپ بھی دو۔"

"جی اچھا اماں!" اس نے ایسا ہی کیا۔ تھوڑی دیر بعد بچہ غنودگی میں چلا گیا تو بہو کہنے لگی۔

"اماں جان! آپ اس کے پاس بیٹھیں۔ میں جلدی سے رات کی روٹیاں ڈال لوں۔ کہیں گیس نہ چلی جائے۔"

"نہیں بیٹا! ابھی پوری طرح سے نیند میں گیا نہیں ہے۔ کہیں دوبارہ نہ رونا شروع کر دے۔ روٹیاں میں ڈال لیتی ہوں۔"

"جی اچھا اماں جان!" وہ ممنون نظروں سے انہیں دیکھتی رہی، انہوں نے کچن میں جا کر روٹیاں پکانی شروع کیں۔ کمر کے مہرے درد کرتے تھے۔ یوں کھڑا ہو کر کام کرنے میں مشکل تو بہت ہو رہی تھی مگر جیسے تیسے وہ لگی رہیں۔ اچانک انہیں آہٹ سی محسوس ہوئی تو انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سامنے سے وہ ہی چلی آ رہی تھیں جن کو سارا خاندان آنٹی پرابلم کہتا تھا۔ انہوں نے مسکرا کر استقبال کیا۔

"آؤ بہن..... رک کیوں گئیں۔"

"میں تو صدمے سے گنگ رہ گئی ہوں۔ میری بہن اس عمر میں روٹیاں تھوپ رہی ہے۔"

وہ لہجے میں زمانے بھر کی ہمدردی اور محبت سمو کر بولیں، ایک لمحے کے لیے ان کا دل بھی ان کی اس قدر محبت اور خلوص پر پگھل سا گیا۔

"ارے نہیں بہن..... روٹیاں تو بہو پکاتی ہے آج منا بیمار ہے تو میں نے کہا کہ میں پکا لیتی ہوں" وہ سرسری سے لہجے میں بولیں۔

"ارے رہنے دو تم! یہ آج کل کی لڑکیاں بہت نازک مزاج بنتی ہیں۔ ابھی فقط ایک بچہ ہے۔ وہی سنبھالا نہیں جا رہا۔ تمہیں اپنا وقت بھول گیا۔ ماشاء اللہ سے پانچ بچوں کا ساتھ تھا جن میں سے دو تو جڑواں تھے۔

ایک کو تم کپڑے کے جھولے میں ڈالتی تھیں اور دوسرے کو کندھے سے لگا کر، سارے گھر کا کام کرتی تھیں کوئی ملازمہ تک نہ تھی۔ یہاں تو دو دو ماسیاں آتی ہیں۔"

"ارے نہیں! روبینہ بھی ماشاء اللہ سے کام کاج میں ہوشیار بچی ہے۔" انہوں نے ایک بار پھر بہو کی صفائی پیش کرنی چاہی مگر اس بار ان کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔

لوہے کو گرم دیکھ کر آنٹی پرابلم نے مزید دو چار آگ لگا دینے والے جملے بولے اور ان کا کام ہو گیا۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ روبینہ روز بروز کام چور ہوتی جا رہی تھی۔

اور وہ اپنی سادگی میں آگے بڑھ کر خود ہی اپنی خدمات پیش کرتی تھیں ابھی بھی روٹیاں پکانے کے بعد ان کا کچن سمیٹنے کا ارادہ تھا۔ اب انہوں نے اس کو قطعی موقوف کر دیا اور تن فن کرتی ہوئی بہو کی گوشمالی کرنے دوبارہ اس کے بیڈروم میں چلی گئیں۔

☆☆☆

سال کی آخری شام تھی۔ گھر کے تمام بچے ڈائننگ ٹیبل کے ارد گرد بیٹھے تھے، جو انواع اقسام کے کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ پورے مہینے کا جیب خرچ جمع کر کے، انہوں نے ماں کے حوالے کیا تھا تاکہ اس شام وہ ایک چھوٹی سی پارٹی کر کے نئے سال کو ویلکم کر دیں۔ انہوں نے مل کر دیواروں پر غبارے اور ننھی ننھی موم بتیاں بھی سجائی تھیں، سب بے حد خوش تھے جب پھولے پھولے گالوں والی ماہ رخ چلائی۔

"وہ دیکھو آنٹی پرابلم آ رہی ہیں۔" وہ اندر داخل ہو ہی رہی تھیں، جب اس نے کھلی کھڑکی سے انہیں دیکھ لیا۔

"ہائے اللہ جی! اب یہ جا کر پھوپھو اور چاچو کے گھر میں بتائیں گی کہ ہم کتنے فضول خرچ ہیں۔" بارہ سالہ عبداللہ کی بھی تشویش بھری آواز سنائی دی۔

اس کے بعد بچے کورس کی شکل میں گانے لگے۔

"آنٹی پرابلم..... آنٹی پرابلم....." اور باہر کھڑی آنٹی پرابلم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اور وہ الٹے قدموں لوٹ گئیں۔

☆☆☆

پیاری قارئین بہنو! آپ کو اور ادارے کی تمام آپیوں کو میری طرف سے نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ خدا کرے کہ یہ سال ہمارے لیے خیر و عافیت کا پیغام لے کر آئے اور ہمارا دامن ڈھیر ساری خوشیوں سے بھر جائے۔ (آمین)

آؤ اس سال کی آمد پر ہم عہد کریں کہ ہم کسی کے لیے بھی آنٹی پرابلم کبھی نہیں بنیں گے۔ آسانیاں بانٹو اور سدا خوش رہو۔

☆☆

زارا منجرا

کہر میں ڈوبی شام

ناولٹ

اوائل نومبر کی پہلی رم جھم شروع ہو چکی تھی۔ یہ اس کا پسندیدہ موسم تھا۔ اس نے کتاب بند کر کے سائیڈ پر رکھ دی، وہ اس موسم کو خوب انجوائے کیا کرتی تھی ابھی بھی وہ اسی ارادے سے کچن میں آئی تھی۔ امی شیلف پر سبزیاں پھیلائے رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

"ماشاء اللہ بہت پیارا موسم ہے۔" اس نے کچن کی کھڑکی کھول دی، ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہوئی۔

"آپ آلو کاٹیں، میں پالک توڑ کر لاتی ہوں پھر دادا جان کے آنے سے پہلے پکوڑے بنا لیتے ہیں۔"

امی کے سامنے آ کر اس نے جس طرح ندیدے پن سے کہا، وہ اس کی معصومیت پر مسکرا دیں۔

"اچھا چلو، تم جاؤ۔ پالک اور پودینہ توڑ لاؤ۔"

وہ ایک سمجھ دار خاتون تھیں، جواں عمری کی بیوگی پر آج تک دھبہ نہیں لگنے دیا تھا اور اب جواں سال بیٹی کی حفاظت کے لیے وہ ماں اور باپ دونوں کے فرائض نبھا رہی تھیں۔ ماں والی سختی بھی رکھتیں اور کبھی کبھی باپ والے لاڈ بھی اٹھاتیں۔ اس کی ننھی ننھی خواہشیں بھی پوری کر دیا کرتیں۔

"ڈیئر ماما! یہ رہا پودینہ اور پالک، آپ جلدی سے دھو کر کاٹیں۔ میں پہلے پودینے کی چٹنی پیس لیتی ہوں پھر پکوڑوں کا آمیزہ گھول کر تل لوں گی۔"

"اچھا رکھ دو، میں کرتی ہوں۔ تم چٹنی پیسنے سے پہلے چائے چڑھا دو، پتا ہے نا تمہارے دادا جان کو پکوڑے اور چائے بیک وقت گرم گرما چاہیے ہوتی ہے۔"

"یہ تو ہے مگر آپ فکر نہ کریں، ان کے پہنچنے تک سب ہو جائے گا۔"

نزاکت کو بھی یہ موسم بہت پسند تھا وہ بھی اس موسم میں ایسی فرمائشیں کیا کرتے تھے۔ گڑ والی چائے کے ساتھ کئی نوازمات باہر سے آ جاتے پھر بھی بالک کے پکوڑے ضرور بنوایا کرتے تھے۔" انہیں مچھیڑے تقریباً سولہ سال ہو گئے تھے مگر حسنہ ہر پل ہر موقع پر انہیں یاد کیا کرتی تھیں۔

کچھ لوگ خود تو بہت دور چلے جاتے ہیں مگر اپنی یادیں ہمارے اردگرد چھوڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے آنکھوں میں آئی نمی کو پلکوں کی باڑ میں جذب کر لیا۔

دادا جان نماز پڑھ کے واپس آ گئے تھے۔ گیٹ کھلنے کی آواز پر زارا نے کھلی کھڑکی کے پار دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ حسنہ نے تلے ہوئے گرما گرم پکوڑوں کو کڑھائی سے نکال کر ٹرے میں رکھا، چائے بھی بالکل تیار تھی۔

سیڑھیوں سے ٹک ٹک کرتی سوہا افراتفری کے عالم میں اتری اور یہ جا وہ جا۔ دوپٹے سے بے نیاز جینز پر ٹاپ پہنے وہ گیٹ کی طرف بڑھ گئی، دادا جان کو اس کے حلیے پر سے سخت کوفت ہوئی تھی، برا تو ان ماں بیٹی کو بھی لگا تھا، کم از کم دادا جان کا ہی لحاظ کرے مگر کچھ کہنے کی ہمت کس میں تھی۔

"آپ کی من پسند ساری چیزیں تیار ہیں۔" زارا کی متجسس نظریں ان کے پیچھے چھپے ہاتھ کی کھوج میں تھیں۔

"اور ہم بھی آپ کی من پسند چیز لائے ہیں۔" دادا

جان نے گرما گرم جلیبیوں کا لفافہ سامنے کر کے لہرایا۔
"یو آر ویری گریٹ دادا جان!" دلا رے کہتے ہوئے اس نے جلیبیاں ان کے ہاتھ سے لیں۔
سوہا ہاتھ میں کچھ پکڑے آ گئی تھی، ان پر نظر ڈالے بنا کچن کے آگے سے گزر کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔
"دیکھ رہی ہو حسنہ! اس رخسانہ نے لڑکیوں کو کتنی چھوٹ دے رکھی ہے۔"
انہوں نے ڈیلیوری بوائے کو، اپنے گیٹ کی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور اب سوہا کے ہاتھ میں ڈبوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ صرف پیزا پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا بلکہ اور بھی کافی کچھ تھا۔
"چھوڑیں ابا جان! وہ اپنے گھر میں خود مختار و آزاد ہیں، جو مرضی کریں۔" حسنہ نے رسان سے کہا۔
"ماما! آپ لوگ لاؤنج میں جائیں، میں چائے نکال کر یہ سب لاتی ہوں۔"
زارا گرم جلیبیاں نکال کر پلیٹ میں رکھنے لگی

pklibrary.com

وہ نہیں چاہتی تھی دادا جان مزید غصہ کریں، اس طرح ان کا بی پی ہائی ہو جایا کرتا تھا، اوپر والے پورشن میں بڑے برانڈز کے فوڈ کے مزے اڑائے جا رہے تھے اور یہاں یہ تینوں، سادہ سی چیزوں سے بھرپور لطف اندوز ہوتے ہوئے موسم انجوائے کر رہے تھے۔

بارش میں تیزی آ گئی تھی، مطلب سردی بڑھنے والی تھی۔

☆☆☆

وہ بالکونی میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ تائی اور ایمان دونوں بازار گئی ہوئی تھیں اور سوہا یونی، اس لیے وہ یہاں بیٹھ سکتی تھی ورنہ ان کی موجودگی میں وہ بالکونی میں نہیں آ سکتی تھی۔ نہ ہی چھت پر جا سکتی تھی، ایک طرح سے یہ وہ لوگ نیچے والے پورشن تک ہی محدود کر دیے گئے تھے مگر جب اوپر کوئی نہ ہوتا، وہ تھوڑی دیر کے لیے نیچے بھی جایا کرتی تھی۔

اچانک ایک بائیک گیٹ کے سامنے آ کر رکی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

"یہ تو سوہا ہے مگر... اس کے ساتھ لڑکا۔" وہ پہلے حیران ہوئی پھر پریشان، سوہا کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں یقیناً کچھ کپڑے تھے۔

"بھلا تایا ابو نے ان لوگوں کی کون سی خواہش پوری نہیں کی جو ان کو کوئی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کرنے کے لیے یوں دستیاں لگانی پڑیں۔" وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ سوہا اس کو اوپر دیکھ لے۔

نیچے کچن کے آگے ان کا تصادم ہوا۔

"تم یونی نہیں گئیں آج؟"

وہ نخوت سے اسے نظر انداز کرتی بڑے زعم میں آگے بڑھنے لگی تھی، جب ہی رارا کی آواز پر چونک کر پلٹی۔

"کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو، خیریت؟"

جواب دینے کے بجائے الٹا سوال داغ دیا۔

"نہیں وہ تمہارے ہاتھ میں یہ شاپنگ بیگ دیکھ کر پوچھا کہ شاید شاپنگ پر گئی تھیں۔"

اس نے بہت تحمل سے کہا لیکن سوہا کے جیسے سر پر لگی اور تلووں میں بجھی۔ "تم! اب مجھ سے تفتیش کرو گی۔" اس نے کھا جانے والی نظروں سے زارا کو دیکھا۔

"جاہل لڑکی، بدتمیز ذرا بھی تمیز نہیں سکھائی تمہاری تمیز دار ماں نے تمہیں کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑایا کرتے۔"

"خبردار، جو تم نے میری ماں کے لیے کچھ بولا اور ہاں وقت ثابت کر دے گا کہ کس کی ماں نے اسے کیا سکھایا ہے۔"

وہ اس پر طنز کرتی وہاں سے نکل گئی۔

"کالی بلی نے راستہ کاٹ دیا، اب اللہ خیر کرے۔" سوہا بڑبڑاتی اوپر چلی گئی۔

☆☆☆

"کیا ضرورت تھی تمہیں یہ سب کہنے کی۔" امی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"مجھے نہیں پتا، میرا موڈ نہ خراب کریں۔" وہ غصے سے قابو پاتی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو زارا! میں تمہیں آج پھر سمجھا رہی ہوں، تمہیں کوئی بھی بدزبانی نہیں کرنے دوں گی۔ آج کے بعد ان کے کسی معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرنا۔"

"کیسی ماں ہیں آپ، یہاں بیٹھی سب کچھ سنتی رہیں، سامنے آ کر اسے کچھ بولا بھی نہیں اور اب مجھے سنانا شروع ہو گئی ہیں۔" اسے مزید تپ چڑھی۔

"اس لیے کہ غلطی تمہاری تھی، تم کیوں اس سے تفتیش کر رہی تھیں۔" حنہ نے دوٹوک بیٹی کو جواب دیا۔

وہ فیس سلائی کر رہی تھیں۔

امام مسجد کی بیوی کے، چند جوڑے تھے، انہیں ایک دو دن تک سلائی کر کے لوٹانے تھے۔

"اور ایک بات یاد رکھو زارا! آئندہ تمہارا رویہ دوسروں کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تمہیں اپنی ماں کی تربیت پر بات سننی پڑے۔"

"ٹھیک ہے، آپ کو آئندہ شکایت نہیں ملے گی، میں اکیڈمی کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔"

وہ وہاں سے اٹھ گئی، وہ انہیں سوہا کی حرکتوں کے بارے میں کیسے بتاتی۔

☆☆☆

آج اتوار تھا۔ اس کی اکیڈمی سے چھٹی تھی اس لیے کچن کا سارا کام آج اسے ہی کرنا تھا۔ وہ کڑھی اور چاول بنا رہی تھی، یہ اس کا پسندیدہ کھانا تھا اور وہ ہمیشہ بہت دل لگا کر کڑھی چاول بناتی تھی۔

حسنہ کو بھی مزید وقت مل گیا۔ وہ سلائی کا کام نبٹانے میں مصروف تھیں۔ دادا جان باہر لان میں پودوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

"ماما! کھانا تیار ہو گیا ہے۔" وہ لوگ وقت پر کھانا تھے کیونکہ دادا جان سردی کے دنوں میں مغرب کی نماز کے لیے جانے سے پہلے کھانا کھاتے تھے۔

"زارا بیٹا! اوپر بھی کڑھی چاول دے آؤ۔" حسنہ جانتی تھیں کہ ان دونوں بچیوں کو بھی کڑھی چاول بہت پسند ہیں۔

"ٹھیک ہے ماما! میں جاتی ہوں۔" وہ ٹرے میں چاول اور باؤل میں کڑھی لے کر اوپر چلی گئی۔

"ارے واہ بھئی، یہ زارا آج ہمارے گھر کا راستہ کیسے بھول گئیں۔" رخسانہ کو طنز کرنا شاید ان کے بڑوں نے سکھایا تھا۔ ہر وقت چلی کٹی کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔

"تائی جان! امی نے کڑھی چاول بھیجے ہیں۔" اس نے ان کے طنز کے جواب میں رسان سے کہا۔ لاؤنج کے دونوں صوفوں اور ٹیبل پر کل کی شاپنگ کا سامان پڑا ہوا تھا، وہ لوگ نجانے کتنی بار دیکھ چکے تھے۔

"زارا! آجاؤ دیکھو۔ ہم نے کتنی شاپنگ کی ہے کل۔" ایمان نے صوفے سے بیگ اٹھا کر اسے بیٹھنے کی جگہ دی۔

"جا سوہا! جا جلدی سے اپنی چچی کو بھی بلا لا اب بکھیڑا پڑا ہے تو اسے بھی دکھا دوں۔"

سوہا ناک بھوں چڑھاتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اتنی کاہل لڑکی تھی، ہلنا اس کے لیے موت کے مترادف تھا۔

"یہ کلر اچھا ہے نا؟ یہ دیکھو یہ کرتا۔" ایمان اترا اترا کر اسے ہر چیز دکھا رہی تھی۔ "یہ کرتا سات ہزار کا آیا ہے، سوچو کتنی مہنگائی ہے۔"

"حسنہ! آؤ تم بھی دیکھو۔" اور حسنہ کا سر چکرانے لگا تھا کپڑوں کا ڈھیر دیکھ کر۔

"ساری چیزیں بہت پیاری ہیں تائی امی۔" اتنے خوب صورت کپڑے دیکھ کر بھی اس کے دل میں کوئی ارمان نہیں جاگا تھا حسنہ آ گئی تھیں۔

"یہ دیکھو حسنہ! یہ شال تو دیکھو اس سوٹ کے ساتھ۔ فیئر کر دیکھو ذرا سوٹ کا۔"

رخسانہ نے اپنا سوٹ کھول کر پھیلا دیا۔

"تو حسنہ بی بی! تمہارے دل میں خوب آگ جل رہی ہوگی۔" وہ دل ہی دل میں خباثت سے ہنسیں۔

"جی بھابھی! بہت پیارا ہے سارے کپڑے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔"

"چاچی! کوئی بھی سوٹ دس ہزار سے کم نہیں۔" سوہا نے فخر سے کہا۔ "کل پورے ایک لاکھ تیس ہزار لگا کر آئی ہوں ان چند جوڑوں پر اور اس پہ یہ لوگ ضد کر رہی ہیں کہ ماما، ہمیں سوئیٹرز، جیکٹس اور کوٹ بھی نئے دلوائیں۔ ظاہر ہے دو لاکھ سے کم کا نسخہ تو نہیں ہے اب اگلے مہینے میں دلاؤں گی اپنی بچیوں کو۔"

وہ دیورانی کو جلانے کی خاطر خوب بڑھا چڑھا کر بتا رہی تھیں لیکن یہ سچ تھا، شاپنگ پر پانی کی طرح ہی پیسہ بہائی تھیں۔

"کوئی بات نہیں بھابھی! سب کچھ ان بچیوں کا ہی ہے نا۔" وہ ہر چیز خوش دلی سے دیکھ رہی تھیں۔ ہاں بھئی۔ بس اللہ سدا سایہ سلامت رکھے ان کے باپ کا۔ سب چکا چوند، سب ناز و نعم ان ہی کے دم سے ہے۔" انہوں نے طنزیہ نگاہ زارا پر ڈالی۔

"جاؤ بیٹا، تم اپنے کپڑے نکال کر لاؤ۔ جو اس دن تم بہنیں کہہ رہی تھیں کہ اب ہمارا دل اکتا گیا ہے۔ ہم نہیں پہنیں گے۔"

ایمان سر ہلاتے اٹھی اور چند جوڑے لا کر زارا کو دیے۔

"یہ جوڑے دو چار ہی پہنے ہوں گے ان دونوں کو تم رکھ لو، یہ اتنے مہنگے کپڑے کسی اور کو کیوں دیں۔ پہلا حق تو تمہارا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ اول خویش بعد درویش۔"

وہ سر جھکائے گود میں رکھے کپڑوں کو دیکھ رہی تھی مگر سوچ کچھ اور رہی تھی۔ تائی اپنی بچیوں کی اترن کیسے احسان جتلا کر دے رہی تھیں۔

"شکریہ بھابھی!" حسنہ نے دھیمے سے کہا۔ "ٹھیک ہے بھابھی، اب ہم چلتے ہیں۔" انہوں نے زارا کو اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے حسنہ! تم امام صاحب کی بیوی کے کپڑوں سے فارغ ہو جاؤ تو یہ میں لے آؤں گی نیچے۔ بس کوشش کرو ان کے جلدی نبٹا لو۔" انہوں نے حکمیہ انداز میں کہا۔

"اچھا بھابھی! بتاؤں گی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔

حسنہ محسوس کر رہی تھیں جب سے زارا اوپر سے ہو کر آئی ہے بہت الجھی الجھی ہے، کھانے کے دوران بھی تقریباً خاموش ہی رہی۔

"زارا! کیا بات ہے، تم کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟" وہ دودھ ابال رہی تھیں اور زارا برتن دھو کر رکھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ماما!" وہ کام میں مصروف بس اتنا ہی بولی۔

"زارا، جو کچھ تمہارے ذہن میں چل رہا ہے۔ تم مجھ سے کہو۔" اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"اگر بابا زندہ ہوتے تو آج میری زندگی بھی مختلف ہوتی۔" اس کے لہجے میں یاسیت در آئی۔

حسنہ سمجھ گئی تھیں، وہ ایسا کیوں سوچ رہی ہے۔

"دیکھو زارا! قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں تقدیر کے ساتھ لڑا نہیں جاتا۔ تمہارے دادا جان نے آج تک ہم سے غفلت نہیں برتی۔ اپنی کل پونجی صرف ہم پر لٹائی ہے۔ کیا اس سب کے بعد بھی کوئی شکوہ گلہ بنتا ہے؟ اور پھر بیٹا، موازنہ کرنا ہو تو ہمیشہ اپنے سے نیچے لوگوں کو دیکھنا چاہیے، اللہ نے رہنے کو گھر، کفالت کو مضبوط سہارا، پھر صحت، تعلیم، عقل، شعور سب کچھ تو ہے تمہارے پاس اور کیا چاہیے۔ ہاں کم یا زیادہ یہ سب اللہ کی تقسیم ہے، اس کا یہ نظام ہے اور یہ نظام ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ بجائے اس کے فیصلوں کو قبول کرنے کے ناشکری کرنا اپنا ذہنی سکون برباد کرنے کے سوا کچھ نہیں۔"

ہمیشہ وہ ایسے ہی سمجھاتی تھیں اور ان کا میٹھا لہجہ، سننے والوں پر گہرا اثر چھوڑتا تھا۔ زارا نے اثبات میں سر ہلا کر تل بند کیا۔

"جی ماما! شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"چلیے یہ دودھ گرم ہو گیا ہے، شہد ملا کر دادا جان کو دو۔ چلتی ہوں، بہت تھکاوٹ ہو گئی ہے۔"

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی رگیں غصے سے پھول رہی تھیں کتنی بار وہ بیٹے کو کال ملا چکے تھے مگر اس کا نمبر مسلسل آف جا رہا تھا، انہیں کسی طور چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ اس گھر کے بڑے تھے۔ چپ چاپ کچھ غلط ہوتا کیسے دیکھ سکتے تھے۔ آج جب وہ بازار سے کچھ سامان لے کر لوٹے تھے تو انہوں نے سوہا کو کسی لڑکے کے ساتھ بائیک پر بیٹھے دیکھا تھا۔

وہ یہ بات ہر صورت اپنے بیٹے کے گوش گزار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دوبارہ موبائل اٹھا کر کال ملائی۔ دوسری بیل پر کال ریسیو ہو گئی تھی۔

"کیا حال ہے ابا جان!" انہوں نے رسماً ہی پوچھا کیونکہ ان کے لہجے میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی

"میرے حال کو چھوڑو اپنے گھر کی خبر لو۔" ابا جان بنا کسی لگی لپٹی بات پر آ گئے۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے میرے گھر کو؟" رفاقت صاحب چونک گئے۔

"برخوردار، بڑے سال تم نے باہر کی کمائی کر لی۔ اب پردیس سے بوریا بستر باندھو اور ادھر آؤ۔ تمہاری بچیاں جوان ہیں، تمہیں ان کے سر پر ہونا چاہیے۔"

چاہتے ہوئے بھی سیدھی بات کرنا انہیں دشوار

لگ رہا تھا۔

"کھل کے کہیں ابا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" رفاقت صاحب کو تشویش ہوئی۔

"دیکھو میاں! سیدھی صاف بات یہی ہے کہ تمہاری بیوی شاید جوان بچیوں کو اکیلی نہیں سنبھال سکتی۔ تم یہاں آؤ، آ کے یہ ذمہ خود لو یہ نہ ہو دیر ہو جائے اور پھر پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔"

عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ کچھ کچھ سمجھ تو وہ بھی رہے تھے۔

"ابا جان! میرا خیال ہے رخسانہ ان کی حفاظت اور تربیت بہتر طریقے سے کر رہی ہے اور وہ بالکل مطمئن ہے، پھر بھی میں اس سے بات کرتا ہوں۔" انہوں نے اللہ حافظ کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔

"کیسا احمق انسان ہے۔ بیوی کے عیش و عشرت کے لیے پردیس کی خاک چھانتا پھر رہا ہے اور پیسے کی ہوس میں اپنے دیگر فرائض سے غافل ہو بیٹھا ہے۔ اللہ ہدایت دے اسے۔"

وہ افسردہ سے بیڈ پر ٹانگیں سیدھی کر کے لیٹ گئے۔

"میری زندگی کا کچھ بھروسا نہیں..... میرا خیال ہے، مجھے بھی اپنا فرض بروقت ادا کر دینا چاہیے۔ کل کو اگر مجھے کچھ ہو جائے تو بے چاری حسنہ اکیلی کیا کر پائے گی۔"

آج سوہا نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ بچیاں جوان تھیں اور پھر زارا ابن باپ کی بچی دادا کے علاوہ نہ کوئی آسرا نہ سہارا۔

بیوہ بہو اور پوتی کی ذمہ داری اٹھاتے زندگی بیت گئی تھی۔ جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی پھر بھی بازار سے سودا سلف، دودھ، دہی سب کچھ خود لاتے تھے انہیں آج بھی بیوہ بہو کو باہر بھیجنا معیوب لگتا تھا۔ زارا کو اکیڈمی تک لانا لے جانا یہ سب بھی وہ کر رہے تھے۔ عمر کے جس حصے میں وہ تھے اب یہ سب بھی مشقت ہی لگتی تھی۔ لیکن جب تک ان کے جسم میں جان تھی سب انہیں ہی کرنا تھا۔

رفاقت تو وہ تھا جس نے بھائی کا کفن بھی میلا نہ ہونے دیا اور بیوی کی باتوں میں آ کر کاروبار ٹھپ کر کے اپنا حصہ نکال کر باہر چلا گیا۔

یتیم بھتیجی کا حصہ بھی وہ ہڑپ کر جاتا اگر وہ زندہ نہ ہوتے۔ پھر چھوٹے سے کاروبار کی تقسیم کے بعد چند لاکھ ہی دونوں کے حصے میں آئے تھے۔ کچھ اوپر نیچے کی رقم رفاقت نے یوں ہی ہضم کر لی تھی۔ انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زارا کی امانت بینک میں محفوظ کروا دی تھی۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ اس کی شادی پر ہی نکلوائیں گے کیونکہ گھر تو وہ چلا رہے تھے۔ حسنہ بھی سلائی کر کے کچھ نہ کچھ اوپر نیچے کے خرچے نکال لیتی تھیں، زارا کی بھی تعلیم ختم ہوئی تو اکیڈمی میں بطور ٹیوٹر جانا شروع ہو گئی تھی چند ہزار وہ بھی کما رہی تھی۔ گزر بسر ہو رہی تھی، رفاقت کی فیملی کی طرح شاہانہ زندگی تو نہیں گزار سکتے تھے وہ لوگ لیکن وقت گزر رہا تھا اور وہ سب اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔

☆☆☆

رفاقت صاحب نے کال کر کے، اپنے تئیں گھر کے حالات جاننے کی کوشش کی تھی اور بیوی کو تاکید کی تھی کہ وہ بچیوں کی حفاظت و تربیت پر بھرپور توجہ دیں اور رخسانہ نے انہیں ہمیشہ کی طرح مطمئن کر دیا تھا اور وہ مطمئن ہو بھی گئے تھے۔

"شاید ابا جان نے کسی اور نظریہ سے بات کی ہو اور مجھے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔" وہ ہر فکر سے آزاد ہو گئے تھے لیکن یہاں سوہا کی بے باکیاں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس لڑکے کے ساتھ ملاقاتیں عروج پر تھیں، ہاں مگر اب وہ اسے گیٹ تک چھوڑنے نہ آتا تھا۔

"یہ لڑکی ضرور باپ کی عزت خاک میں ملائے گی۔" زارا نے آج اسے مارکیٹ میں اسی لڑکے کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔

"کیا مجھے یہ سب بتانا چاہیے کسی کو؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "اگر بتاؤں بھی تو کسے بتاؤں؟ ایسی بات دادا جان کو نہیں بتا سکتی میں اور ماما کو بتایا تو وہ کیا سوہا کو روک سکتی ہیں؟ نہیں — تائی جان میری بات کا یقین

کرلیں گی؟ قطعی نہیں وہ الٹا ہمارے خلاف ہو جائیں گی کہ میں ان کی بیٹی پر الزام لگا رہی ہوں۔ پھر کیا کروں ،چپ رہوں۔ یہ بھی تو بہت مشکل ہے میں کیسے جانتے بوجھتے اسے نظر انداز کر سکتی ہوں۔ ٹھیک ہے ،میں ماما سے بات کروں گی پھر جو وہ بہتر جانیں۔"

پھر رات ہی اس نے ماما سے بات کر ڈالی۔

"زارا بیٹا! تمہیں کوئی غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔"

حسنہ کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔

"ماما پلیز! میں کسی غلط فہمی کی بنیاد پر تو اتنی بڑی بات کرنے سے رہی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ بھابھی کو بچیوں کو اتنی آزادی نہیں دینی چاہیے یہ نہ ہو کل کو پچھتانا پڑے۔"

"ماما! آپ تائی جان سے بات کریں۔" زارا نے انہیں چپ دیکھ کر کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے جو بہتر لگے گا کرلوں گی۔ تم آئندہ اس موضوع پر کسی سے بات نہ کرنا اور اٹھو نماز پڑھو پھر سونا بھی ہے۔"

حسنہ کو اس بات کا اندازہ تھا کہ رخسانہ بھابھی جیسی منفی سوچ کی حامل عورت ،ان کی خلوص سے کہی جانے والی بات کو غلط رنگ دے کر تماشا کھڑا کر دیں گی بجائے اپنی بیٹی پر نظر رکھنے کے وہ انہیں کٹہرے میں کھڑا کر دیں گی۔ اور پھر وہ جتنی چالاک ،ہوشیار ہیں ،اپنی بچیوں کی ہر حرکت کو بخوبی سمجھ سکتی ہیں۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ انہیں اس موضوع پر کسی سے کوئی بات نہیں کرنی مگر وہ دل سے دعا گو تھیں کہ اللہ اس گھر کی تمام بچیوں کی عصمت وعزت کی حفاظت فرمائے اور انہیں ہر برائی سے دور رکھے۔

☆☆☆

ابا جان نے نبیلہ سے زارا اور ارسلان کے رشتے کی بات کر ڈالی تھی۔ نبیلہ پھوپھو بہت خوش حال خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ ابا جان نے سوچا تھا کہ دیکھا بھالا خاندان ہے پھر سگی پھوپھی ہے، یتیم بھتیجی کے سر پر ہاتھ رکھے گی۔

نبیلہ باپ کی کو انکار نہیں کر سکتی تھیں اس لیے بخوشی مان گئیں اور اب ابا جان کے اصرار پر ہی وہ ایک رات کے لیے آرہی تھیں تاکہ زارا کو انگوٹھی پہنا کر بات پکی کر جائیں باقاعدہ منگنی کے لیے انہیں وقت درکار تھا، وہ ایک بھرے پرے خاندان سے تھیں۔ انہیں منگنی کا فنکشن ٹھیک ٹھاک کرنا تھا۔

رخسانہ کو جب یہ پتا چلا تو جل بھن کر رہ گئیں، "کس قدر میسنی ہے یہ عورت ساری زندگی سسر پر قبضہ جمائے بیٹھی رہی، نجانے کیا گھول کر پلاتی ہے بڈھے کو جو اسے ان کے علاوہ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔" شوہر کا فون آیا تو انہوں نے ان کے بھی خوب کان بھرے۔

"تمہارے ابا جان کو اس حسنہ کے علاوہ کچھ دکھتا ہی کہاں ہے ساری زندگی کمائی بھی اسی پر لٹائی ہے انہوں نے ،میری بچیوں پر تو آج تک ایک دھیلا نہ لگایا اور اب بھی دیکھ لیں ،کیسے بہو اور بیٹی کو جوڑ دیا ہے اور ہمیں الگ کر دیا ہے۔"

رفاقت بھی دور پردیس میں بیٹھے پیچ وتاب کھا رہے تھے۔

"تم فکر مت کرو، رخسانہ! ہم ہیں نا اپنی بچیوں کے لیے فکر کرنے والے۔ میں یہاں پردیس کس لیے بیٹھا ہوں۔ اس ٹھاٹ باٹ سے اپنی بچیوں کی شادیاں کروں گا کہ دنیا مثالیں دے گی۔ ابا جان نے ساری زندگی میرے ساتھ ناانصافی کی ہے، اب میری اولاد کا خاک بھلا سوچیں گے۔"

انہوں نے ساری زندگی شوہر کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر اپنوں سے دور بدظن تھا۔

"آپ تو سات سمندر پار بیٹھے ہیں، یہاں گھر میں تو دادا ہیں جنہوں نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا انہیں اور زارا کے کیسے لاڈ اٹھاتے ہیں، میری بچیاں یہ سب دیکھ کر اداس ہوتی ہیں، ان کا بھی دل چاہتا ہے کہ ان کے دادا ان سے بھی پیار کریں، لاڈ کریں۔" وہ ٹسوے بہا کر شوہر کی ہمدردیاں بٹور رہی تھیں۔ سوہا اور ایمان بھی جلے دل کے پھپھولے نکالنے کو آج باپ سے بات کر رہی تھیں، ورنہ وہ تو

pklibrary.com

جب کوئی فرمائش کرنی ہوتی تب ہی باپ سے بات کرتیں۔ ان دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا، زارا کو شوٹ ہی کر دیں اور پھر نبیلہ پھوپھو کی آمد کا سن کر بھی ان لوگوں نے نیچے کا رخ نہ کیا۔

حسنہ کو انہیں لینے خود اوپر آنا پڑا۔

"بھابھی! آپ اور بچیاں تھوڑی دیر کے لیے ذرا نیچے چلیں، نبیلہ آئی ہے، وہ زارا کو انگوٹھی پہنانا چاہتی ہے۔"

حسنہ نجانے کیوں ڈر سی رہی تھیں۔ "ویسے حسنہ تمہاری ہوشیاری کی بھی داد دینی پڑے گی۔" رخسانہ جو بھری بیٹھی تھیں انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔

"تم نے سسر کو شیشے میں اتارے رکھا، ہمیشہ اپنی ہر بات سسر سے منوائی اور اب کیسے نند کے گھر پر قبضہ کرنے چلی ہو، بھئی، تم سے تو چالاکیاں سیکھنے کی خاص ٹریننگ لینی چاہیے۔"

"بھابھی! آپ میرے ساتھ نیچے چلیں ابھی۔ بعد میں یہ باتیں ہو جائیں گی۔" وہ رخسانہ کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھیں۔

"رشتہ کرتے وقت تو پوچھا تک نہیں، اب چلی آئیں دنیا دکھاوے کو جاؤ۔ جا کر خود ہی کرلو سب کچھ۔"

"بھابھی! آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں۔ یقین کیجیے، یہ ابا جان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ انہوں نے نبیلہ سے بات طے کر کے ہی مجھے بتایا تھا۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولیں۔

"چاچی! ساری زندگی آپ اس بھولی صورت سے دادا جان کو بے وقوف بناتی آئی ہیں اب آپ کو لگتا ہے، ساری دنیا آپ کے سسر کی طرح آپ کی باتوں پر یقین کر سکتی ہے۔"

ایمان جسے بدتمیزی پر فرسٹ پرائز مل سکتا تھا، بغیر کسی لحاظ کے بولی۔

"بھابھی! نیچے سب انتظار کر رہے ہیں آپ چلیں۔ زارا میری نہیں آپ کی بھی بیٹی ہے پھر یہ اس گھر کی پہلی خوشی ہے۔" سوہا نے ماں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ ہم آتے ہیں۔"

پھر نیچے آ کر بھی ان کے مزاج برہم ہی رہے۔ ہر بات پر جلی کٹی ہی کرتی رہیں اور تھوڑی دیر بعد ہی اوپر واپس آ گئیں۔

☆☆☆

موسم میں خنکی اتر آئی تھی۔ اوپر والے پورشن سے بھی سرشام آوازیں آنا بند ہو جاتیں۔ زارا کو پہلے سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ وجہ وہ شخص تھا جس کے نام کی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں جھلملاتی تھی۔ دل جس کے نام پر دھڑکتا تھا۔ کئی سالوں پہلے ارسلان آیا تھا، وہ جاتے بچپن اور آتے لڑکپن کے دن تھے۔ اسے یاد تھا اس کی ارسلان کے ساتھ کوئی خاص دوستی نہ تھی پھر بھی وہ اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتا تھا پھر وہ اس کی بار بار کھانے کی عادت سے سخت چڑتی تھی۔ ہر وقت فرمائشیں کرتا رہتا۔ وہ بھولی بسری ساری باتیں، اب حسین یادیں بن کر ذہن کے پردے پر جھلملا رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار وہ اتنی خوش تھی کہ اس کے اندر کی خوشی لالی بن کر چہرے پر بکھر رہی تھی، حسنہ دیکھتیں تو دل سے اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کرتیں۔ دادا جان اپنی جگہ بہت خوش اور پر سکون رہنے لگے تھے۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے انہیں سرخرو کیا۔

اس رات وہ تینوں، دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے نجانے رات کا وہ کون سا پہر تھا جب وہ خاموشی سے اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ وہ صبح زارا کے لیے قیامت جیسی تھی، ان کے سر کا سائبان ان کا سہارا اس کے پیارے دادا انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے تھے کچھ ثانیے تو نبیلہ بھی جیسے پتھر ہو گئی تھیں۔ ایک خوشی مقدر میں آئی تھی تو کتنا بڑا دکھ بھی ملا تھا اور دکھ بھی ایسا جس کو بیان کرنے کی سکت تھی نہ الفاظ۔ وہ وہ حسنہ کو کیسے دلاسا دیں وہ تو خود بے آسرا ہو گئی تھی۔ زارا بار بار ماں اور پھوپھو کے گلے سے لپٹ جاتی اسے بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

دوسری طرف سوہا، ایمان اور رخسانہ مگر مچھ کے آنسو بہاتیں پر دل سے کتنی خوش تھیں، برانڈڈ جوڑوں میں ملبوس وہ فخر سے بیٹھی تھیں۔

رفاقت کو انہوں نے اطلاع دی تھی مگر وہ اتنی دور سے نہ آسکے، نہ باپ کے کفن دفن کا سامان کر سکے نہ رخسانہ نے ہی دنیاداری نبھانے کی کوشش کی۔ ارسلان نے سارے انتظامات خود کر لیے۔

زارا کی طبیعت نہیں سنبھل پا رہی تھی۔ حسنہ بہت پریشان تھیں۔ ایک تو صدمہ ہی جان لیوا تھا اور اب زارا بخار میں دھت بے سدھ پڑی تھی جب جب ہوش میں آتی، دادا جان کا نام لے کر سسکاری لیتی۔

"بھابھی! مجھے لگتا ہے، ہمیں زارا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے، گھر میں دوائیں دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ دیکھیں تو سہی، کیا حالت ہے اس کی۔" نبیلہ نے اس کے تپتے ماتھے کا بوسہ لیا۔

"اس حالت میں کیسے جائے گی یہ ڈاکٹر کے پاس۔" حسنہ بھی اس کے سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھیں۔

"بھابھی! اس طرح ہم کیسے ساری رات گزاریں گے، چلیں آپ ہمت کریں، اسے ارسلان کے ساتھ لے جائیں۔"

اسی لمحے ارسلان بھی اچانک کمرے میں آیا تھا۔

"کیا ہوا ہے....." وہ ٹھٹھک گیا۔

"کچھ نہیں بیٹا، یہ زارا کی طبیعت سخت خراب ہے۔" ارسلان کی نظریں اس کے بخار میں تپتے سرخ چہرے پر تھیں۔ سادہ سے کپڑے، عام سا حلیہ۔

"تو یہ ہے وہ جس کے ساتھ اسے باقی تمام زندگی گزارنی ہوگی۔" وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

اگلے دو دن وہ اسی طرح ہوش و خرد سے بیگانہ رہی۔ ڈاکٹر نے بتایا ذہنی صدمہ ہے زیادہ سے زیادہ آرام کی غرض سے نیند کی دوا بھی دی جا رہی تھی۔

حسنہ کو خود ہی سب کچھ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ سارا دن مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا، وہ ماں بیٹیاں تک سک سے تیار محض باتیں بگھارنے کو تھیں، ہاں البتہ نبیلہ اور ارسلان کا تینوں وقت کا کھانا اوپر ہی بنتا اور ان دونوں ماں بیٹی کا کھانا بھی وہ ہی بھجوا رہی تھیں۔ جب تک زارا کی طبیعت سنبھلی، پھوپھو اور ارسلان جا چکے تھے۔

☆☆☆

گھر میں اداسی نے تو جیسے پکے ڈیرے جما لیے تھے۔ دادا جان کو گئے کتنے دن بیت گئے تھے۔ لیکن نیچے کے پورشن میں ابھی تک سوگواری کی فضا قائم تھی۔ حسنہ کو لگتا تھا کہ ان کی بچی اب یتیم ہوئی ہے، چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھتیں کوئی آسرا کوئی سہارا نہ نظر آتا۔

"ابا جان، آپ سارے بوجھ مجھ پہ ڈال کر چلے گئے ہیں۔ میں تو خود آپ کے سہارے چلتی تھی اور اب تنہا جوان بچی کے ساتھ زمانے کے سرد و گرم کا مقابلہ کیسے کروں گی۔" وہ ان کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھیں۔ ان کی لاٹھی جھاڑ کر دوبارہ بیڈ کے ساتھ لگا دی تھی جیسے ابھی تک ان کے آنے کی امید ہو بیج صاف کر کے واپس اسی جگہ رکھی تھی، جہاں وہ رکھتے تھے۔ ہر چیز ویسی ہی پڑی تھی۔

"آپ یہاں ہیں۔" وہ اکیڈمی سے آئی تھی۔

"ہاں چیزوں کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔"

"آپ آرام کریں۔ یہ کام میں کر لیتی۔"

ابا جان کے کمرے میں نظریں گھماتی ایک ایک چیز میں جیسے ان کو کھوج رہی تھی۔

"کھانا بنا لیا تھا تو وقت ہی نہیں گزر رہا تھا۔" کھڑکی صاف کر کے وہ بھی اس کے برابر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو۔" وقت نے ماں بیٹی کو اک نئی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

"آپ اجازت دیں تو میں کہیں جاب کے

لیے اپلائی کروں۔ کیونکہ اس طرح گھر کیسے چلے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم صبح کسی اسکول میں پڑھا لیا کرو شام میں اکیڈمی۔" انہوں نے حل نکال دیا۔

"ماما پلیز چھوڑ دیں اب۔ پرائیویٹ اسکولوں والے کچھ نہیں دیتے۔ میں محنت بھی کروں اور معاوضہ بھی نہ ملے، آپ مجھے کہیں اور جاب کی اجازت دے دیں۔"

وہ زچ ہوگئی۔ پہلے بھی دادا جان اور حسنہ نے اسے کہیں جاب نہیں کرنے دی۔ دادا جان باہر کے حالات سے ڈرتے تھے اور حسنہ ان کی بات کی ہمیشہ تائید کرتی تھیں۔

"زارا! میں تمہیں اسکول کے علاوہ کہیں جاب نہیں کرنے دوں گی۔" ان کا لہجہ قطعی اور فیصلہ اٹل تھا۔ "میرے لیے پہلے ہی بہت مشکلات ہیں، اس لیے میں اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کروں گی۔"

اس سے پہلے وہ جواباً کچھ بولتی، انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔

"ماما! پلیز آپ مجھ پہ بھروسا رکھیں۔ نوکری میں شوق سے نہیں بلکہ گھر کے لیے کرنا چاہتی ہوں۔"

"مجھے تم پہ بھروسا ہے زارا۔" وہ نرمی سے بولیں۔

"تو پھر مجھے اجازت دے دیں۔ یقین کریں آپ کی تربیت پر کبھی انگلی نہیں اٹھنے دوں گی۔"

"میری جان ضد نہ کرو اسکول اور اکیڈمی کی آمدن سے ہم گزارا کرلیں گے۔" وہ رسان سے بولیں۔

"ویسے بھی چند دن اور گزر جائیں تو میں نبیلہ سے بات کرکے کہیں رخصت کردوں گی۔"

"آپ پھوپھو سے خود بات کریں گی؟" وہ حیران ہوئی۔ "یہ بات تو پھوپھو کو کہنی چاہیے۔"

"ہاں بیٹا! وہ کوئی غیر تھوڑی ہے، میں بس کسی دن مناسب موقع دیکھ کر بات کروں گی۔ تم اپنے گھر کی ہوجاؤ تو میری ساری فکریں ختم ہوجائیں گی۔"

زارا نے انگلی میں پہنی انگوٹھی کو دیکھا لیکن آج دل میں کوئی ہلچل نہ ہوئی تھی وہاں خاموشی تھی بالکل ویسی خاموشی جیسی ارسلان کی طرف تھی اور ارسلان کی خاموشی سے اس کا دل بجھ گیا تھا، یہ الگ بات وہ ماں کے دل میں کوئی وسوسہ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

پچھلے دو تین دنوں سے اوپر کچھ غیر معمولی ماحول تھا۔ بازاروں کے چکر پھر اچانک اوپر رنگ وروغن شروع ہوگیا مگر وہ لوگ زیادہ حیران تو تب ہوئے، جب تائی نے لان کی صفائی کروا کر باہر سے بھی سارا گھر پینٹ کروالیا۔

نجانے یہ عورت کیا کرنے جارہی ہے۔ حسنہ کو تشویش ہوئی کیونکہ رخسانہ نے آج تک، نیچے کے حصے کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھا تھا لیکن حیرت کا اصل جھٹکا تو تب لگا جب نبیلہ پھوپھو اور ارسلان اچانک آ گئے۔

"ایمان اور سوہا کب سے کہہ رہی تھیں۔ مہمان آنے والے ہیں۔" تو ان لوگوں کا انتظار ہورہا تھا۔

"نبیلہ، یوں اچانک؟ کم از کم اطلاع ہی کر دیتیں۔" حسنہ نے کہا۔

"بس بھابھی! وقت ہی نہیں ملا اطلاع دینے کا۔ معذرت" وہ لوگ اپنائیت دکھا رہے تھے۔ نبیلہ بالخصوص زارا سے ملی تھیں۔ پیار سے گلے لگا کر ماتھا چوما، دعائیں دیں۔ زارا نے شرما کر نظریں جھکالیں کیونکہ دو اور نظروں کی تپش حدت بن کر چہرے پر رونما ہونے لگی تھی۔

ارسلان آج بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"چلیں نا پھوپھو! آپ لوگ تھک گئے ہوں گے۔" ایمان اور سوہا نے ان کا سامان سنبھالا اور اوپر چلی گئیں۔

"ابا جان کا چہلم ہے، رخسانہ بھابھی نے بالخصوص بلایا ہے تو اب ان کے ہاں ہی رکنا پڑے گا۔" پھوپھو نے جاتے ہوئے حسنہ سے کہا۔ لیکن

زارا کو یہ بات سخت بری لگی تھی۔ وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"تم فکر مت کرو۔ نبیلہ بہت سمجھ دار ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ لوگ آجائیں گے نیچے، اب انہوں نے بلا لیا تو اس طرح کیسے منع کر دیتے، ویسے بھی وہ اس کے بھائی کا گھر ہے۔"

حسنہ نے اسے سمجھایا اور پھر یہی سوچ کر اسے اور خود کو مطمئن کر لیا۔ لیکن اگلے دنوں میں جو کچھ ہوتا رہا، اس سے ان کے دل کے خدشات بڑھتے ہی گئے۔

دادا کے چہلم پر رخسانہ نے دل کھول کر خرچ کیا جیتے جی جن کو کبھی پانی کے گھونٹ تک نہ پلایا۔ اب ان کے نام پر مٹن اور بریانی کی دیگیں پکوا کر بانٹی تھیں۔ تمام اہل محلہ کو مدعو کیا گیا تھا۔

چہلم کم ولیمہ زیادہ لگ رہا تھا۔ انواع واقسام کے کھانوں، پھلوں سے مہمانوں کی تواضع کی گئی تھی۔ نبیلہ پھوپھو کو شان دار جوڑے اور سونے کی مالا دی گئی تھی کہ یہ ایک رسم ہے، بقول تائی جی کے بیٹی کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کہ اس کے بھائی سدا اس کے سر پر ہیں۔

جہاں نبیلہ پھوپھو خوش تھیں، وہیں محلے دار عورتیں رخسانہ تائی کی خوب واہ واہ کر رہی تھیں۔

زارا نے ارسلان کی آنکھوں میں کسی اور کے لیے دلچسپی اور خود سے لاتعلقی بہت پہلے ہی محسوس کر لی تھی۔ بس اب اس نام نہاد رشتے کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔ اور نبیلہ پھوپھو جس دن گئیں، بہت سہولت سے معذرت کر گئیں۔

"کیا کروں، مجبوری ہے۔"

"ارسلان سوہا میں دلچسپی لینے لگا ہے۔"

"کچھ لوگوں کو نجانے کیا ملتا ہے دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھول کر، ان کی خوشیاں نگل کر۔ رخسانہ اور ان کی لڑکیوں نے منصوبہ بندی کے تحت یہ سب کیا ہے، محض میری بچی کی خوشیاں چھیننے کے لیے اللہ انہیں غارت کرے۔"

حسنہ سخت دل برداشتہ تھیں۔ ان کا بی پی ہائی ہو چکا تھا، زارا کے تو ہاتھ پیر پھول گئے اک ماں کا تو سہارا بچا تھا۔

☆☆☆

پے در پے صدمات بالآخر حسنہ کی جان لے گئے۔ اور زارا کو لگ رہا تھا وہ کسی سخت آزمائش میں پڑ چکی ہے، زندگی ایک امتحان بن گئی تو اس نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا کیونکہ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رخسانہ اور ان کی بیٹیاں اس کی بربادی کا تماشا دیکھ کر محظوظ ہوتی رہتیں۔ زارا نے خود کو اسکول اکیڈمی اور گھر کے کاموں میں مصروف کر لیا تھا۔

دادا جان اور ماما کی یادوں سے راہ فرار کا شاید یہ واحد حل تھا مگر یہ اس کی بھول تھی۔ ان دونوں کی یادیں پرچھائیوں کی مانند اس کے ساتھ ساتھ رہتیں۔

"آپ لوگ مجھے کیوں چھوڑ گئے۔ میں تنہا ہوگئی۔ تہی داماں۔"

وہ دادا جان کے کمرے میں ان کی تصویر گلے سے لگائے ان کے بیڈ کی سائیڈ پکڑ کر نجانے کب سے بیٹھی تھی اور پھر روتے روتے کب سوئی اسے پتا ہی نہ چلا۔ پوری رات گزر گئی، آنکھ تب کھلی جب رخسانہ تائی نے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ ڈالا۔

"لڑکی! تم اوپر شفٹ ہو جاؤ۔ یہ والا پورشن میں نے کرائے پر چڑھا دیا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں کرائے دار آجائیں گے۔"

تائی نے گویا اس کے سر پر بم پھوڑا تھا، وہ گرتے گرتے سنبھلی۔ پھر منتیں، التجائیں سب کر لیا مگر تائی باز نہ آئیں۔ نیچے کا تمام سامان ایک کمرے میں اوپر نیچے رکھ کر لاک کر دیا گیا، وہ اپنی آنکھوں سے اپنے گھر کو بکھرتا دیکھتی رہی، روتی رہی۔ تڑپتی رہی لیکن سنگ دل تائی نے اسے بے گھر بھی کر دیا۔ اسے زبردستی کھینچ کر اوپر لے گئیں، وہاں اسٹور نما کمرا اس کا منتظر تھا، اس کے ساتھ آگے کیا ہونا تھا وہ

pklibrary.com

بخوبی جانتی تھی۔

☆☆☆

تائی سارا دن اسے کاموں میں الجھائے رکھتیں۔ دونوں لڑکیوں کی طنزیہ ہنسی اور کاٹ دار باتیں اس کے زخموں پر گویا نمک کا کام کرتیں لیکن اس کے لب سل چکے تھے، وہ کسے سناتی کس سے فریاد کرتی کوئی اس کا ہم نوا تھا نہ ہم درد۔

رخسانہ نے اگلا وار یہ کیا کہ رفاقت سے جھوٹی سچی باتیں لگا کر اس کا اسکول اور اکیڈمی جانا بند کروا دیا۔ گویا ایک قیدی کی طرح اسے اب ہمیشہ اس زندان میں رہنا تھا۔

ارسلان اور سوہا کی منگنی بہت دھوم دھام سے ہوئی، وہ مہمانوں کی خدمتیں کرتی لوگوں کی ترحم بھری نظروں کا نشانہ بنی رہی۔

زندگی اک سزا بن کے رہ گئی تھی، وہ تھک کے چور اپنے بستر پر گرتے ہی دادا جان اور ماں سے باتیں کرنے لگ جاتی، اس نے تخیل کی اک دنیا بسالی تھی جہاں وہ دادا جان اور ماما کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی۔

☆☆☆

"کھانے میں کیا بنانا ہے؟"

پہلے تو وہ خود ہی بتا دیا کرتی تھیں مگر آج انتظار کر کے وہ تائی کے کمرے میں پوچھنے چلی آئی تھی، جہاں تینوں ماں بیٹیاں نہ جانے کون سی منصوبہ بندی کر رہی تھیں۔ ہیٹر لگے بند کمرے میں چلغوزے، کاجو اور مونگ پھلیوں سے انصاف کر رہی تھیں۔

"آج تمہارا جو دل چاہے، بنالو۔" سوہا نے مسخرے پن سے ہنستے ہوئے کہا۔ زارا کو اس کی ہنسی میں خباثت نظر آئی۔

"آج ہم لوگ کہیں کھانے پر مدعو ہیں۔ تم اپنے لیے جو دل چاہے بنالو۔"

وہ چپ چاپ وہاں سے پلٹی مگر اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی چال چلنے جا رہی ہیں اور سچ بھی یہی تھا وہ ایک تیر سے دو شکار کرنے جا رہی تھیں۔

پھر شام برانڈڈ جوڑوں میں ملبوس پرفیومز میں رچی بسی وہ تیار ہو کر نکل گئیں۔ زارا خوش تھی کہ چلو کچھ دیر آزادی سے سانس لے سکے گی۔ وہ کھانا لے کر تائی کے کمرے میں ہیٹر لگا کر بیٹھ گئی۔ ساتھ ایل ای ڈی بھی آن کر لیا۔

اسے ٹی وی دیکھتے کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ اب ڈرامے دیکھ دیکھ کر اکتا گئی تھی۔ ٹائم دیکھا تو گیارہ بج گئے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک نہیں آئیں، اس نے جلدی سے باری باری ان کے نمبرز پر کال کی۔ مگر تینوں فون آف تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ابھی تک آئیں کیوں نہیں۔ پھر اسے اچانک لاؤنج میں کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ جھٹ باہر نکلی تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

شہباز انکل خبیث ہنسی ہنستے سامنے کھڑے تھے۔

"آپ...... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ ہمت مجتمع کر کے دھاڑی۔

"مجھے پتا چلا کہ تم آج اکیلی ہو۔" وہ قدم قدم آگے بڑھتے جا رہے تھے اور وہ قدم قدم پیچھے۔

"درست۔ میں تو محض تمہیں کمپنی دینے آیا ہوں۔" اس نے لاؤنج کا دروازہ دیکھا۔ لاک کھلا کیسے۔ سامنے والا شخص اس کے ذہن میں اٹھتا سوال سمجھ گیا۔

"بھئی تمہاری تائی مجھے یہ چابی دے گئی تھیں کہ آج ہو سکتا ہے ہم نہ آئیں تم، بچی کا خیال رکھنا۔ اکیلی ہے بے چاری۔"

زارا کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔

"جائیں۔ آپ یہاں سے جائیں۔" وہ غصے سے چلائی۔

"ناں، ناں، بڑے دنوں بعد یہ موقع ملا ہے ضائع تو ہرگز نہیں کروں گا۔" وہ خبیث ہنسی ہنسا۔

تائی نے تو اسے بتایا تھا کہ شہباز اپنے بیوی بچوں کو لے کر بیوی کے میکے گیا ہے۔ تم بے فکر

pklibrary.com

رہنا۔"

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ تائی جانتی تھیں، اس کی بیوی چند دن کے لیے میکے جا رہی ہے۔ شہباز اسے چھوڑ کر واپس آ چکا ہے تب ہی انہوں نے یہ گھناؤنا کھیل کھیلا۔

دراصل رفاقت صاحب اس بات کے سخت خلاف تھے کہ جوان بچوں کے ہوتے ہوئے گھر میں کسی کو کرایا دار رکھا جائے۔

پہلے تو رخسانہ آئیں بائیں شائیں کرتی رہیں مگر جب انہوں نے شہباز کی حرکتیں دیکھیں تو انہیں لگا کہ رفاقت کی بات مان، کر اسے گھر سے نکال دینا چاہیے مگر مسئلہ یہ تھا وہ پورے سال کا ایڈوانس اکٹھا لے کر ہڑپ کر چکی تھیں اور یہ بات شوہر سے پوشیدہ تھی۔ دوسرا یہ کہ کرایہ داری کے معاہدے پر دستخط بھی انہوں نے خود کیے تھے اب اگر وہ انہیں نکلنے کا کہتیں تو وہ ان پر کیس کر سکتے تھے۔

اس لیے رخسانہ نے بہت سوچ کر، یہ ترکیب لڑائی تھی کہ وہ گندی فطرت کا مرد ہے، جوان لڑکی کو دیکھ کر فوراً کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھے گا اور وہ بعد میں اسی بات کو بنیاد بنا کر اسے گھر سے نکال دیں گی۔ معاشرے میں گندا بھی کر دیں گی اور الٹا اس پر پولیس کیس بھی بنا دیں گی۔ رہی زارا تو اس کا کیا ہے یونہی سسکتی سسکتی مر جائے گی۔

"تم دفع ہو جاؤ۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ مگر شہباز نے لپک کر اسے کلائی سے دبوچ لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" اس نے چیختے چلاتے اسے زور کا دھکا دیا اور خود لاؤنج کے دروازے سے بھاگتی سیڑھیوں تک پہنچ گئی۔ شہباز اس کے پیچھے بھاگا مگر شیشے کی میز سے بری طرح ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔

جب تک وہ اٹھتا، وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے لاؤنج کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

"میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ بدذات لڑکی۔ میں تمہیں مزا چکھا دوں گا۔" وہ مغلظات بکتا تیزی سے اس کے پیچھے تھا مگر وہ اپنے رب کو پکارتی لان عبور کرتی گیٹ کھول کر باہر بھاگ گئی تھی۔

شہباز پیچھے بکتا جھکتا اپنا منصوبہ خاک ہونے پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

☆☆☆

کتنے دن گزر گئے تھے اس واقعے کو مگر اسے جب بھی یاد آتا جھرجھری سی آ جاتی۔ کیا لوگ نفرت میں ساری حدیں پھلانگ جاتے ہیں۔

اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی "لیکن مجھے اپنے اللہ پر یقین کامل ہے، جس نے مجھے جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیا ہے، وہ ان سے میرا حساب بھی ضرور لے گا۔"

اس رات کی اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ ایک ایسے گھر میں تھی جہاں ماں جیسی شفیق عورت باپ جیسا مہربان مرد عزت و آبرو کے محافظ تمام لوگ تھے۔

وہ پہلے تو ڈر گئی تھی یقیناً ایسا ہونا غلط نہیں تھا۔ اس رات گھر میں جو ہوا وہ کسی پر یقین کیسے کر سکتی تھی لیکن ان سب لوگوں کے رویوں، شفقت، اخلاق نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ دنیا میں آج بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔ جنہوں نے اسے اس گھر میں پناہ دی۔ احترام دیا۔ عزت دی۔ اسے سہارا دیا بلکہ اسے اس گھر کی مالکن تک بنا دیا۔ قدرت بھی کیا رنگ دکھاتی ہے کہ وہ لوگ کئی برسوں پہلے ان ہی کے محلے میں رہا کرتے تھے۔ جب دادا جان ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ اس زمانے میں وقار کے والد مرحوم کا ایک کام جو اس محکمہ میں اٹکا ہوا تھا۔ دادا جان کی وجہ سے ہوا تھا اور تب سے ہی وہ ان کے احسان مند تھے۔ پھر اوپر والے کی کرم نوازی سے ان کا بزنس اس قدر پھیلا جو انہیں ایک نئے پوش علاقے میں لے آیا۔

وقار کی پہلی بیوی کا شادی کے چند مہینے بعد ہی ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا تھا ایک طویل عرصے وہ اپنی بیوی کے غم میں ڈوبے رہے تھے وہ تو آسیہ خالہ کا جی تھا کہ ان کی دوسری شادی کے لیے جتی رہیں۔ اب تو ان کی کنپٹیوں کے بال بھی سفید ہو رہے تھے لیکن آسیہ خالہ نے ہمت نہ ہاری لیکن وقار کا معیار آسیہ خالہ بالکان

ہوئے جاتیں ایسے میں اچانک ہی زارا بہار کی مانند ان کی زندگیوں میں داخل ہوئی۔

آج وہ مسز وقار حیدر تھی وقار انڈسٹریز کے مالک کی بیوی۔

"میرے اللہ نے مجھے بہتر سے بہترین دیا ہے۔" وہ بہت خوش تھی، ایسا گھر تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، اتنی عزت اتنا مقام کاش اس کے اپنے آج زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔

☆☆☆

مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کچھ لوگ سائے کی طرح آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے جب اسے لگا کہ وہ اپنا بھیانک ماضی بالکل بھول چکی ہے۔ وقار کی سنگت نے اس کے دل پر لگا ہر زخم ختم کر دیا ہے اس کا ماضی اپنی کریہہ صورت کے ساتھ اک بار پھر سامنے آ گیا تھا۔ لیکن اس بار وہ ڈٹ گئی تھی، اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ اس بار ان لوگوں کا کوئی داؤ نہیں چلنے دے گی۔ اس نے وقار کو سب کچھ اور صاف صاف بتا دیا تھا۔

ہوا کچھ اس طرح تھا کہ پرسوں ان لوگوں کو حمدان کے لیے لڑکی دیکھنے بلکہ رشتہ پکا کرنے جانا تھا کیونکہ لڑکی تو حمدان نے پسند کر لی تھی، زارا کی طبیعت اچانک کافی خراب ہو گئی، ایسے میں اسے گھر رکنا پڑا۔ وقار، آسیہ خالہ حمدان کے ساتھ جا کر رشتہ دے آئے تھے اب لڑکی والوں نے آنا تھا۔ جب زارا نے لڑکی کی تصویر دیکھی تو وہ بوکھلا کر رہ گئی۔

کیا پھر سے اک نیا امتحان شروع ہونے والا ہے؟ پہلے تو وہ سخت پریشان ہوئی لیکن پھر ہمت کر کے شوہر کو بتا دیا۔ کہ یہ اس کی تایا زاد ہے۔ وقار حیدر کو بھی دھچکا لگا تھا، کاش رشتہ دینے سے پہلے تمام تحقیقات کروائی جاتیں۔

لیکن پھر بھی انہوں نے زارا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ حمدان کو سمجھا کر قائل کر لیں گے اور ان لوگوں سے معذرت کر لیں گے لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ حمدان پہلے تو ساری بات تحمل سے سنتا رہا لیکن پھر ضد پکڑ لی کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا۔

سب لوگ کشمکش و پیچ میں پڑ چکے تھے۔ جس بھائی کو باپ کا درجہ دے کر اس کی مانا حمدان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آج اس بھائی کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ گھر میں اک سرد جنگ شروع ہو چکی تھی۔ سب لوگ اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ لڑکی یہاں آنے کے بعد کیا رنگ دکھائے گی۔

وقار کو لگتا تھا کہ یہ بیرسٹر حمدان تو نہیں جس کی تعلیم و تربیت، انداز و اطوار کی لوگ مثالیں دیتے ہیں، وہ تن فن کرتا آتا اور اسی طرح چلا جاتا۔ بہر حال کچھ ہی دنوں میں وقار نے فیصلہ کر لیا کہ حمدان کو حق ہے، وہ اپنی مرضی سے شادی کرے مگر شادی کر کے وہ اس لڑکی کو اس گھر میں نہیں لائے گا اور اس لڑکی کا اس گھر کے مکینوں سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

حمدان نے بخوشی سب کو چھوڑ کر اسے اپنانے کا فیصلہ قبول کیا تھا۔ آناً فاناً سب معاملات طے ہوتے گئے۔ زارا نے ہر معاملے سے خود کو دور رکھا۔

"میں ہر دم تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ لڑکی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

وقار اس کی پریشانی دیکھ کر سمجھانے لگا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ کس قدر زہریلی عورتیں ہیں۔

زارا کو یقین تھا کہ سوہا، جیسی خود غرض اور چال باز لڑکی نے یقیناً ارسلان کو صرف حمدان کے پیسے کی وجہ سے چھوڑا ہوگا لیکن اب بے وقوفی تو حمدان کی تھی۔ جو ایک کمزور کردار کی لڑکی کی خاطر گھر والوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

مہندی کی رات کو نکاح کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ وقار نے رشتہ داروں اور اپنے دوستوں کو مدعو نہیں کیا تھا، گھر میں اک عجیب ماحول چل رہا تھا۔

حمدان نے ضد باندھ لی تھی کہ نکاح کے لیے بھابھی کا ساتھ جانا بہت ضروری ہے جب کہ زارا جیتے جی اس گھر کی دہلیز پار نہیں کرنا چاہتی تھی جس گھر کے

مکینوں نے اس سے سب کچھ چھین کر ننگے سر، ننگے پاؤں آدھی رات کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔

آسیہ خالہ، فیض چاچا اور وقار زارا کو سمجھا رہے تھے، بالآخر زارا کو ہار ماننا پڑی۔

برقی قمقموں اور رنگ برنگی روشنیوں سے سجا گھر جس میں انسانوں کے روپ میں اژدھے بستے تھے زارا کو لگا اس گھر کے در و دیوار جیسے اس کے منتظر تھے۔ ان گنت یادیں اس کے سامنے رقصاں ہوگئی تھیں۔ سوہا دلہن بنی بیٹھی تھی جبکہ ایمان ماں کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ وہ سب کے پیچھے پیچھے تھی۔

"بھابھی! آپ آگے تشریف لائیے کہ آج آپ کی میرے سسرالیوں سے پہلی ملاقات ہے۔" حمدان کی بات پر وہ متذبذب ہوگئی مگر وقار نے اسے اشارے سے آگے آنے کا کہا تو وہ دھیرے سے چلتی وقار کے برابر آ کر کھڑی ہوگئی۔

رخسانہ اور ایمان کو اچنبھا سا ہوا دلہن بنی سوہا نے بھی چونک کر دیکھا۔

"آپ اپنا ماسک اتار دیں بھابھی! میرے سسرال سے آپ کا پردہ تو نہیں۔"

حمدان کی اس بات پر وقار کا خون کھول اٹھا، یہ لڑکا بھی عجیب احمقانہ حرکتیں کر رہا تھا۔ مگر زارا نے بہت اعتماد سے ماسک اتار دیا۔

حقیقت کا ڈٹ کر سامنا کرنا تھا اسے، دونوں ماں بیٹی کا چہرہ فق ہوگیا۔ دلہن بنی سوہا کرنٹ کھا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ میری بھابھی ہیں مسز زارا وقار، حیدر وقار انڈسٹریز کے مالک کی بیوی۔

آپ لوگ جانتے ہیں کیا انہیں؟" ان کی حیرت پر حمدان نے عجیب سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

کچھ پل وہ خاموشی سے اک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

"نہیں نہیں بیٹا، ہم تو نہیں جانتے۔" رخسانہ نے سوچا کہ سارے راز پوشیدہ ہی رہیں تو اچھا ہے۔

زارا ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی ان کے پاؤں تلے سے زمین سرکا چکی تھی۔

"مگر میں جانتا ہوں" حمدان نے دھاڑ کر کہا۔

"یہ وہ لڑکی ہے جس سے اس گھر کی چھت چھین کر اسے بے گھر، بے در کیا تھا آپ لوگوں نے، پھر اس سے ایک ایک کر کے تمام رشتے تک چھین لیے آپ نے۔ اور سوہا تم! اس سے اس کی خوشیاں چھیننے کے لیے تم نے پہلے اپنی اداؤں سے، چالاکیوں سے ارسلان کو پاگل بنایا اسی گھر میں اسی اسٹیج پر تم نے ارسلان کے ساتھ منگنی کا ڈرامہ رچایا تھا، پھر پیسے کے لالچ میں اسے چھوڑ کر مجھے اسیر کرنا چاہا۔" سارے مہمان آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔

"یہ جھوٹی ہے، یہ تو خود گھر سے بھاگی تھی۔"

"شٹ اپ۔" رخسانہ کی بکواس پر دونوں بھائی یک زبان دھاڑے۔ "اس رات جب اس لڑکی کے لیے تم نے ذلت کا جال بچھایا تھا، اللہ اسے وہاں سے نکال لایا۔ اپنی عزت بچانے کے لیے ننگے سر ننگے پاؤں اندھا دھند بھاگتی اس رات یہ میری گاڑی سے ٹکرائی تھی اور آج یہ ہمارے گھر کی عزت اور بڑی بہو ہونے کا شرف حاصل کر چکی ہے۔"

زارا کی آنکھوں سے اک ساتھ کئی آنسو گرے یہ آنسو شکر کے تھے، خوشی کے تھے کہ اس ظالم معاشرے میں ابھی بھی ہم درد و خیر خواہ موجود ہیں۔

حمدان نے نکاح خواں کو یہ کہہ کر واپس بھجوا دیا تھا کہ میں یہاں نکاح کرنے نہیں بلکہ کچھ حساب بے باق کرنے آیا ہوں۔

"اب آپ سے اگلی ملاقات عدالت میں ہوگی۔" رخسانہ کے قریب ہو کر کہتے وہ وہاں رکی نہیں۔

"ظلم کی انتہا کے بعد پکڑ ہونا لازم ہے۔"

جو کانٹے انہوں نے اس کے راستے میں بچھائے تھے، آج اپنے ہاتھوں سے چننے پڑ گئے تھے۔

☆☆

شازیہ الطاف ہاشمی

ترس

"وفا آپا، یہ آپ کے لیے۔"

زاہدہ نے ایک شاپنگ بیگ ان کے پاس لا کر رکھا تھا جسے انہوں نے اداس نظروں سے دیکھا اور پھر زاہدہ کو دیکھنے لگیں، ایسے جیسے اب تحفے تحائف سے انہیں کیا مطلب زندگی کتنی کم تھی۔ اتنی جلدی ختم ہو گئی۔ بہت جلدی کی اس نے جانے میں مگر زاہدہ کا دل، اف زاہدہ کا زاہد دل۔

"وفا آپا! آپ یہ پرانے پرانے کپڑے نہ پہنا کریں کسی کے جانے سے زندگی ختم تھوڑی ہو جاتی ہے، آپ زندہ ہیں زندہ لوگوں کو زندہ رہنا چاہیے۔"

زاہدہ کا دل اس دیوار پار بیوہ سے ہمیشہ ہمدردی کرتا تھا۔ کتنا مشکل ہے جینا، زندگی مشکل کا نام ہے، زاہدہ کا خیال تھا شکیل اس کا ماموں زاد بھائی اگر وفا سے نکاح کر لیں۔ مگر شکیل بھائی خاموش تھے بالکل بے تاثر، ان کا ارادہ نہیں تھا بچے بڑے ہو گئے تھے اور شاید ان میں کسی اور کی گنجائش نہیں تھی، دوسری

pklibrary.com

طرف وفا آپا بھابی کے اتنے بڑے گھر میں ذرا سی جگہ بھی نہ پاسکیں، انہیں دیکھ کر زاہدہ کا دل کانپ اٹھتا تھا، ان کا چہرہ یا شاید زاہدہ ہی حد سے زیادہ حساس تھی کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔ عجب اندھیرا تھا کہ صبح کی کوئی امید نہ تھی ایک وقت میں انہیں خوب صورت دیکھا تھا انہیں زندگی جیتے دیکھا۔ زندگی سے جیتے دیکھا تھا وہ کبھی ہاری نہیں تھیں مگر آج۔

غم کی تشریح بہت مشکل تھی
اپنی تصویر دکھا دی ہم نے

☆☆☆

اس شام بھی وہ کمال کے آفس سے لوٹنے کے بعد وفا ہی کی بات کر رہی تھی۔

"وفا بہت دکھی ہے۔"

کمال نے بے دلی سے ان سنی کر دی۔

"کمال! آپ دل سے بھی کبھی سوچ لیا کریں بزنس مین کی طرح کی سوچ، انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی ہم گوشت پوست کے بنے نازک انسان ہیں تو روئیے، پھر کیوں ہیں۔"

کمال نے کمال مہربانی سے اتنی بات سن لی تھی اور اب شاید، اس کے چپ ہونے کا انتظار کر رہا تھا وہ جو مر گیا تھا وہ وفا کی محبت تھا وہ اسے اپنے دل سے کیسے نکالتیں۔ مگر جب دل سے کوئی انسان نکل جاتا تو موت کا مسافر ہو جاتا ہے اور مردے قیامت کے دن ہی زندہ ہوں گے۔

کمال کو زاہدہ سے محبت تھی، اس لیے اس کی حساسیت بھی برداشت تھی ورنہ کون کسی کو چاہتا ہے کیا صرف وہی چاہتا ہے جو مفاد میں ہو۔ دل جیسے بے کار لوتھڑے کی کیا پروا مگر اس کی ہلکی ہلکی آہیں بڑی مضبوط ہوتی ہیں ہواؤں، میں گم نہیں ہوتیں کسی کو "آہ" لگ جائے تو کھا جاتی ہے آگ کی طرح۔ زاہدہ سوچ رہی تھی کہ وہ وفا آپا کو ہر وقت ساتھ تو رکھ نہیں سکتی کیونکہ کمال کو برا لگے گا پھر اس مسئلے کا کیا حل ہو؟

کمال کو راضی کرنے جیسا کمال وہ کر نہیں سکتی تھی۔ شاپنگ مالز، ریسٹورنٹ، لونگ ڈرائیو، تنہائی، محبت اور ہر جگہ وفا آپا کے آنسو اس کے ساتھ ساتھ رہتے وہ اکیلی نہیں رہی۔ کبھی احساس ہی تو انسان کو انسان بناتا ہے، سچا انسان جھوٹ موٹ کے آنسو اور ہمدردی بڑے شیطان تراشتی ہے۔

انس زاہدہ کا اکلوتا بھائی زاہدہ سے ملنے آیا تھا۔ بچپن کی محبت تھی اکلوتے بھائی سے جو بچپن میں بھی داخل ہو کر بچہ ہی رہتی ہے۔

"اے کتنے دن لگا دیے۔"

زاہدہ نے سال بھر چھوٹے بھائی کو گلے لگا کر کہا۔

"بس یار! اسٹڈیز کا برڈن ہی بہت ہے۔"

وہ انس کے لیے کافی پھینٹ رہی تھی، ساتھ ایک پگلا آنسو چپکے سے کچن کاؤنٹر پر گر گیا تھا۔ وفا کی بڑی بھابی شائستہ نے ناشائستگی سے وفا کو بتایا تھا کہ۔

"وفا ان کے کمروں میں جھاڑتی ہے۔"

وفا بے شرم نہیں ہو سکتی اس طرح کی تو بالکل نہیں وہ تو مظلوم ہے ظالم کیسے ہو سکتی ہے۔

کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اچانک سامنے سے اس نے وفا کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، ادھیڑ عمر کی وفا ادھ جلی سی بھاگتی آ رہی تھیں انس کے ہاتھوں سے کافی چھلک گئی تھی۔ وہ وہیں آ کر ان دونوں کے درمیان مدد کی تلاش میں گر گئی تھیں۔

"بھابی شاہانہ نے مجھے زندہ جلانے کی کوشش کی۔"

ان کا دوپٹہ اور قمیض جلی ہوئی تھی۔ شاید وہ کچن میں کام کر رہی ہوں تب کسی نے جان چھڑوانا چاہی ہو۔

تب اس نے انس کو ایک ایک بات بتائی۔ انس پریشان ہو گیا تھا کتنے دنوں بعد ملے تھے اور پل بھر کا، ساتھ وفا آپا کی نذر ہوا، انس کئی دن گھر نہیں گیا پریشان بھی رہا۔

زاہدہ وفا کو گھر چھوڑ کر آئی تھی، ان کی بھابیوں نے قسمیں اٹھا کر کہا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا، مگر زاہدہ ان کے جھوٹ آسانی سے پکڑ چکی تھی اسے

یقین نہیں آیا۔
فریبی عورتیں فریب کرتی ہیں بے پروا ہو کر مگر کوئی ہے جو چپ چاپ دیکھتا ہے ہر تماشہ۔
پچاس سے اوپر کی عورت جھوٹ کیوں بولے گی اتنے کھاتے پیتے لوگوں کا اتنا چھوٹا دل۔
انس کو کافی دن ہو گئے تھے وہ نہیں گیا۔ وفا کی بھابیوں کا رویہ بھی ان سے بہتر ہو گیا تھا، اب روتی نہیں تھیں بلکہ کچھ سوچتی رہتی تھیں زاہدہ کی تسلیاں اب وہ سنتی تھیں مگر دھیان سے نہیں۔
''زہے نصیب۔'' انس زاہدہ کو پیار سے زہے نصیب کہتا تھا۔
''تم کہو تو میں نکاح کرلوں وفا سے وہ مجھے اچھی لگتی ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ۔'' زاہدہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
تیس برس کا شوخا انس، نکاح کی فرمائش کر رہا تھا وہ بھی وفا سے۔ وہ سکتے میں آ گئی تھی۔
''وفا سنیں گی تو۔'' اس نے اپنی گھٹی گھٹی سی آواز سنی جس میں نجانے کیا تھا مرا ہوا اعتبار یا شاید بے یقینی کی لاش۔
''تم اس کی ٹینشن نہ لو وہ راضی ہیں بس مما سے بات کرلو تو بات بن سکتی ہے۔''
اسے لگا جیسے گرم گرم سیسہ کسی نے اس کے کانوں میں انڈیل دیا۔
''مجھے اس سے آگے کچھ مت کہنا انس! آگے ایک لفظ نہیں۔''
''وہ خوب صورت ہے اچھی ہے۔''
''مما! آپ انس کو فوراً واپس بلالیں۔'' اس نے انہیں کچھ نہیں بتایا البتہ انس ناراض ہو گیا تھا اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔
وہ وفا کی طرف سے مشکوک ہو گئی تھی مگر اب وہ نہیں وفا رابطے میں رہنے لگی تھیں اکثر آنا جانا رہنے لگا تھا مگر زاہدہ نے دوبارہ انس کو نہیں بلایا تھا کبھی کبھی ترس بھی آنے لگتا کہ اس کا دل نہیں ہے، اس میں خوش رہنے کی خواہش نہیں ہے مگر اب ڈر بھی لگتا تھا۔

ایک شام اسے مما کے گھر سے دیر ہو گئی تھی کمال گھر پر ہی تھے بس اس نے ہی جلدی کر دی تھی گھر لوٹنے میں، ملکیت کے احساس سے وہ آگے بڑھی مگر بڑھ نہ سکی تھی اس کے جہازی سائز بیڈ پر کوئی بڑے حق سے پشت کیے بیٹھا تھا۔ بالوں سے اس نے پہچانا کہ وفا ہی تھی کمال کے ساتھ۔

تمام عمر تیرا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

وہ دبے قدموں لوٹ گئی تھی مگر کمال نے بھی شیر بن کر کہا تھا کہ۔
''نکاح کرنا چاہتا ہوں تو کیا برا ہے مظلوم ہے۔'' کبھی کبھی چپ رہنا ہمارے حق میں بہتر رہتا ہے وہ پھر کال کر کے ٹوٹی تھی۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا نہ ہی اس نے شور مچایا تھا۔
''وفا کیسی ہے زاہدہ۔'' کمال سرسری سا پوچھ رہے تھے کہ جانچ رہے تھے۔

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں

تب اس نے انس والی بات بتائی تو پھیکا سا ہنس پڑے تھے، شاید دل ٹوٹا ہو مگر اس دل کا ٹوٹ جانا ہی اچھا تھا ہر دل خوش کرنے کے لائق تھوڑی ہوتا ہے نہ ہی ہر ایک سے محبت کرنی چاہیے۔
کمال کے جانے کے بعد اس نے دور سے دیکھا تھا کہ وفا چست سا لباس پہنے نجانے کس کی تلاش میں وہاں آ نکلی تھی، غم بھی کسی کسی کو ہی راس آتا ہے، سنوارتا ہے اکثریت تو وفا کی طرح سے ہو جاتی ہے ہر کسی کو کاٹنے کے لیے تیار۔ آج زاہدہ نے اسے غور سے دیکھا تھا، مظلوم سے زیادہ ظالم بہت ظالم مگر کہا کچھ نہیں، کبھی کبھی مرزا غالب کی طرح کچھ کہنا بے کار ہوتا ہے وہ انجان بن گئی تھی کیونکہ بہتر بھی یہی تھا۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

☆☆

سونیا ربانی

دینو موچی کی سامرہ

پتا ہے دنیا کا سب سے مشکل کام کیا ہے؟

میں بچپن میں اپنے نانا سے پوچھتی تو وہ کہتے تھے کہ کسی اپنے کو قبر میں اتار کر مٹی ڈالنا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جوان بیٹی کو قبر میں اتار کر مٹی ڈالی تھی ان کی زندگی کا یہی مشکل کام تھا۔ مگر میرے لیے جو کام مشکل بن کر میرے سامنے کھڑا ہوا، وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

اپنے حصے میں آئی محبت پہ گھر کا دروازہ، دل کا دروازہ انسان اپنے ہاتھوں سے بند کردے۔

میں نے یہ مشکل کام کیا، میں دینو موچی کی بیٹی سامرہ نہیں بن سکتی تھی مجھے دینو موچی کی بیٹی سامرہ سے نفرت نہ تھی تو محبت بھی نہ تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے کچھ نہ تھا۔ مجھے اس کی طرح داستان یا پھر کہانی نہیں بننا تھی۔ مجھے عزت سے زندگی سر کرنی تھی۔ مجھے ساری عمر بے نام نہیں رہنا تھا اور اسی عزت اور نام کو پانے کی خاطر میں نے اس کی ایک نہ سنی۔

اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے، واسطے دیے وعدے کیے کہ ساری عمر، میرے ساتھ دینو موچی کے چھوٹے سے مکان میں وہ رہ لے گا۔ وہ روتا رہا۔

ہاں وہ چوہدری میرے سامنے روتا رہا۔ مگر میں نے نہ اسی کی سنی اور نہ اپنے دل کی۔

میں نے اسے گھر والوں کے ساتھ آنے کا کہا تھا۔ مگر وہ گھر چھوڑ کر آ گیا۔ بالکل میرے باپ کی طرح۔

اور وہ چاہتا تھا کہ میں بھی بالکل اپنی ماں کی طرح اسے قبول کرلوں، مگر میرے نانا نے صرف نام سامرہ رکھ دیا تھا۔ میں وہ سامرہ نہ تھی۔ میں نے اس پہ دروازہ بند کر دیا۔

اور اپنے دل کو بھی اس کے ساتھ باہر تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے خاندان کا بڑا بیٹا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔

وہ لوٹ جائے گا اور سب اسے گلے لگالیں گے۔ مگر میرا کوئی خاندان نہ تھا۔ میں وہاں سے نکالی جاتی تو کہاں جاتی۔ یوں زندگی کا سب سے مشکل کام کردیا۔

شہزادے جیسے آن بان رکھنے والے چوہدری معان کو زندگی سے نکال دیا خود کو اس سے جدا کرلیا۔

☆☆☆

"نانا! میں نے زندگی میں کچھ نہیں مانگا ناں صرف مجھے یہ بتادو کہ میرے خاندان میں کون کون تھا؟ میرے ابا کی قبر کدھر ہے؟ میں ایک بار ابا کی قبر پہ جانا چاہتی ہوں۔"

ہم قبرستان آئے تھے۔ نانا آخری بار اپنی بیٹی کی قبر پہ اور میں آخری بار اپنی ماں کی قبر پہ۔

پرسوں ہم یہ شہر چھوڑ کر بہت دور جارہے تھے۔

"سامو! مجھے نہیں پتا کہ تیرے ابا کی قبر کدھر ہے؟ مجھے کسی کا نام نہیں معلوم۔ کتنی بار بتا چکا ہوں تو کیوں نہیں سمجھ جاتی۔" نانا نے ہمیشہ والا جواب دیا۔

"یہ دیکھ ناں ماں کی قبر پہ تیرے ابے کا نام کیوں نہیں لکھا؟" میں نے نا سمجھی سے نانا کو دیکھا۔

pklibrary.com

"کیونکہ تیرے تایا نے اسپتال میں بھابھی کی لاش کو بھی نفرت سے دیکھا تھا۔ اتنی نفرت سے کہ میرا دل ڈر گیا پھر وہ بولا تھا کہ میں اپنے بھائی کی لاش لے جارہا ہوں۔

شکر کرو بابے، تیرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ ورنہ تم کو وہ سارے اپنی بیٹی کے ساتھ ہی دفن کرنے پڑتے۔ اور اپنی بیٹی کا اعلان اپنے نام سے کروانا۔ بھول کر بھی میرے بھائی کے نام کو ساتھ نہ جوڑنا۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ تجھ کو اور تیری نانی کو لے کر یہاں آ گیا۔ شہر کے بالکل دوسرے کونے تاکہ تجھ کو اس خاندان سے بچا سکوں۔"

ہمیشہ کی طرح نانا کی آنکھیں نم تھی۔ کیونکہ نانا کو پچھتاوا تھا۔ وہ میرے ابا کی باتوں میں آ گئے تھے کہ ایک بار شادی ہو گئی تو سب مان جائیں گے مگر کوئی نہ مانا۔ انہوں نے ابا کو گھر سے نکال دیا۔ اور امال، ابا کو لے کر واپس نانا کے دروازے پر چلی آئی۔ دو دن دو سال ساتھ رہے تھے پھر ایک دن امال کی طبیعت خراب تھی ابا اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے مجھے نانا نانی نے اپنے پاس رکھ لیا۔ ڈاکٹر سے واپسی پر ٹرک کراس کرتے ہوئے تیز رفتار ٹرک نے دونوں کو کچل دیا۔ مردہ بھائی کی لاش کو وہ لوگ لے گئے۔ پیچھے بے نام سامرہ کو دینو موچی نے دفن کر دیا۔ اللہ جانے میرا نام کیا تھا مگر اپنی سامرہ مر گئی تو مجھے سامرہ بنا دیا۔ سرکاری اسکول سے میٹرک تک پڑھا دیا۔ خود چھوٹی سی اپنی دکان ڈال لی۔ جوتیاں ٹھیک کرنے کی۔

نانی جب تک زندہ تھیں مجھے باہر نہ نکلنے دیا مگر نانی کے بعد مجھے باہر جانا پڑ جاتا۔ نانا کو روٹی دینے۔ دکان سے کوئی چیز لینے اور ایسے ہی ایک دن سعان چوہدری کی مجھ پر نظر پڑی، نانا کہتا تھا کہ سامو تیری یہ آنکھیں بالکل میری سامرہ جیسی ہیں اور اس دن وہ بھی میری سامرہ جیسی ان آنکھوں میں ڈوب گیا۔

پورا ہفتہ وہ اس سڑک کے چکر لگاتا اور ہفتہ بعد وہ مجھے دوبارہ، نانا کی دکان پر دیکھنے میں کامیاب ہوا

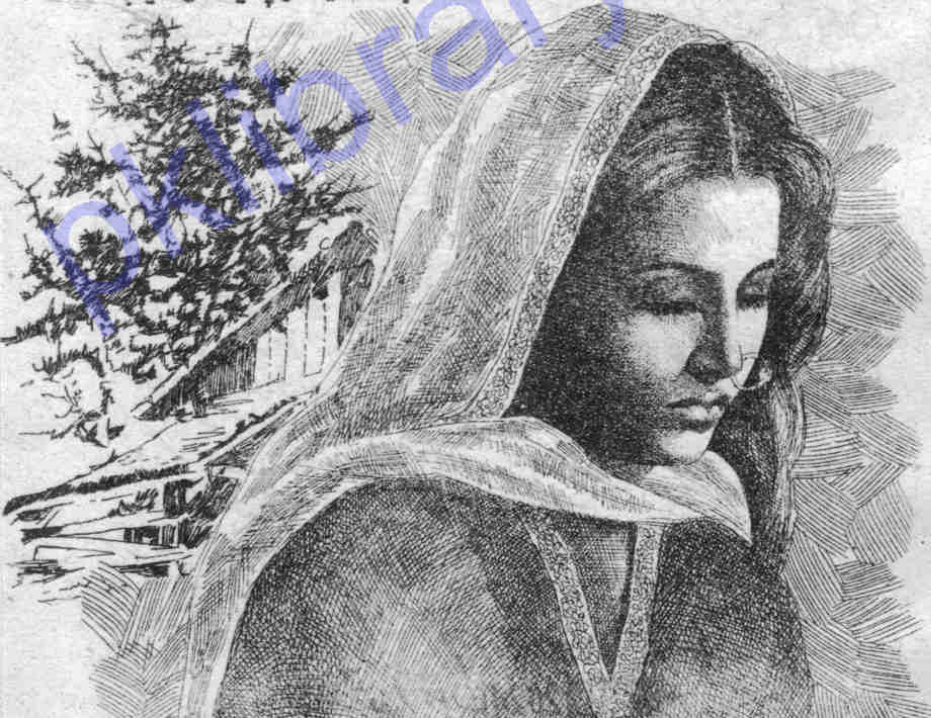

pklibrary.com

اور پھر وہاں سے گھر کا پتا لگایا۔ پھر ایک بار نانا کو اسپتال لے کر گیا۔ واپسی پہ گھر چھوڑنے آیا یوں وہ محبت کا سوالی بنا اور میں نے اس کا دامن محبت سے بھر دیا، پھر جب بات اس کے گھر تک گئی تو اس نے سب چھوڑ دیا۔ میری خاطر اپنے ماں باپ، گھر خاندان سب کچھ چھوڑ کر وہ بھی دینو موچی کے در پہ چلا آیا۔ مگر میں سامرہ نہ بن سکی، اسے خالی ہاتھ خالی دامن لوٹا دیا اور اب اس کے شہر سے دور جا رہی تھی ہمیشہ کے لیے۔ ☆☆☆

"وصی! بات سنو!"

وصی جو سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میری بات سن کر برا سا منہ بنایا، پھر بولا۔

"مجھے پتا ہے کہ تم نے کیا کہنا ہے، یہی ناں کہ تم آج بہت خوش ہو تمہارے دل میں ٹھنڈک اتر گئی ان کے گلے لگ کر اور تمہیں خوشی سے نیند نہیں آ رہی ہے۔" میرے بولنے سے پہلے ہی وہ شروع ہو گیا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے ساری رات ہی نیند نہیں آئی۔"

مگر سامرہ بی بی! مجھ پہ رحم کرو، سارا دن پہلے اسکول میں ایک ٹانگ پہ کھڑا رہا۔ پھر چار گھروں میں جا کر ٹیوشن پڑھائی۔

گھر آیا تو پانی بند تھا۔ پھر اتنی دور سے پانی لا کر دیا۔ اب تھک چکا ہوں سخت نیند آئی ہے مجھے سونے دو پلیز۔"

وصی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ تو مجھے سچ مچ ترس آ گیا۔ "ٹھیک ہے سو جاؤ تم!"

اور دس منٹ میں ہی وہ بے خبر سو بھی گیا مگر نیند آج میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے میرے اپنے مل گئے تھے مجھے میرا خاندان مل گیا تھا۔

اور زندگی میں پہلی بار مجھے لگا تھا کہ اللہ نے میری محبت کی قربانی قبول کر لی ہے۔ گیارہ برس بیت گئے تھے، مجھے وہ شہر وہ گلیاں چھوڑے۔ مگر کوئی لمحہ ایسا نہ تھا۔ جب اس کی آنسو بھری آنکھوں نے دل پہ دستک نہ دی۔

عزت والی زندگی گزار رہی تھی تو سال پہلے نانا نے وصی سے شادی کر دی تھی۔ وصی بہت اچھا بہت خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اسکول میں پڑھاتا تھا۔ نوکری پکی تھی اور پیسے بھی کم ہی ملتے تھے اوپر سے گھر بھی کرائے کا تھا۔ تو یوں گھر میں پڑھا کر کرائے کے پیسے نکال لیتا تھا مگر میرا بہت خیال رکھتا کبھی غصہ نہ کیا۔ باہر کے کام کبھی مجھے کرنے کو نہ کہا اگر کبھی پانی بند ہو جاتا تو خود بھر کر لاتا۔ مجھے باہر نہ جانے دیتا۔

اللہ نے دو پیارے سے بیٹے بھی دیے، بالکل جیسی سوچی تھی، جس زندگی کے لیے قربانی دی تھی ویسی زندگی مگر مجھے کبھی نہ سکون محسوس ہوا تو نہ اپنے فیصلے پر فخر محسوس ہوا۔

لیکن آج جب شام چار بجے وصی کے ساتھ ایک انجان شخص کو اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ تو دل عجیب انداز سے دھڑکا اور جب وصی نے ان سے کہا۔ "یہ ہے سامرہ میری بیوی دینو بابا کی نواسی۔"

تو وہ آگے بڑھے، پھر اپنی بانہوں کو کھول کر کھڑے ہو گئے۔ اور مجھے لگا کہ میرے ابا زندہ ہوتے تو بالکل ایسے ہی ہوتے، میں بھی آگے بڑھ کر ان کی کھلی بانہوں میں سما گئی۔ اور ان کے سینے سے لگ کر جو ٹھنڈک دل میں اتری ساری عمر میں اس کو ترسی تھی۔ انہوں نے میرا سر پکڑ کر پیار کیا تب وصی نے مجھے بتایا یہ خود کو تمہارے تایا بتا رہے ہیں پھر تایا نے مجھے دیکھ کر اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی اور بولے۔

"یہ مجھے کہاں پہچان سکتی ہے اس نے نہ مجھے دیکھا نہ اپنے باپ کو، مگر اس کی صورت دیکھ کر میرے بھائی کی شہزادوں والی صورت آنکھوں کے سامنے آ گئی ہے۔ یہ میرے بھائی، میرے ہارون کی نشانی ہے۔ کیسی بدقسمتی ہے کہ اتنے سالوں سے ہم بے خبر تھے۔ ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ہمارے ہارون کی کوئی اولاد بھی ہے۔ میری بچی اپنے تایا کو معاف کر دینا تم ہمارے خاندان کا حصہ ہو اور یوں کرائے پہ رہ رہی ہو۔ تم ابھی چلو ہمارے ساتھ اتنی بڑی حویلی

ہے اپنی وہاں چل کر رہو۔ اپنے باپ کی حویلی میں جہاں وہ رہتا تھا۔"

بڑی مشکل سے ہم نے ایک دو دن کا ٹائم لیا تھا کہ کل ہم آئیں گے۔ اور اب وصی تو سو بھی گیا۔ مگر آدھی رات بیت گئی اور پہلی بار مجھے لگ رہا تھا کہ دل کو جب صبح کا شدت سے انتظار ہو تب بھی وقت رک جایا کرتا ہے۔

میرے لیے بھی رات رک گئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر اپنے ابا کی حویلی چلی جاؤں مگر ابھی رات باقی تھی۔

☆☆☆

اور اب یہاں آکر یوں لگ رہا تھا۔

کہ جیسے زندگی سے کوئی گلہ باقی نہیں رہا ہے۔

یہ میرے باپ کا گھر تھا۔ گھر کیا تھا۔ کوئی خواب نگر تھا۔

ساری عمر کرائے کے گھر میں گزارنے کے بعد مجھے میرے خاندان، نام اور عزت کے ساتھ گھر بھی مل گیا تھا۔ حویلی میں قدم رکھا تو جیسے میرے چاروں طرف تتلیاں سی اڑنے لگی تھیں۔

یہاں میرے ابا رہتے تھے۔ یہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ اور یہیں پہ وہ آخری بار لا کر رکھے گئے تھے۔

میری آنکھیں بار بار بھر آتی تھیں میں نے کب سوچا تھا کہ اللہ مجھے یوں اپنی چھت بھی عطا کردے گا اور ساتھ سب اپنے رشتے بھی۔ نانا جان دنیا سے جانے سے پہلے خود تایا کو خط لکھ کر وہ بات بتا گئے جس کو خود ہی چھپایا تھا تاکہ ان کی نواسی ان کے بعد بے آسرا نہ رہے۔ تایا نے سب گھر والوں سے ہمیں بڑے پیار سے ملایا۔

مگر دروازے سے، چوہدری معان کو داخل ہوتے دیکھ کر مجھے لگا کہ حویلی کی بھاری چھت مجھ پر آکر گر گئی ہے۔

اور سامنے کھڑے معان کی آنکھوں میں کیا نہ تھا۔ بے یقینی، حیرانی یوں جیسے انسان خواب میں ہو۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے سب کچھ سوچا تھا۔ مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں دوبارہ مجھے کبھی معان کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ وہ بھی ایسے کہ صوفے پہ میرے ساتھ وصی بیٹھا تھا۔

مجھے سچ مچ خوف آیا کہ نہ جانے وہ کیا کہہ دے۔

مگر جب میری نظر دوبارہ اس پہ پڑی تو وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بالکل اجنبی، انجان بن کر یوں کہ جیسے سب کی طرح وہ بھی آج ہی ملا ہو مجھ سے۔ مگر میرے دل کو جو بے چینی ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے دو پل یہاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی شکوے بھری آنکھوں نے مجھے اٹھنے پہ مجبور کر دیا۔

مگر تایا ہمیں اپنی حویلی دکھانے لگے اور معان کو جیسے ہی وہ لمحہ ملا کہ جب، وصی تایا کے ساتھ کچھ دور گیا تو وہ میرے بیٹے کو اٹھاتے میرے قریب آیا۔

اور بولا۔

"مجھے یقین ہے سامرہ، تم یہ کبھی نہیں کرو گی میرے ساتھ۔ میں تمہاری دی ہوئی سزا کاٹ تو رہا ہوں پھر تم کیسے مجھے ایک اور سزا دے سکتی ہو، تم اتنی پتھر دل تو نہیں ہو کہ مجھے اتنی بڑی سزا دو میں صبح و شام اس گھر میں تمہیں کسی اور کے ساتھ ویسے دیکھوں جیسے رہنے کے خواب میں نے تمہارے ساتھ دیکھے تھے۔ میں نے اس وقت تمہاری مجبوری سمجھ لی تھی۔ میں لوٹ گیا تھا۔ آج تم بھی میری بے بسی سمجھ لو۔ جلدی چلی جاؤ کہیں بہت دور اتنی دور کہ ابا تمہیں تلاش نہ کر سکیں۔"

وہ کہہ کر تیز قدموں سے پلٹ گیا۔ اور میری ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی اور اب اندر جا کر سامنے لگی تصویر کو دیکھ کر صرف یہ کہنا تھا۔

"یہ تو میرے ابا نہیں ہیں۔ ان کا نام ضرور ہارون تھا مگر میں نے تصویر دیکھی تھی یہ وہ نہیں ہیں اور سب ختم ہونا تھا عزت، نام خاندان، آج اسی محبت کے کہنے پر وہ سب چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ جس سب کے لیے بھی محبت پہ دروازہ بند کیا تھا۔

☆☆

pklibrary.com

نگہت سیما

مکمل ناول

ماہ الملوک

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

مرزا جہاں زیب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاز یب اور ظفریاب کے ساتھ رہ رہے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

ظفریاب کا ایک بیٹا آزین تھا اور شاہ زیب بیگ کی ایک بیٹی زمل تھی آزین اور زمل کا نکاح ہو چکا تھا۔

شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کی کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

چوتھی قسط

pklibrary.com

"ہم کتنے خود غرض ہیں آزین!" زل اپنی مخصوص جگہ یعنی سیڑھیوں _____ پر بیٹھی صحن میں اور کیاریوں میں پھدکتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ اوپر سے آتے ہوئے اس کے پیچھے والی سیڑھیوں پر بیٹھنے والا آزین ہی ہے۔

"اوہ ہاں وہ کیسے..... کیا خود غرضی کی ہے ہم نے۔"

"ہم نے شیخو بابا کے متعلق کبھی نہیں سوچا زین! کیسی بے مقصد اور بے کار سی زندگی گزار رہے

pklibrary.com

ہیں وہ۔ کسی چھوٹے کی سی۔ کیا ساری زندگی وہ ایسے ہی گزار دیں گے دوڑ دوڑ کر سب کے کام کرتے ہوئے دوپٹے رنگواتے، سبزی لاتے، درزی کی دکان کے چکر لگاتے۔"

اس نے ذرا سی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

"ڈیوڑھی میں چوکیدار کی طرح چارپائی پر لیٹے اور بیٹھے۔ ان کا بھی تو حق ہے نا زین! کہ وہ زندگی کو اس طرح جئیں جیسے سب جیتے ہیں ان کا بھی ایک گھر ہو، بیوی بچے ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہم نے واقعی کبھی ان کے متعلق نہیں سوچا۔ لیکن یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں ان کے لیے۔"

وہ اب اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

"کیوں ممکن نہیں زین!" وہ پرجوش ہوئی۔

"میں دادا جان سے بات کرتی ہوں وہ تایا جان سے بات کر کے ان کے کارخانے میں ملازمت دلوا دیں۔ انہوں نے نو دس سال کی عمر سے لے کر اب تک کی ساری زندگی ہماری اس ڈیوڑھی میں گزاری ہے۔ وہ شاہ رخ بھائی کے ہم عمر ہوں گے یا ان سے کچھ چھوٹے یا کچھ بڑے، شاہ رخ بھائی کی شادی ہو رہی ہے تو کیا ان کی بھی اب شادی نہیں ہو جانی چاہیے۔"

"تو کیا وہ اپنی دلہن کو ڈیوڑھی میں رکھیں گے۔"

آزین ہولے سے ہنسا۔

اور عین اسی لمحے سحرش نے ریلنگ سے جھانکا۔ وہ دونوں برڈز کی طرح ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور آزین شاید ہنس رہا تھا۔

"اس خاندان کا سب سے اچھا پیس تو یہ زمل لے اڑی ہے۔" سحرش نے دانت پیسے۔

"تم ضرور کسی دن ان کو نظر لگا دو گی۔"

مہرین کچن سے چائے کا کپ اٹھائے باہر نکلی۔ اور لمحہ بھر کے لیے اس کے پاس ٹھہر کر جھانک کر سیڑھیوں پر بیٹھے زمل اور آزین کو دیکھا اور پھر ریلنگ کے پاس سے ہٹتے ہوئے غور سے سحرش کو دیکھا۔

"یہ تم آج کل کیوں مرچیں چبا رہی ہو۔"

"تمہیں تو جیسے پتا نہیں ہے نا۔" سحرش بھی ریلنگ کے پاس سے ہٹ کر برآمدے میں موجود کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں مجھے سچ میں نہیں پتا" مہرین کپ اٹھائے اس کی کرسی کے پاس کھڑی تھی۔

"وہ رشتے والی مامی ایک سے بڑھ کر ایک نمونے کا رشتہ لا رہی ہے۔" ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"کس کے لیے" مہرین نے بے وقوفی سے پوچھا۔

"احمق..... میرے لیے میرے علاوہ اور کون بچا ہے یہاں۔ اماں کو یک دم خیال آیا ہے کہ مرتضیٰ بھائی اور تمہاری شادی کے ساتھ مجھے بھی بھگتا دیں سو دھڑا دھڑ رشتے دیکھ رہی ہیں۔ حد ہو گئی زیادتی کی یار۔ تم ڈاکٹرین رہی ہو۔ ماہ وش اور شانزہ نے ماسٹر کیا اور میرا تو ابھی گریجویشن بھی نہیں ہوا۔"

وہ بی ایس سی کر رہی تھی۔

"دراصل تمہاری اماں تمہارے لیے شانزہ کے سسرال کی طرح کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ تم بے فکر رہو جب تک انہیں ایسا رشتہ ملے گا تب تک تمہارا ایم ایس سی ہو جائے گا۔"

مہرین کبھی کبھی پتے کی بات کر جاتی تھی۔

"سچ"

سحرش کا خراب موڈ ذرا بہتر ہوا تھا۔ سحرش نے تسلی کے انداز میں اس کے بازو کو تھپتھپایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی اس نے بھی تخت پر پڑے شانزہ کے رسالوں کے ڈھیر میں سے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

نیچے سیڑھی پر بیٹھی زمل کہہ رہی تھی۔

"ڈیوڑھی میں کیوں یہاں کتنے ہی فالتو کمرے ہیں کسی میں بھی رہ سکتے ہیں۔ اختر بانو پھپھو کا کمرا تو بالکل بی بی اماں کے کمرے کے ساتھ ہے اور پھپھو کون سا اب یہاں آتی ہیں۔

ویسے میرے ذہن میں ایک پلان اور بھی ہے وہ جو پیچھے کوارٹر گرا کر دکانیں بنوائی تھیں، وہاں ان

دکانوں کے اوپر فلیٹ بنوالیں۔ شیخو بابا پہلے جاب کریں کچھ پیسے اکٹھے کریں اور کچھ رقم دادا جان لگائیں۔ ظفریاب تایا ہے بھی دادا جان کہہ سکتے ہیں شیخو بابا کی مدد کے لیے آخر وہ ہی تو لے کر آئے تھے انہیں یہاں اور بی بی اماں کہتی ہیں تب وہ کہتے تھے یہ بھی میرا بیٹا ہے۔''

''ہوں اچھا خیال ہے لیکن تم میرے ابا سے کسی مدد کی امید مت رکھو، جنہیں اپنے سگے بیٹے کا خیال نہیں انہیں بھلا کسی دوسرے کا کیا خیال ہوگا۔''

زل اس کی بات کی تردید کرنا چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر خاموش رہی کہ خوامخواہ اس کا موڈ خراب ہو جائے گا۔ اسے اپنے باپ سے بے حد بے حساب گلے تھے، حالانکہ ظفریاب بھی اس سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ یہ تو وہ تھا جو خودساختہ ناراضی کا چولا پہنے بیٹھا تھا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد آزین نے بغور زل کی طرف دیکھا۔

''خیر تم دادا جان سے بات کر کے دیکھ لینا وہ ابا سے بھی بات کرلیں گے، مجھے تمہاری سوچ اچھی لگی زل! واقعی ہم کچھ کچھ بے حس اور خودغرض لوگ ہیں۔ ہم نے کبھی دوسروں کے متعلق نہیں سوچا ہمیں صرف اپنے کام سے مطلب ہے۔ مفت کے نوکر ملے ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں امید کہ تایا جان انہیں ملازمت دیں کیونکہ ان کی ملازمت سے سب سے زیادہ فرق تو اوپر والوں کو ہی پڑے گا۔ ہر گھنٹے بعد تو انہیں کوئی نہ کوئی کام پڑتا ہے۔ تائی جان کا بس چلے تو برتن دھونے اور جھاڑو پونچھا کرنے کا کام بھی ان کے سپرد کردیں۔ میں مرسل کے بھائی جان سے بات کروں گا وہ کہیں نہ کہیں اٹکا دیں گے انہیں۔''

''بس ان کو ملازمت مل جائے تو پھر میں بی بی اماں سے کہوں گی ان کے لیے کوئی لڑکی ڈھونڈیں پھر ہم ان کی شادی کردیں گے۔''

زل خوش ہوگئی تھی۔

''دوسروں کی شادی کی بہت فکر ہے تمہیں بس میرا خیال ہی نہیں ہے۔''

آزین نے چہرے کے تاثرات سے ناراضی کا تاثر دیا۔

''تو کیا میں دادا جان سے کہوں کہ آزین اور میری شادی کردیں کیا مجھے کہنا ہے یہ؟''

بغیر سوچے سمجھے ہی اس کے لبوں سے نکلا تو آزین نے شرارتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں تو پھر میں ہی بات کرلیتا ہوں دادا جان سے کہ سب کی شادیاں ہورہی ہیں، ہماری بھی کریں۔''

زل کے رخسار گل رنگ ہوئے اور پلکیں جھک گئیں۔ آزین نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''تو پھر بات کروں رخصتی کی اجازت ہے۔''

''فضول باتیں مت کرو زین!''

اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

''تمہیں پتا ہے، نا چند ماہ بعد میرے فائنل پیپر ز ہیں تو پلیز۔''

''آہ۔'' اس نے مصنوعی طور پر ٹھنڈا سانس لیا۔ ''ہماری [illegible] قسمت کہاں، تم کرواؤ اپنے شیخو بابا کی شادی۔''

''اچھا اب بنو نہیں۔'' اس نے بامشکل اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

''یہ بتاؤ سیٹیں بک کروالی ہیں اور پھپھو کو بتادیا ہے۔''

''سیٹیں تو بک کروالی ہیں لیکن پھپھو کو نہیں بتایا۔ سرپرائز دیں گے پھپھو کو۔ ویسے پھپھو سے آج صبح بھی بات ہوئی تھی، وہ پریشان ہورہی تھیں کہ دادا جان سے بات نہیں ہورہی تھی ان کی میں نے بتادیا تھا کہ فون خراب ہے ہمارا۔''

''تو فون کب تک ٹھیک ہوجائے گا۔'' اسے بھی ایک کلاس فیلو کو ضروری فون کرنا تھا۔

''کل تک ٹھیک ہوجائے گا۔ سفارش کروائی ہے آج، ہوسکتا ہے آج ہی ہوجائے۔ تمہیں پتا تو ہے یہاں سفارش اور رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔''

"خیر ایسا بھی نہیں ہے زین! سینکڑوں لوگوں کے کام بغیر سفارش اور رشوت کے بھی ہو جاتے ہیں۔ اب اگر چند لوگ برے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سب ہی برے ہیں۔"

زنل اپنے ملک کے خلاف تو ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

"سارے ملکوں میں برائیاں ہوتی ہیں لیکن کوئی اپنے ملک کو برا بھلا نہیں کہتا لیکن یہ ہمارے ملک کے لوگ، جب دیکھو اپنے ہی ملک کی برائیاں کر رہے ہوتے ہیں۔"

"تقریر اچھی کر لیتی ہو زنل! ویسے میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔ میرا مقصد اپنے ملک کی برائیاں کرنا نہیں تھا۔ اب دیکھتے ہیں مجھے بغیر سفارش اور رشوت کے جاب ملتی ہے یا نہیں۔"

وہ سنجیدہ ہوا۔

"ان شاء اللہ ضرور ملے گی۔ ویسے انٹرویو کب ہے تمہارا۔"

اس نے پوچھا۔

"ابھی ہیں دس دن، تب تک ہم پھپھو سے مل کر واپس آ جائیں گے۔ تم دعا کرنا زنل! اس بار تو جاب مل ہی جائے گی۔"

"دعا تو میں کرتی ہی ہوں، اب بھی کروں گی لیکن اگر تمہیں جاب مل گئی تو تمہیں اسلام آباد میں رہنا پڑے گا۔ تم بتا رہے تھے نا دادا جان کو کمپنی کا ہیڈ آفس وغیرہ اسلام آباد میں ہے۔" وہ یک دم افسردہ ہو گئی تھی۔

"ہاں لیکن وہ لوگ اپنی کمپنی کی ایک برانچ یہاں لاہور میں بھی کھول رہے ہیں۔ کچھ سینیئرز ٹرانسفر ہو کر یہاں کی برانچ میں آئیں گے اور کچھ نئے لوگ رکھیں گے۔ اور کچھ نئے لوگ اسلام آباد ہیڈ آفس میں بھی اپائنٹ کریں گے۔ اب دیکھو جاب مل جانے کی صورت میں مجھے اسلام آباد ہیڈ آفس میں رکھیں گے یا یہاں لاہور کی برانچ میں۔"

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا جو افسردہ سی لگ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ زنل اور اس کے درمیان نکاح کا مضبوط بندھن ہے۔ زنل اس سے محبت کرتی ہے۔ بچپن سے ہی دونوں میں دوستی کا رشتہ تھا لیکن اب نکاح کے بعد زنل کی کسی بات یا حرکت سے معمولی سا اظہار بھی اسے اندر تک شانت کر دیتا تھا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اس کے اسلام آباد چلے جانے کے خیال سے افسردہ ہو رہی تھی۔ اور اس کی افسردگی اسے مطمئن کرتی تھی۔

"زنل!" زنل نے اس کی طرف دیکھا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں جب ہماری شادی ہوگی۔ تم اپنے کمرے سے رخصت ہو کر میرے کمرے میں آ جاؤ گی تو کیسا لگے گا۔ کچھ عجیب سا، انوکھا سا، کچھ خوش کن سا دل میں پھول کھلاتا سا۔"

اب وہ پورا کا پورا اس کی طرف مڑ گیا تھا۔

"کیا تم نے بھی کبھی سوچا جب ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو کیسا لگے گا۔"

"میں نے کبھی نہیں سوچا۔" زنل نگاہیں جھکائے اپنے پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو نا۔ لڑکیاں تو بہت تصوراتی ہوتی ہیں۔ آنے والی زندگی کے متعلق نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں کہ ایک شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک دن ان کے محل کے دروازے پر دستک دے گا اور......"

اس کی شرارتی نظریں زنل کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"مجھے کسی شہزادے کا خواب دیکھنے کی کیا ضرورت ہے میرا شہزادہ تو پہلے ہی میرے پاس ہے۔"

ایک نظر اس پر ڈال کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر کچن میں گھس گئی۔ آزین وہیں بیٹھا رہا، مدھم سی مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔ ان کی زندگی میں ایسے لمحے کم ہی آتے تھے جب بھی فراغت سے بیٹھ کر، انہوں نے اس احساس کے ساتھ ایک دوسرے سے بات کی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے نکاح میں ہیں، ان کے درمیان ایک خوب صورت رشتہ ہے۔

pklibrary.com

زمل کی اپنی مصروفیات اور پریشانیاں تھیں۔ آزین کی اپنی الجھنیں، پریشانیاں اور دکھ تھے۔ کبھی کبھی تو وہ زندگی سے ہی بے زار لگنے لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اماں، ابا دونوں ہی شادیاں کر کے اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن تھے۔ کسی نے اس کا خیال نہیں کیا کسی نے اس کے متعلق نہیں سوچا اور اپنی اپنی زندگی شروع کر دی بس وہ رہ گیا اکیلا اور تنہا۔ اگر بی بی اماں، دادا جان اور مریم چچی نہ ہوتیں تو وہ تنہا کمرے میں ہی رو رو کر مر جاتا۔

بے حد، بے حساب گلے تھے۔ اس کی زندگی کا سب سے خوش گوار اور اہم واقعہ زمل سے اس کا نکاح تھا۔ جب زمل سے اس کا نکاح ہوا تھا تب وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ زمل سے محبت کرتا ہے بے حد، بے حساب محبت بس وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک دوسرے کا دکھ بٹاتے تھے جب مریم چچی فوت ہوئیں تو زمل صرف بارہ سال کی تھی اور وہ پندرہ سال کا۔ چھ سال پہلے جب وہ نو سال کا تھا اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور باپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ ماں کی جدائی اور باپ کی بے اعتنائی کے دکھ سے آشنا تھا، اس لیے اس نے زمل کے درد کی شدت کو ایسے ہی محسوس کیا تھا جیسے وہ اس کا اپنا دکھ ہو۔ یوں وہ خود بھی تو مریم چچی سے بہت اٹیچڈ تھا۔ ان دنوں وہ کسی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

وہ روتی تو اس کے آنسو پونچھتا۔ اداس ہوتی تو ہنسانے کی کوشش کرتا۔ اس کی ماں دنیا چھوڑ گئی تھی اور باپ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا، ملا تو خود سے بیگانہ تو اسے اپنا اور اس کا دکھ مشترک لگتا تھا۔

اور پھر جب ظفریاب نے یو کے کے لیے رخت سفر باندھا تو دادا جان نے، اس کا نکاح زمل سے کر دیا۔ اس وقت زمل کے لیے اس نے کچھ خاص محسوس نہیں کیا تھا اور یہ تو نکاح کے دو سال بعد اسے لگا تھا کہ وہ تو زمل سے محبت کرتا ہے۔ بے حد، بے حساب محبت اور اگر زمل اس کی زندگی میں شامل نہ ہوتی تو شاید وہ سانس بھی نہ لے پاتا۔

اس روز اس نے مونا اور رخسانہ کو باتیں کرتے سنا تھا۔ مونا چچی کہہ رہی تھیں۔

''یہ ابا جان بھی نہ کسی سے مشورہ کرتے ہیں نہ کچھ پوچھتے ہیں اور خود ہی فیصلہ سنا دیتے ہیں، اب دیکھو نا انہوں نے زمل اور آزین کا نکاح کر دیا۔ ورنہ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ شانزہ کی شادی آزین سے ہو جائے گی۔ ماہ وش اور شارخ کی تو بچپن سے طے ہے۔ مہرین کی میرے مرتضیٰ سے، پیچھے رہ گئی سحرش اور تمہارا بلال تو ان دونوں کے لیے میں نے بھائی جان سے بات کرنے کا سوچ رکھا تھا۔''

''اور زمل کا کیا ہوتا۔'' یہ رخسانہ چچی تھیں۔

''زمل کی بھی کہیں شادی کروا دیتے ہم۔ وہ رقیہ آپا کا بیٹا ہے، تایا جان اسے پسند بھی بہت کرتے ہیں۔''

اور اس کا دل جیسے ڈوب سا گیا تھا نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ زمل کے بغیر وہ کیسے جی پاتا اور وہ وہاں سے ہی واپس پلٹ آیا تھا اور اس روز اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ تو زمل سے بے حد محبت کرتا ہے اور یہ بات کتنی اطمینان بخش تھی کہ وہ اس کی منکوحہ تھی اور اس روز، اسے دادا جان پر بہت پیار آیا تھا کہ انہوں نے اس کے اور زمل کے نکاح کا فیصلہ کر کے بہت اچھا کیا۔ حالانکہ جب دادا جان نے بتایا تھا کہ وہ اس کا زمل سے نکاح کر رہے ہیں تو وہ بہت جز بز ہوا تھا۔

''بھلا نکاح کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو میری شادی زمل سے کرنا ہے تو کر دیجیے گا۔ میں کوئی انکار کر رہا ہوں۔ لیکن یہ اس وقت نکاح کی کیا ضرورت ہے۔''

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے آزین۔ ظفریاب کے باہر جانے سے پہلے میں یہ فریضہ ادا کرنا چاہتا ہوں اگر تمہیں زمل پسند نہیں ہے تو الگ بات ہے۔'' وہ بے حد سنجیدہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''نہیں خیر ناپسند تو نہیں ہے بس مجھے ابھی اتنی جلدی اچھا نہیں لگ رہا ہے تو۔'' اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح دادا جان کو اپنے احساسات سمجھائے جبکہ وہ خود بھی اپنے احساسات سے بے خبر تھا۔

دادا جان نے اس کی طرف سے مطمئن ہو کر

ظفریاب کے یو کے جانے سے پہلے، اس کا نکاح کر دیا تھا۔ اگر دادا جان جلدی نہ کرتے تو میمونہ چچی ضرور کوئی گڑبڑ کرتیں، اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا لیکن دونوں جانتے تھے کہ دونوں کے درمیان ایک خوب صورت بندھن ہے۔ جب وقت آئے گا تو وہ زمل کو بتائے گا کہ کب کیسے وہ خود پر منکشف ہوا تھا اور کب اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین آیا تھا۔

لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے وہ اٹھا تو اٹھتے اٹھتے اس کی نظر اوپر ریلنگ پر جھکی، سحرش پر پڑی تو اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''ہے...... مس جاسوس کیا دیکھ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں بس یوں ہی زمل کو دیکھ رہی تھی۔''

سحرش جھینپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

یہ بی بی اماں نے بھی اس کا صحیح نام رکھا ہے۔ مس جاسوس بیگم۔

زمل کچن میں ہے سحرش کوئی کام ہے کیا۔'' صحن میں آ کر اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

''ہاں'' سحرش کا سر پھر ریلنگ پر نظر آیا۔

''ہاں وہ ایک کتاب کے متعلق پوچھنا تھا۔ فارغ ہو کر [illegible] ہوں۔''

سحرش پیچھے ہٹ گئی تو وہ مسکراتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔

پتا نہیں کیوں آج دل بے ایمان سا ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ زمل کو پاس بٹھا کر بہت ساری باتیں کرے۔ اسے بتائے کہ وہ اسے کتنا سوچتا ہے۔ اس کے سنگ زندگی گزارنے کے کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی ہتھیلیوں پر کوئی امید کے چراغ رکھے اسے بتائے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے، وہ اسے یوں سنبھال کر رکھے گا کہ کوئی گرم ہوا تک اسے نہ چھو سکے۔ وہ اس کے سارے آنسوؤں کو اپنے اندر اتار لے گا اور کہے گا بس اب کبھی نہ رونا میں ہوں نا تمہارے ساتھ، یہ میرا سینہ حاضر ہے جتنے آنسو بہانے ہیں بہا لو بس پھر نہیں۔

ہم زندگی بھر آخری سانس تک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، زندگی کی شاہراہ پر ہنسی خوشی چلتے رہیں گے۔

ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا ہوا وہ کچن کے دروازے تک آیا تو زمل کی پیٹھ، دروازے کی طرف تھی اور وہ سنک میں رکھے برتن دھو رہی تھی اور ساتھ ساتھ بی بی اماں سے باتیں بھی کر رہی تھی، جو کچن ٹیبل پر سبزی کی ٹوکری رکھے سبزی کاٹ رہی تھیں۔

''بی بی اماں، یہاں سے جانے کے بعد کیا صبوحی چچی نے پھر رابطہ نہیں کیا۔ کبھی دادا جان کو فون کیا ہو زین کا پوچھنے کے لیے۔''

اور وہ وہاں ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ ایسا زخم تھا جو کبھی بھر نہیں پایا تھا۔ ہمیشہ رستا رہتا تھا۔ اماں کا یک دم ابا سے طلاق کا مطالبہ کرنا اور پھر طلاق لے کر چلے جانا۔ اسے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ ابھی چند دن پہلے تک تو وہ ابا کے غم میں رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ تو سال کا تھا اور سب یاد تھا اسے وہ کیسے اس کی انگلی پکڑے خوار ہوتی پھرتی تھیں۔ کیسے پارٹی کے ایک ایک بندے کے گھر جا کر منتیں کرتی تھیں۔ اس نے اماں کو پارٹی کے بڑوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے منتیں کرتے روتے دیکھا تھا۔

اپنی پارٹی سے مایوس ہو کر وہ برسر اقتدار پارٹی کے دروازے کھٹکھٹانے لگی تھیں۔ اورنگ زیب اور ارباب تایا تو چند دن کوشش کرنے [illegible] گئے تھے، شاہ زیب چاچو اپنے ذرائع سے ان کا پتا کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دادا جان بھی دن بھر اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے پاس جاتے یا پھر فون کرتے رہتے تھے۔ صبوحی کچھ دن انتظار کرنے کے بعد خود اس کی انگلی پکڑ کر گھر سے نکل پڑی تھیں۔ دادی منع کرتیں۔

''صبوحی بیٹا! عورت ذات ہو۔ کہاں تلاشو گی اسے۔ شاہ زیب کوشش کر رہا ہے اس کا پتا چلانے کی۔''

''اماں مجھے اپنے طور پر پتا کرنے دیں۔''

دونوں عورتوں کا درد مشترکہ تھا۔ غائب ہو جانے والا ایک کا بیٹا اور ایک کا شوہر تھا۔ دادی خاموش ہو جاتی تھیں اور پھر ظفریاب گھر آ گئے اور پھر

ایسا کیا ہوا تھا کہ ظفریاب کے زخم بھرتے ہی وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اس نے اماں کو ظفریاب کی خدمت کرتے ان کے زخموں پر مرہم رکھتے دیکھا تھا۔ ظفریاب آبھی گئے تھے پھر بھی ان کے آنسو خشک نہ ہوتے تھے۔

بی بی اماں بتاتی تھیں کہ دونوں کی محبت کی شادی تھی دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، یہ خیال آتے ہی وہ ڈر سا جاتا خوف زدہ ہو جاتا کیا محبت اتنی ناپائیدار ہوتی ہے۔ اتنی کمزور کہ ختم ہو جائے۔ اور کیا کبھی میری محبت بھی، بی بی اماں کہہ رہی تھیں۔

"پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی کیا ہو تمہارے دادا جان کو لیکن بڑے صاحب نے کبھی ذکر نہیں کیا بتایا نہیں۔ آہ دل آج بھی نہیں مانتا بیٹی، کہ صبوحی بی بی یوں اس طرح اچانک اتنا بڑا فیصلہ کر لیں گی کیسے چاند چکوری کی طرح تھے دونوں، ظفریاب کو سر میں درد بھی ہوتا تو وہ تڑپ اٹھتی تھی۔ دس گیارہ سالوں میں ایک بار بھی میں نے اسے میاں سے جھگڑتے نہ دیکھا تھا۔ جیسے ہر وقت ہاتھ باندھے اس کی خدمت میں حاضر رہتی تھی۔"

"اتنی محبت کے باوجود کوئی کیسے اچانک علیحدگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ضرور صبوحی چچی کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔"

وہ برتن دھو کر مڑی تو آزین پر اس کی نظر پڑی سپاٹ چہرہ، بے رنگ، بجھی آنکھیں.....

"زین تم کوئی کام تھا کیا۔" وہ گھبرا سی گئی تھی۔

"ہاں..... میں بی بی اماں سے یہ کہنے آیا تھا کہ کل مرسل کی تنظیم کی کوئی میٹنگ ہے اور وہ مہمان خانے میں اکٹھے ہوں گے تو آپ صبح اپنی نگرانی میں ڈسٹنگ وغیرہ کروا دیجیے گا۔"

اس رات مرسل اور اس کے دوستوں نے جہاں زیب بیگ سے ملاقات کر کے جب وضاحت سے اپنے اغراض و مقاصد اور ارادے وغیرہ بتائے۔ تو جہاں زیب بیگ نے انہیں اجازت دے دی تھی کہ وہ جب چاہیں وہاں اپنی میٹنگز وغیرہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے ان کے کام کی بے حد تعریف بھی کی تھی جو وہ کر چکے تھے اور کر رہے تھے۔

"جی بیٹا..... وہ تو میں کروا دوں گی کیا کوئی چائے پانی وغیرہ بھی کرنا ہوگا۔"

بی بی اماں نے پوچھا۔

لیکن وہ بی بی اماں کی بات سنے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"زین، رکو، سنو....." زمل لپک کر دروازے تک آئی۔

"رہنے دو بیٹا" بی بی اماں کے لہجے میں تاسف تھا۔

"ماں کا ذکر سن کر وہ ہمیشہ ہی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ کتنی بھی احتیاط کروں کسی نہ کسی منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ صبوحی بیٹی تھی بھی تو بہت اچھی۔ بی بی اماں، بی بی اماں کہتے جیسے زبان سوکھتی تھی اس کی آہ۔ مجھے کیا پتا تھا وہ دروازے پر کھڑا ہے اور تم نے بھی خوامخواہ صبوحی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اب دیکھو کتنی دیر تک خود کو بند رکھے گا کمرے میں۔"

"میں اس کے پاس جاؤں بی بی اماں اور۔"

"نہیں" بی بی اماں نے زمل کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"خود ہی اپنا غم منا کر باہر آ جائے گا۔ تم جاؤ گی تو اور ڈسٹرب ہوگا۔ ننھے سے دل پر بڑے زخم کھائے ہیں اس نے ایک تو ماں کے اس طرح چھوڑ کر چلے جانے کا غم۔ باپ کی حالت دوسرا تمہاری تائیوں کی طنزیہ باتیں۔ تو یہ ہے کہ میں تب سے ہی ان سے چڑنے لگی ہوں۔ معصوم بچے کی دل جوئی کرنے کے بجائے الٹا زخم لگاتی ہیں۔ وہ تو اللہ بخشے تمہاری ماں نے اپنی محبت سے اس کے اتنے بڑے دکھ کو کم کرنے کی کوشش کی۔"

انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھری پلیٹ میں رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ سبزی میں نے کاٹ دی ہے تم ہانڈی چڑھا دینا۔ رات کے لیے آلو گوشت بن جائے گا۔ دل چاہا تو ساتھ میں چاول ابال لیں گے۔"

گھر میں کیا پکتا ہے۔ یہ فیصلہ بی بی اماں خود ہی کرتی تھیں۔ آزین۔ زمل یا جہاں زیب بیگ نے

بھی کچھ نہیں کہا تھا وہ جو پکاتیں سب بغیر اعتراض کے کھا لیتے تھے ہاں کوئی دعوت وغیرہ ہوتی تو وہ ضرور زمل اور آزین سے مشورہ کرتیں۔

''میں ذرا تمہارے ابا کے گیسٹ روم کو دیکھ لوں کل ساجدہ نے تو چھٹی کرنی ہے بتا کر گئی ہے غریب۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔

''ضرورت محسوس ہوئی تو شیخو کے ساتھ مل کر صفائی کروالوں گی۔''

''لیکن بی بی اماں شیخو بابا کوئی صفائی کرنے والے تو نہیں ہیں نا۔ ساجدہ صبح آئے گی تو کرلے گی صفائی وغیرہ اچھا نہیں لگتا۔ شیخو بابا سے اس طرح کے کام کروانا۔ بازار سے سودا سلف لے آتے ہیں بس کافی ہے۔ اور آج کل تو وہ ابا کی بھی دیکھ بھال کررہے ہیں۔ جب سے وہ ابا کے ساتھ ڈاکٹر ارسلان کے کلینک میں گئے ہیں..... ابا کا بہت خیال کرنے لگے ہیں۔ کل تو کلینک سے واپسی پر وہ ابا کو مینار پاکستان لے گئے تھے..... بتا رہے تھے ابا وہاں جا کر بہت خوش ہوئے۔''

''آزین کو ضروری کام سے فیصل آباد جانا تھا۔ اور شاہ زیب کا سیشن بھی تھا ڈاکٹر ارسلان کے ساتھ۔ تب آزین نے شیخو بابا کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ انہیں ڈاکٹر ارسلان کے کلینک میں لے جائیں۔ اور حیرت انگیز طور پر وہ بغیر کسی ضد اور انکار کہ ان کے ساتھ چلے گئے تھے اور اب کل اگرچہ آزین موجود تھا پھر بھی شیخو بابا کے کہنے پر، آزین نے انہیں اس کے ساتھ ہی بھیج تھا۔ اور کل اتنے دنوں کے بعد اس نے ابا کو خوش دیکھا تھا۔ وہ شیخو بابا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے گھر کے اندر آئے تھے، شیخو بابا نظریں جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

''وہ شاہ زیب صاحب نے ضد کی کہ ان کے ساتھ اندر چلو۔''

''کوئی بات نہیں شیخو بابا۔ آپ ابا کو ان کے کمرے میں لے جائیں۔ اور کچھ دیر ان کے پاس ہی بیٹھ کر باتیں کریں۔''

''اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹی! جو اس غریب کے متعلق سوچتی ہو ورنہ اوپر والوں کا بس چلے تو جھاڑو پونچھا تک اس سے کروائیں۔ ٹکوڑ مارا نہ جانے کس خاندان کا لعل ہے منہ سے کبھی کچھ نہیں پھوٹتا۔ مجھے تو کسی اونچے، اعلیٰ خاندان کا لگتا ہے۔ ظفر یاب چلے گئے ورنہ وہ ضرور اس کے خاندان کا کھوج لگا لیتے ایک دو بندوں سے کہہ رکھا تھا انہوں نے۔''

''بیٹھ جائیں بی بی اماں! میں خود صبح جا کر سب دیکھ لوں گی۔ وہ لوگ تو شام میں آئیں گے نا۔''

اس نے بی بی اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھایا اور انہیں وہ سب بتانے لگی جو اس نے زین سے کہا تھا۔

''اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے بیٹی! میں نے تو خود شیخو کو دو تین بار کہا کہ وہ اب کہیں نوکری شوکری کر کے اپنا گھر ٹھکانہ بنائے۔ کیوں پرائے دروازے پر پڑا ہے۔ پر اس کا تو ایک ہی جواب ہے کہ اسے یہاں سے کہیں نہیں جانا۔ یہ ڈیوڑھی ہی اس کا گھر اور ٹھکانہ ہے اور یہاں کے مکین اس کے عزیز رشتہ دار۔ دیوانہ ہے ٹکوڑا۔ سارا دن ڈیوڑھی میں بیٹھا خالی دیواروں کو تکتا ہے۔''

وہ پھر کھڑی ہو گئی تھیں۔

''میں ایک نظر دیکھ ہی لوں۔ صبح کہیں معروفیت میں ذہن سے نکل ہی نہ جائے اور زین کو شرمندگی ہو۔ ویسے مجھے یہ زین میاں کی سمجھ نہیں آتی۔ یہ گھر ہے کوئی آفس نہیں ہے کہ وہ ادھر بیٹھ کر میٹنگ کریں گے۔''

''وہ یہ ہے کہ بی بی اماں! ابھی ان کے پاس کوئی آفس وغیرہ نہیں ہے۔ دراصل وہ لوگ انورڈ نہیں کر سکتے کسی آفس کا کرایہ تو اس لیے دادا جان نے اجازت دے دی کہ وہ لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کررہے ہیں۔''

زمل نے بتایا۔

''ارے یہ زین کے ابا بھی تو اپنے دوستوں کے ساتھ گھنٹوں بیٹھک میں بیٹھ کر میٹنگیں کرتے تھے، بے چاری صبوحی گھڑی گھڑی چائے بھجواتی رہتی تھی اور انجام کیا ہوا۔''

انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔

"وہ سیاسی لوگ تھے بی بی اماں اور ان کی میٹنگز بھی سیاست کے حوالے سے ہوتی ہوں گی۔ یہ تو سادا سے لوگ ہیں۔ ان کی تنظیم فلاحی کام کرتی ہے۔"

زمل نے پھر سمجھایا اور بی بی اماں بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں تو اس نے چولہا جلا کر ہانڈی چولہے پر رکھی۔ کتنا اچھا موڈ تھا زین کا اور اب نہ جانے کب تک وہ خود اپنے آپ سے بھی خفا رہے گا۔ خود سے ہی ناراض ہوتا رہے گا۔ میں بھی نا۔

وہ پچھتا رہی تھی۔ اب بھلا مجھے کیا ضرورت تھی یہ پوچھنے کی کہ بھوجی چچی نے پھر بھی رابطہ کیا یا نہیں۔

اس نے خود کو ڈپٹا اور مرتبان سے گھی نکال کر دیگچی میں ڈالا۔ تب ہی سحرش کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

"زمل" وہ چونک کر مڑی اور سحرش کو دیکھ کر سر ہلایا۔ پیاز گھی میں ڈال کر آنچ دھیمی کی۔

"کیا بن رہا ہے۔"

سحرش نے قدم اندر رکھا۔

"مکس سبزیاں بنانے لگی ہوں۔"

"مکس سبزیاں" اس نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائی۔

"کیا زین بھائی کھا لیتے ہیں سبزیاں۔"

"زین کبھی کسی کھانے پر اعتراض نہیں کرتا۔ پسند آئے یا نہ آئے کھا لیتا ہے۔ ویسے بی بی اماں زیادہ تر اس کی پسند سے ہی کھانا بناتی ہیں۔ دن کو سبزی بنے گی تو رات کے لیے آلو گوشت کا کہہ رہی ہیں بی بی اماں۔"

زمل اب ٹماٹر پیاز ہلدی ڈال کر سبزیاں ڈال رہی تھی۔

"اوپر تو ابھی تک یہ ہی ڈیسائیڈ نہیں ہو رہا کہ کیا پکے گا آج اور یہاں بی بی اماں نے رات کا مینیو بھی بتا دیا۔ ہائے کاش ہمیں بھی ایسی ہی ایک بی بی اماں مل جاتیں۔"

ٹھنڈی سانس لے کر وہ کرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا کوئی کام تھا سحرش۔" زمل نے کفگیر دیگچی میں ہلاتے ہوئے پوچھا کہ سحرش بنا کسی کام کے کم ہی نیچے آتی تھی۔

"اوہ ہاں....." سحرش کو بھی یاد آیا کہ وہ کس کام سے آئی تھی۔

"کل یہاں۔ مطلب باہر تخت پوش پر کوئی ناول پڑا تھا۔ میں نے یوں ہی ایک صفحہ کھول کر دیکھا تو بہت دلچسپ لگا تھا۔ وہ لینا تھا۔ کیا نام تھا اس کا بھول گیا ہے۔ دادا جان کا تھا یا تم نے لائبریری سے منگوایا تھا۔"

"ہاں وہ ساجدہ اپنی باجی کے لیے جدھر وہ کام کرتی ہے لے کر آئی تھی تو اسے لائبریری میں واپس کرنا تھا۔ نسیم حجازی کا "خاک و خون" تھا۔ ویسے دادا جان کے پاس نسیم حجازی کی کتابوں کا پورا سیٹ ہے۔" زمل نے آنچ مزید دھیمی کی اور دیگچی پر ڈھکن رکھا۔

"اچھا تو پھر مجھے دادا جان کی کتابوں میں سے ڈھونڈ کر نکال دو۔" سحرش نے اٹھ کر چولہا بند کر دیا۔

"پکانی رہنا ہانڈی، پہلے میرے ساتھ چل کر مجھے کتاب دو۔"

"تمہیں کب سے شوق ہو گیا کتابیں پڑھنے کا۔" زمل نے پوچھا۔

"خیر ایسا شوق تو نہیں تمہارے اور شانزہ جیسا لیکن دوپہر میں بہت بوریت ہوتی ہے۔ پڑھ پڑھ کر تھک چکی ہوتی ہوں اور نیند آتی نہیں۔ اوپر سے یہ چھٹیاں بھی اتنی لمبی ہو گئی ہیں۔ شانی تو اتنی بوری کتابیں پڑھتی ہے یا پھر ڈائجسٹ۔ یہ مجھے دلچسپ سی لگی تھی۔ سرار تیں تھیں۔ ہنسی آئی تھی مجھے۔"

"ہاں شروع کے ایک دو باب میں لیکن پھر آخر میں اتنا ہی رلائے گا تمہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ پاکستان کا ہر بچہ اسے پڑھے اسے پتا چلے کہ پاکستان کا وجود کتنا ناگزیر تھا۔ وہ جو منہ ٹیڑھے کر کر کے اور لفظ چبا چبا کر کہتے ہیں کہ پاکستان کیوں بنایا۔ قائداعظم نے بڑی غلطی کی، ہندوؤں اور سکھوں سے دوستی اور محبتوں کی باتیں کرتے ہیں انہیں پتا چلے کہ پاکستان یوں ہی نہیں

بن گیا تھا۔ بڑی قربانیاں دی تھیں۔ انہیں پتا چلے کہ ایک لاکھ نوے ہزار مسلمان عورتیں آج بھی سکھوں کے گھروں میں ہیں جو سکھوں کے گلے لگ لگ کر اپنی محبتوں کا یقین دلاتے ہیں انہیں۔"

وہ پاکستان اور قائداعظم کے متعلق بات کرتے ہوئے اتنی ہی جذباتی ہو جاتی تھی۔

"تم نے پڑھا ہے یہ ناول۔"

سحر جانتی تھی کہ وہ پاکستان کے قیام کے موضوع پر گھنٹوں بول سکتی تھی۔

"ہاں پہلی بار پانچویں جماعت میں پڑھا تھا اور تب سے لے کر اب تک نہ جانے کتنی بار پڑھ چکی ہوں۔"

"ایک ہی ناول" سحرش کو حیرت ہوئی۔

"ہاں ایک ہی" وہ مسکرائی اور صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آئی۔

سحرش کچن کے دروازے تک آ کر رک گئی تھی۔

"ایسا کرو زل، تم خود ہی جا کر دادا جان سے لے آؤ۔ اس وقت موڈ نہیں ہے ان کی باتیں سننے کا اور پھر دادا جان کے پاس گئی تو کافی دیر تک بیٹھنا پڑے گا اور اوپر اماں نے ہنگامہ کر دینا ہے۔"

"کیوں۔ کیا دادا جان کے پاس بیٹھنے پر۔"

اس نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"نہیں وہ دراصل اماں نے مجھے کچن کے کیبنٹ صاف کرنے کو کہا تھا تو سمجھیں گی جان بوجھ کر کام سے جی چرا کر چلی گئی۔ آج کل سارا نزلہ مجھ پر ہی گرتا ہے اور اماں نے تو جیسے مجھے ہی تاڑ رکھا ہے ہر کام کے لیے...... دو مہارانیوں کی شادی ہے اور تیسری کی مفت پڑھائی، ورنہ مجھے تو دادا جان سے باتیں کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔ اتنا علم ہے ان کے پاس اتنی نالج ہے اور پھر اتنے مزے مزے کے واقعات سناتے ہیں۔"

وہ تیز تیز بول رہی تھی۔ زل مزید کوئی بات کیے بغیر دادا جان کی اسٹڈی کی طرف بڑھ گئی اور وہ باہر کچن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وسیع صحن، کشادہ برآمدہ، کیاریوں میں لگے

پھول۔ پودے۔ ستون سے لپٹی موتیا کی بیلیں۔ جو اوپر ٹیرس تک جا رہی تھیں۔ جولائی کا مہینہ تھا اور موتیا کی بیلیں کلیوں اور پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سارے میں موتیا کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ خوشبو تو خیر اوپر برآمدے میں بھی بکھری رہتی تھی۔

یہ نہیں کہ وہ پہلی بار سب دیکھ رہی تھی۔ سینکڑوں بار دیکھ چکی تھی، لیکن آج نظریں کچھ تنقیدی سی تھیں۔ یہ دادا جان نے یہاں بھی ڈنڈی مار دی ہمیں تو دے دیا اوپر والا پورشن اور خود اپنے چہیتے بیٹوں کے ساتھ نیچے والا حصہ سنبھال لیا۔ اسے لگا کہ یہ خالص اس کی سوچ نہیں ہے بلکہ یہ جملہ اس نے پہلے سے سن رکھا ہے۔ شاید رخسانہ خالہ یا پھر اماں سے۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ اسے تو زل سے یہ بھی پوچھنا تھا کہ یہ زین بھائی کو کیا ہوا کیسے غصے سے تیز تیز چلتے ہوئے کچن کی طرف سے جا رہے تھے۔ شاید اپنے کمرے میں اس نے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ منہ سجائے۔ ضرور زل نے ہی کوئی بات کر کے خفا کر دیا ہوگا۔ اور وہ بیچارے بجس کے اماں کے روکنے کے باوجود چلی آئی تھی۔ کتاب کا تو محض بہانہ تھا۔ اب ایسی بھی شوقین نہیں تھی کتابوں کی۔ وہ تو کسی بھی وقت آ کر لے جاتی لیکن یہ کم بخت حافظہ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ تب ہی زل دادا جان کے کمرے سے باہر آئی اور کتاب اسے دی۔

"احتیاط سے پڑھنا سحرش! پچھلی دفعہ تم نے شوکت تھانوی کی جو کتاب لی تھی اس کی جلد الگ ہو گئی تھی۔ دادا جان بہت ناراض ہوئے تھے تمہیں پتا ہے نا انہیں اپنی کتابوں سے بہت محبت ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ اب کے احتیاط سے پڑھوں گی وہ تو پچھلی بار اس بلال کے بچے نے مجھے غصہ دلا دیا تھا۔ میں وہ پڑھ رہی تھی تو وہی کتاب اٹھا کر اسے دے ماری تو جلد الگ ہو گئی۔

اب مجھے کیا پتا تھا کہ ذرا سا پھینکنے پر جلد الگ ہو جائے گی۔" معصومیت کی اداکاری تو اس پر ختم تھی۔

"ویسے یہ بہت زیادہ رلانے والی اور دکھی

pklibrary.com

تو نہیں۔ میرا دل برداشت نہیں کر پاتا دکھی دکھی کہانیوں کو۔"

وہ یوں ہی کتاب کے اوراق پلٹنے لگی۔

"یہ پاکستان بننے اور پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والوں کی کہانی ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت جسے قلم لہو میں ڈبو کر لکھا گیا ہے اور ہجرت کوئی بھی ہو اس کے دامن میں آنسو دکھ اور ہجر کی اذیتیں ہوتی ہیں تم دیکھ لینا ایک نظر نہ برداشت کر سکو تو نہ پڑھنا۔"

سنجیدگی سے کہتی وہ کچن کی طرف بڑھی تو اس نے روکا۔

"سنو یہ زین کو کیا ہوا تھا تو بڑا سجائے جا رہا تھا۔"

سحرش کا جب جی چاہتا۔ زین بھائی کہہ کر بلاتی جب جی چاہتا صرف نام لے لیتی تھی۔

"جب کہ کچھ دیر پہلے تم دونوں ادھر سیڑھیوں پر بیٹھے بڑے خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے بلکہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ شاید کوئی رومینٹک خیال آ رہا تھا لیکن پھر فوراً ہی خراب موڈ کے ساتھ واپس جاتے نظر آئے۔"

زل کی آنکھوں سے کرب سا جھلکا اور وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی بتا نہیں۔" بی بی اماں سے اپنے دوستوں کی بات کر کے چلا گیا تھا۔"

"بیار کھار کر رو زل۔"

وہ بہت کم سنجیدہ ہوتی تھی لیکن اس وقت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ "ہماری ٹیچر والعیہ کمال کہتی ہیں کہ اپنی چیزوں کی خود حفاظت کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ کھو جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات واپس ہی نہیں ملتیں۔ اگر مل بھی جائیں تو ویسی نہیں ہوتیں جیسی پہلے تھیں۔ سو ان کا بہت دھیان رکھنا پڑتا ہے۔"

"زین کوئی چیز نہیں ہے سحرش۔" زل الجھی سی گئی تھی۔

"ہاں وہ......"

سحرش کی نظریں اچانک اوپر اپنے ٹیرس کی طرف اٹھیں اور مرتضیٰ کی نظروں سے ملیں جو نظریں ملتے ہی فوراً پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"لوگ چیزوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں زل۔" اس کی نظریں پھر ٹیرس کی طرف اٹھیں۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔

"جانتی ہو زل، جیتے جاگتے انسان کب کھوتے ہیں۔ جب کوئی دو رشتوں کے درمیان بدگمانی پیدا کر دے اور تب اگر رشتے نہ بھی ٹوٹیں تو رشتوں میں دراڑ ضرور پڑ جاتی ہے۔ اس لیے کبھی اپنا یقین نہ کھونا اور کبھی زین بھائی سے بدگمان نہ ہونا۔ شیطان بدگمانیاں پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ ہمارے آگے پیچھے ہوتا ہے۔"

وہ بھلا کیوں زین پر شک کرے گی اور وہ اپنا یقین کبھی نہیں کھو سکتی۔ ایک مدھم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔

یہ سحرش بھی نا...... ضرور یہ اس کی ڈائری میں لکھا کوئی اقتباس ہوگا، جو اس نے کسی افسانے یا کہانی سے لیا ہوگا لیکن آج سے پہلے اپنی ڈائری میں لکھے کسی شعر یا اقتباس کا اتنا مناسب استعمال اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اپنی بات کر کے وہ رکی نہیں تھی اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتی اوپر جا رہی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی جو دل میں آتا فوراً کہہ دیتی۔ چند لمحے پہلے اگر وہ کسی کی شدید مخالفت کر رہی ہوتی دوسرے ہی لمحے وہ اس کی ہمدردی میں مری جا رہی ہوتی۔

سحرش ارباب بیگ جو بہت لاپروا اور لاابالی سی تھی یہ اس نے مرتضیٰ کی آنکھوں میں زل کے لیے جو جذبہ محسوس کیا تھا وہ کسی نے نہیں کیا تھا حتیٰ کہ اس کی بے حد ہوشیار ماں اور خالہ تائی نے بھی نہیں۔ اور اسے مہرین بے حد پیاری تھی، وہ اس کی کزن ہی نہیں دوست بھی تھی اور مہرین کے دل میں جو مرتضیٰ کے لیے تھا بھلا اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

سو اس نے ضروری سمجھا تھا کہ زل کو خبردار کر دے لیکن زل کے لیے نہیں مہرین کے لیے اور کچن کے پاس کھڑی زل نے، سیڑھیوں کی طرف دیکھا لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی یہ سحرش بھی

ناخوامخواہ فلاسفر بننے کی کوشش کرتی ہے...... نہیں جانتی کہ میرا آزین پر یقین ایسے ہی ہے جیسے خود پر۔

سر جھٹک کر وہ بی بی اماں کی طرف دیکھنے لگی جو ڈیوڑھی کے دروازے سے اندر آرہی تھیں۔ لیکن کیا آزین بھی اس کے لیے اتنا ہی پر یقین ہوگا۔ اس نے خود سے پوچھا۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آزین نو سال کی عمر میں جس کا اعتبار اور یقین اس طرح ٹوٹا تھا کہ پھر کبھی جڑ نہ سکا۔

کبھی اس سے بدگمان نہیں ہوگا۔ وہ کچھ الجھی سی بی بی اماں کے قریب آنے کا انتظار کیے بغیر کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

منیرہ اور نوراں حویلی کے اندرونی حصے میں کچن کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ صحن کی صفائی کر کے فرش دھو دیا تھا اور درختوں کے گرے ہوئے پتے اکٹھے کر کے بخشو کے حوالے کیے تھے تاکہ وہ کھاد تیار کرنے کے لیے باغ کے گڑھے میں دفن کردے سو باہر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ اندر آکر بیٹھ گئی تھیں۔

صفورا، ثمینہ اور ثمرہ گھر پر نہ ہوتیں تو کام بھی زیادہ ہوتا۔ گھر میں اختر بانو اور ان کے علاوہ صرف ملازم تھے۔

''اماں آج بڑی بی بی سے پوچھ کر گھر نہ چلے جائیں کام تو کوئی ہے نہیں۔ کتنے دنوں سے میں نے تیلیاں پھنسا کر رکھی ہیں۔ الٰہی بخش ... نے ازار بند کے لیے۔ آج چلے جائیں گھر تو میں شام تک بنا لوں۔''

منیرہ آزاد فضاؤں کی عادی تھی، رحیم یار خان کے چک لی سات چھیاسی میں اس نے ایسی غلامی والی زندگی نہیں گزاری تھی۔ تھے تو وہ غریب ہی لیکن کسی کی نوکری نہیں کرتے تھے۔ اپنا گھر تھا اپنی مرضی سے کام کرتے تھے۔ مرد کھیتوں میں اجرت پر کام کرتے تھے اور عورتیں گھروں میں ہی ازار بند بناتیں۔ کھجور کے پتوں کی چنگیریں اور ٹوکریاں وغیرہ دوسوتی اور چار سوتی کی چادروں پر کڑھائی کرتیں۔ غرض گھر میں بیٹھ کر کرنے کا جو بھی کام ہوتا تھا کر لیتی تھیں۔ یہ پابندی والی زندگی اسے گراں گزرتی تھی۔ اس لیے اکثر بخشو سے کہتی تھی۔

''الٰہی بخش میری بات سن۔ ہمارے گاؤں چلتے ہیں۔ وہاں کٹائی اور بوائی کے وقت کھیتوں میں کام کرنا۔ اناج کے ساتھ اجرت بھی ملے گی پھر میں بھی کام کراؤں گی تو کچھ رقم جوڑ کر چھوٹی سی کریانے کی دکان کھول لینا۔ نہ کسی کی غلامی نہ پابندی ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے رہو۔'' لیکن بخشو سے پہلے اس کے باپ دادا نے بھی ایسی ہی زندگی گزاری تھی سو وہ اس کا عادی تھا ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا۔

''کیا پتا کوئی کام پڑ جائے۔''

نوراں لکیر کی فقیر تھی۔ اسے منیرہ کی باتیں عجیب ہی لگتی تھیں۔

''اماں!''

منیرہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا شاید وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ ماسی تاج نے کچن کے دروازے سے جھانک کر نوراں کو مخاطب کیا۔

''نوراں! چراغ سائیں دودھ لینے گیا تھا باڑے سے آتا ہی ہوگا۔ تم ایسا کرنا لے کر کاڑھ (ابال) دینا۔ میں ذرا بھاگی کو دیکھ لوں رات سے تپ (بخار) چڑھا ہے۔''

وہ واپس کچن میں چلی گئی تو نوراں نے جتاتی نظروں سے منیرہ کو دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو دیکھا کام پڑ گیا نا۔ ماسی تاج کچن کے پچھلے دروازے سے نکل کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی تھی نوراں کھڑی ہو گئی۔ منیرہ ایسے ہی بیزار سی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ تب ہی چراغ سائیں کی مدھم آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی سی اس کے کانوں میں پڑی تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''اماں، یہ چراغ سائیں ہمیشہ ایک ہی بول کیوں گاتا ہے۔''

اور نوراں کا جواب سنے بغیر بتانے لگی۔

''پتا ہے اماں کل میں قمری کے گھر گئی تھی تو میں نے دیکھا چراغ سائیں باڑے کے باہر بیٹھا تھا اور اس کے پاس کپڑے کی بنی ہوئی ایک (گڑیا) تھی۔ بڑی میلی کچیلی سی۔ اس کے بالوں کے دھاگے بھی جو کبھی کالے رہے ہوں گے مٹیالے ہو رہے تھے۔ کیا چراغ سائیں پاگل ہے اماں۔''

''نہیں...... بس صدمہ دل میں بیٹھ گیا ہے اس کے۔''

نوراں نے نفی میں سر ہلایا اور چراغ سائیں کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔

''بابل میری گڑیاں تیرے گھر رہ گیاں۔''

نوراں دودھ لینے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

اختر بانو نے اپنے کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں [illegible] کی طرح آج بھی چراغ سائیں کی آواز میں اسے آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی تھی، اس کے اندر کن من کن من ہونے لگی تھی اور اسے لگا تھا جیسے وہ اندر سے پوری بھیگ گئی ہو۔

چراغ سائیں کی آواز آنا بند ہوئی تو وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی، جب سے اماں نے لاہور لے کر جانے کا کہا تھا ایک ایک لمحہ گزارنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

ثوبان شاہ اور ثمرہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ اور پتا نہیں وہ کب واپس آئیں گے۔ شاید آج کل میں آجائیں، وہ وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے دیکھنے لگی کہ کون کون سے ساتھ لے کر جاؤں۔ اب جاؤں گی تو ہفتہ بھر تو ضرور رہوں گی ماں کو کہوں گی اپنے بابا سے اجازت لے لے۔

بیٹوں کی کسی بھی بات سے وہ انکار نہیں کرتے۔ میں پوچھوں تو شاید کہہ دیں دو تین دن بعد واپس آجانا۔ وہ ہینگر ادھر ادھر کرتے ہوئے سوچ رہی تھی جب نوراں نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''آجاؤ۔'' نوراں نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

''بی بی جی وہ لاہور سے آپ کے مہمان آئے ہیں۔ آپ کے میکے والے۔''

''کیا'' وہ حیران سی نوراں کو دیکھنے لگی۔

''جی وہ لاہور سے آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

نوراں نے اپنی بات دہرائی تو کتنی ہی دیر تک اسے یقین ہی نہیں آیا اور پھر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر پہلے برآمدے اور پھر صحن میں آئی تھی۔

''اختر...... بانو...... میری بچی۔''

جہاں زیب بیگ بے اختیار ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھے تھے اور پھر تو جیسے [illegible] بند ٹوٹ گئے تھے جہاں زیب بیگ کے سینے سے لگ کر وہ اتنا روئی کہ منیرہ اور نوراں کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ جہاں زیب بیگ نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے الگ کیا تو وہ دونوں بھی دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ شاید انہیں بھی میکے کی یاد نے رلا دیا تھا۔

''پھپھو جانی، ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ ایک نظر کرم ادھر بھی۔''

آزین سنجیدہ مزاج تھا لیکن ماحول کی اداسی دور کرنے کے لیے قدرے شوخی سے بولا تھا۔

''مری جان! آزین۔''

وہ اب آنسو پونچھ رہی تھی۔

''یہ۔''

آزین نے زمل کی طرف اشارا کیا۔

''پہچانا اسے۔''

''کیوں نہیں پہچانوں گی، میرے زیبی بھائی اور مریم بھابی کی راج دلاری میری زمل شہزادی ابا کی بابا الملوک۔'' وہ اب اسے گلے لگائے پیار کر رہی تھی۔

''یہ تو اب بالکل مریم بھابی کی طرح لگنے لگی ہے میں نے جب آخری بار دیکھا تھا تو دبلی پتلی اور شرمیلی سی تھی۔ مشابہت تو خیر تب بھی تھی مریم بھابی

pklibrary.com

سے لیکن اب تو ایسا لگتا ہے جیسے مریم بھابی کو دیکھ رہی ہوں۔"

نوراں کے ساتھ کھڑی منیرہ بہت دلچسپی اور شوق سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ میرے ابا جان...... اور یہ بھتیجا اور بھتیجی ہیں۔"

اختر بانو نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں نے سر جھکا کر سلام کیا اور ان کا سامان اٹھا کر گیسٹ روم میں لے گئیں، انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ کیا کرنا ہے۔ اختر بانو ان سب کے ساتھ سٹنگ میں آ گئیں۔

"ابا جان! آج آپ کتنے سالوں بعد میرے گھر آئے ہیں۔ آپ کو یاد ہے جب آپ آخری بار آئے تھے تو ریحان صرف دو ماہ کا تھا اور اب اپنی تعلیم مکمل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر ہے آپ نے بھلا دیا مجھے۔ میں نہیں آ سکتی تھی جلدی جلدی آپ جانتے تھے نا پھر بھی آپ بھی نہیں آئے۔ کیا میری یاد نہیں آتی تھی کیا ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔"

اختر بانو کو شکوے کی عادت نہ تھی لیکن بے اختیار ہی لبوں سے نکل گیا تھا۔

"آپ سب نے مجھے چھوڑ دیا ابا جان!" آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"کبھی کسی نے میری خبر نہیں لی، بیس سال میں نہ جاؤں تو وہاں سے کوئی نہیں آتا۔ ارباب بھائی۔ بڑے بھائی، شاہ زیب بھائی ظفر بھائی کوئی بھی نہیں۔ جو ہوا اس میں بھلا میرا کیا قصور تھا کہ سب نے مجھے چھوڑ دیا اکیلا کر دیا۔ کیوں ابا جان کیوں۔"

اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ جہاں زیب بیگ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ آنسوؤں نے ان کی آنکھیں دھندلا دیں۔ ان کے پاس اختر بانو کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگے۔ رشتے ناطے تو نصیبوں کی بات ہوتی ہے۔ گلہ تو انہیں سلطان شاہ کے والد اور بھائیوں سے تھا۔ پھر انہوں نے اپنی بیٹی کو کیوں اکیلا کر دیا تو انہیں اپنی بیٹی کی غمی خوشی میں شریک ہونا چاہیے تھا اس کی خبر رکھنی چاہیے تھی۔ یہ غلطی تو ان سے ہوئی تھی۔

جس طرح انکار سن کر وہ یہاں سے گئے تھے پھر ان کا دل ہی نہ چاہا آنے کو وہ توہین جو انہوں نے تب محسوس کی تھی۔ وہ احساس دل سے بھی گیا ہی نہیں۔ حالانکہ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ اس گھر میں ان کی بیٹی بھی ہے۔ بیاہی بیٹیوں کو یوں تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے میکے والے تو ان کا مان ہوتے ہیں اور جب میکے سے کوئی نہ پوچھے تو یہ مان ٹوٹ جاتا ہے۔ بیٹی اپنی ہی نظروں میں سسرال میں بے وقعت ہو جاتی ہے۔

"سوری بیٹا۔" انہوں نے اختر بانو کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور آزین نے اس کے گرد اپنے بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اب دیکھیے گا میں اتنے چکر لگاؤں گا کہ آپ کہیں گی زین میاں اب بس کر دو، جان چھوڑو۔"

آزین اپنی فطرت کے خلاف باتیں کرتا ہوا دل کو اچھا لگا تھا کہ اس کے پیچھے جو جذبہ تھا وہ قابل تحسین تھا۔

"کبھی نہیں۔"

اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔

"سال کے تین سو پینسٹھ دن تم آؤ تو وہ ہر دن میرے لیے عید ہوگا، تمہیں کیا پتا زین میں اپنوں کی شکلیں دیکھنے کو کتنا ترسی ہوں۔"

تب ہی منیرہ ٹھنڈا ٹھار خوشبودار صندل کا شربت لے آئی۔

"سنو ماسی تاج اور بھاگی سے کہو جلدی سے ناشتہ تیار کریں۔"

منیرہ شربت سرو کر کے جانے لگی تو اختر بانو نے اسے روکا۔

"نہیں پھپھو، ناشتہ تو ہم نے حیدر آباد اسٹیشن پر کر لیا تھا۔

ہاں صرف چائے کا ایک ایک کپ پی لیں گے۔"

pklibrary.com

زمل نے تائیدی نظروں سے جہاں زیب بیگ اور آزین کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی سر ہلا دیئے۔

"ہاں بیٹی! صرف چائے لیں گے۔ رات کا سفر تھا۔ صبح صبح حیدرآباد پہنچے تھے تو ناشتہ تو وہاں کرلیا تھا۔ اب چائے پی کر کچھ دیر آرام کریں گے۔"

جہاں زیب بیگ نے کافی عرصہ بعد طویل سفر کیا تھا تو تھکاوٹ محسوس کررہے تھے۔

منیرہ بات سمجھ کر چلی گئی تھی۔ اور جہاں زیب بیگ اب اختر بانو سے ثوبان اور بچوں کے متعلق پوچھنے لگے تھے۔

"ثوبان تو کراچی گئے ہوئے ہیں، نعمان تو مہران بھائی کے ساتھ ہی مہران ٹیکسٹائل مل کا کام سنبھالے ہوئے ہے۔ ایک دو ماہ بعد چکر لگاتا ہے اور ریحان کا بھی ہاؤس جاب ہوگیا تھا۔ آج کل دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی طرف گیا ہوا ہے۔ وہ بھی زیادہ تو کراچی میں رہتا ہے۔ پہلے پڑھائی کے سلسلے میں اور اب وہاں رہ کر پارٹ ون کی تیاری کررہا ہے۔ البتہ مانی کچھ دیر پہلے ہی ناشتہ کر کے نکلا ہے۔ ساتھ والے گوٹھ میں اس کا دوست رہتا تو کبھی کبھار اس کی طرف چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر تک آجائے گا۔" اختر بانو نے تفصیل سے بتایا۔

"اور شا....."

لفظ ان کے ہونٹوں پر ہی آکر دم توڑ گئے۔ آنکھوں سے کرب جھانکنے لگا تھا اختر بانو کے لبوں سے بھی سسکی سی نکلی۔

"اور سب لوگ مطلب ثمرہ آپا، عفورا اور ثمینہ بھابھی بھی اپنے بچوں کے ساتھ اپنے اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔" اختر بانو جانتی تھی وہ کس کے متعلق پوچھتے پوچھتے رک گئے ہیں۔

"اور آپ اب اتنے سالوں بعد آئے ہیں تو کچھ دن تو رکیں گے ہی نا۔"

"ہاں دو تین دن۔" جہاں زیب بیگ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"صرف دو تین دن۔" لہجے میں حسرت تھی اور سوالیہ نظریں جہاں زیب بیگ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"بڑھاپے میں کسی دوسری جگہ سکون نہیں ملتا اختر بانو، مجھے تو کبھی اوپر تمہارے بھائیوں کی طرف جانا پڑے تو کچھ ہی دیر بعد دل گھبرانے لگتا ہے۔"

جہاں زیب نے حقیقت بیان کی تھی کہ بڑھاپے میں، آدمی کو اپنے ہی ٹھکانے پر سکون ملتا ہے۔

"دراصل دادا جان کے کمرے میں وہ جو کتابوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے وہ کہیں دوسری جگہ تو نہیں ہوتی نا۔ آپ کو پتا ہے دادا جان اور یہ خاتون۔" اس نے زمل کی طرف اشارہ کیا۔

"مل کر کتابوں کی مرمت کررہے ہیں۔ اتنی پرانی اور بوسیدہ کتابیں پھپھو! کئی بار مشورہ دے چکا ہوں کہ روڈی میں دے دیں۔" آزین ماحول کی اداسی محسوس کررہا تھا اس لئے اپنی سی کوشش کررہا تھا ماحول کو خوش گوار بنانے کی اور کافی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

اس دوران چائے بھی مع لوازمات کے آگئی تھی اور چائے کے ساتھ آنے والے لوازمات کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے بہت باتیں ہوئیں۔ جہاں زیب کی کتابوں سے لے کر بی اماں اور شیخ بابا تک کی باتیں۔

کئی بار اختر بانو اور جہاں زیب بیگ کی آنکھیں نم ہوئیں اور کئی بار کسی خوش گوار یاد نے ان کے لبوں پر مسکراہٹ بھی بکھیری۔ جی تو کسی کا بھی اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ سالوں کی تھکی تھکنوں میں کہاں ختم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ سفر کر کے آئے تھے، خاص طور پر جہاں زیب بیگ بے حد تھکے اور نڈھال لگ رہے تھے۔ انہیں سلطان شاہ بھی یاد آرہا تھا۔ جب جب وہ یہاں آتے تھے کیسے کھل اٹھتا تھا اور کھلے بازوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کرتا تھا۔ کیسا پیارا اور دلربا شخص تھا وہ بھی۔

''ابا جان۔ زمل۔ زین آپ لوگ کچھ دیر آرام کرلیں۔ فریش ہوں پھر ان شاء اللہ بہت باتیں ہوں گی۔''

اختر بانو کو ہی جہاں زیب بیگ کی تھکن کا خیال آیا تھا اور وہ ان تینوں کو گیسٹ روم میں چھوڑ کر خود کچن میں آ گئی تھی تاکہ اپنی نگرانی میں دن کے کھانے کی تیاری کروا سکے۔

کچھ دیر آرام کرنے اور نہانے کے بعد جب وہ کھانے کی ٹیبل پہ آئے تھے تو بالکل تازہ دم تھے، کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔

''امان جب اپنے دوست کی طرف جائے تو کھانا کھا کر ہی آتا ہے۔''

اختر بانو نے انہیں بتایا تھا۔ سو کھانے کی میز پر اختر بانو کے علاوہ وہ تینوں ہی تھے۔

کھانا کھانے کے بعد، وہ سٹنگ میں قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ثوبان شاہ بھی آ گئے لیکن ثمرہ اور شایان ان کے ساتھ نہیں تھے، اختر بانو نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اگر شایان بھی آ جاتا تو جہاں زیب اپنی بے تابی اور بے قراری کیسے چھپا پاتے اگرچہ زبان سے کچھ بھی نہ کہتے لیکن نگاہیں ضرور راز عیاں کر دیتیں۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے کہ یہ بے تابی ثمرہ کے بیٹے کے لیے نہیں اختر بانو کی اولاد کے لیے ہے۔

ثوبان شاہ نے اسے سختی سے کہہ رکھا تھا کہ شایان کو کبھی معلوم نہ ہونے پائے کہ تم اس کی ماں ہو۔ شاید اسی خوف سے کہ کہیں وہ اپنی ممتا سے مجبور ہو کر شایان کو بتا ہی نہ دے، ثمرہ زیادہ تر حیدر آباد ہی رہتی تھی اور شایان کی ساری تعلیم بھی حیدر آباد میں ہوئی تھی، حالانکہ میٹرک تک لڑکوں کے لیے گورنمنٹ کا اسکول تھا اور اس ہائی اسکول کی پڑھائی اچھی تھی۔ ابتدائی تعلیم تو سب نے یہاں ہی حاصل کی تھی بعد میں نعمان اور ریحان کو ایبٹ آباد بھیج دیا گیا تھا، البتہ امان نے میٹرک اسی اسکول سے کیا تھا جبکہ شایان کو ثمرہ نے نرسری سے ہی حیدر آباد بھیج دیا تھا۔

ثوبان شاہ، جہاں زیب بیگ کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ چھبیس سال پہلے جب وہ یہاں سے مایوس ہو کر گئے تھے تو پھر کبھی نہیں آئے تھے۔ تاہم وہ بڑی گرم جوشی سے ان سے ملے تھے۔ زمل اور آزین سے بھی بڑی شفقت سے ملے تھے اور جہاں زیب سے ملتے ہوئے انہیں اپنے بابا سلطان شاہ بے حد یاد آئے تھے کہ یہ جہاں زیب بیگ تھے جو سلطان شاہ کے دل کے بے حد قریب تھے۔ جب انہوں نے ثوبان شاہ سے اختر بانو کی بات کی تھی تو کہا تھا۔ ''جہاں زیب مجھے بے حد عزیز ہے وہ میرے لیے سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہے میرے اندر کے سارے خلا پر کرنے والا میرا یار۔ اور اس کی بیٹی مجھے سلطانہ کی طرح ہی پیاری ہے۔ تم کبھی اختر بانو کو تکلیف نہ دینا اور کبھی اس کا دل نہ دکھانا وہ بہت معصوم اور کم عمر ہے۔ میرے یار نے اپنے خاندان والوں کی مرضی نہ ہونے کے باوجود مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا میرا مان رکھا اور اپنی ہیرے جیسی بیٹی میرے حوالے کی اور اب تمہیں میرا مان رکھنا ہے۔ اختر بانو کی بہت قدر کرنا وہ بہت بڑے دل والے باپ کی بیٹی ہے۔ اور جہاں زیب کی بھی ہمیشہ اس طرح عزت کرنا جیسے میری کرتے ہو۔''

انہوں نے ایک نظر اختر بانو پر ڈالی، جو بظاہر اپنے والد کے آنے سے بہت خوش نظر آ رہی تھی لیکن اس کی سرخ آنکھیں اور سوجے ہوئے پپوٹے بتا رہے تھے کہ وہ روتی رہی تھی۔ یقیناً اتنے سالوں بعد باپ سے ملاقات نے رلا دیا ہوگا۔ اداسی کا ایک غبار سا جو ہمیشہ اس کے وجود کو اپنے ہالے میں لیے رکھتا تھا اس وقت بھی، اس کے وجود کے گرد حصار بنائے ہوئے تھا۔

دل ہی دل میں نادم ہوتے ہوئے انہوں نے جہاں زیب بیگ سے کہا۔

''چچا جان! اب آپ آئے ہیں تو کچھ دن رہیے گا۔ جب بابا زندہ تھے تو تب آپ کتنا آیا کرتے تھے۔''

''ہاں تب..... لیکن..... اب وہ شاخ نہ رہی

جس پہ آشیانہ تھا۔" انہوں نے آہستگی سے کہا اور لب بھینچ لیے۔

"بابا نہیں تھے لیکن آپ کی بیٹی تو تھی نا آپ کے نواسے تھے لیکن آپ تو ان سے بھی کبھی ملنے نہیں آئے۔"

بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا اور اختر بانو نے بھی ایک شاکی نظر ان پر ڈالی تو ایک تاسف سا ان کی آنکھوں سے جھلکنے لگا۔

"ہاں کوتاہی ہوگئی ثوبان میاں! بڑی کوتاہی لیکن اب نہ تو گزرا ہوا وقت واپس آسکتا ہے اور نہ اس کی تلافی ہوسکتی ہے۔" دکھ ان کے لہجے سے جھلکتا تھا۔ انا کے ہاتھوں کبھی کبھی انسان اپنے کتنے پیاروں سے رابطے توڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

ثوبان شاہ نے ان کے دکھ کو محسوس کیا۔ کوتاہی تو ان سے بھی ہوئی تھی، وہ بھی تو اختر بانو کو سالوں بعد جانے کی اجازت دیتے تھے اور خود تو کبھی گئے ہی نہیں تھے۔ اختر بانو پر ایک نظر ڈال کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چچا جان، میں سفر سے آیا ہوں۔ فریش ہو کر آتا ہوں۔"

انہوں نے اجازت طلب نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ہاں..... ہاں بیٹا جاؤ۔" جہاں زیب بیگ کی نظروں نے انہیں حصار میں لیا۔ گزرے وقت نے ثوبان شاہ کی شخصیت کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا۔ وہ شان دار شخصیت اور مضبوط بیگ گراؤنڈ کے مالک تھے۔ ان میں وہ سب کچھ تھا جس کی خواہش کوئی بھی لڑکی کرسکتی تھی لیکن اختر بانو خوش نہیں تھی۔ چپ اور خاموش سی اختر بانو جب جب میکے آتی اس کے نامعلوم آنسوؤں کو انہوں نے اپنے دل پر گرتے محسوس کیا تھا۔

دیکھنے والے اسے خوش قسمت سمجھتے تھے لیکن وہ جانتے تھے وہ خود کو ایسا نہیں سمجھتی۔ ایک بار میمونہ نے کہا تھا۔

"اختر بانو تو پوری جاگیردارنی لگتی ہے حویلی کی مالکہ، اتنے نوکر ملازم سب پر حکم چلاتی کتنی خوش قسمت ہے نا۔ سب کچھ ہی تو ہے اس کے پاس۔"

لیکن سب کچھ نے میری بیٹی کی ہنسی چھین لی ہے۔ اس کی آنکھوں کی جوت چرالی ہے۔ کیسی جگمگ کرتی تھیں اس کی آنکھیں..... اور اب یہ ہی بات زمل اس سے کہہ رہی تھی۔

"پھپھو! آپ تو پوری جاگیردارنی لگ رہی ہیں۔ وہ کہانیوں اور ڈراموں والی جاگیردارنی۔"

ادھر ادھر کام والیوں کو ہدایات دیتے، مردانے ملازموں کو کھانا بھجواتے زمل نے جو محسوس کیا تھا کہہ دیا تھا اور وہ ہولے سے ہنس دی تھی۔

اس ہنسی میں نہ جانے کتنی کرچیاں چھپی تھیں اور ان کرچیوں کی چبھن کو جہاں زیب بیگ نے اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔ ایک بار یہ بات مونا بھابھی نے بھی کی تھی اور تب اس نے سوچا تھا کاش وہ اتنے بڑے گھر میں بیاہ کر نہ آتی۔ اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا۔ وہاں ہی اپنے میکے گھر کے آس پاس وہ جلدی جلدی اپنے کام نبٹا کر بھاگ کر اپنے میکے جاتی۔ اس کے بچے اس کے پاس ہوتے وہ ان کی پسند کے کھانے بناتی۔ انہیں اپنے پاس لٹا کر کہانیاں سناتی وہ کہانیاں جو اس نے اپنی دادی اور اماں سے سنی تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں نا پھپھو۔"

زمل نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"شاید" ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور اس نے سوچا تم کیا جانو زمل ایک جاگیردارنی کے مقابلے میں ایک عام عورت ہونا زیادہ خوش نصیبی ہے۔ تب ہی امان شاہ اندر داخل ہوا۔

"یہ منیرہ کیا کہہ رہی ہے اماں جانی!"

جہاں زیب بیگ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے تھے، یہ امان شاہ تھا ان کا نواسہ انہوں نے کئی سال پہلے جب اسے دیکھا تھا تو وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ تب

اختر بانو ہفتہ بھر وہاں ٹھہری تھیں اور اس ایک ہفتے میں وہ ان سے بے حد مانوس ہو گیا تھا۔

''یہ امان ہے نا'' اس کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے انہوں نے سوالیہ نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا۔

'ہنڈرڈ پرسنٹ میں امان شاہ اور آپ نانا جان'' وہ ان کے پھیلے بازوؤں میں سما گیا انہوں نے بھی اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

''اماں جان کہتی ہیں میں بالکل اپنے ماموں جان کی طرح ہوں۔ کیا سچ میں۔''

اس میں شاہ زیب کی بے حد مشابہت تھی۔

''ہاں سچ تم زیبی سے بہت مشابہ ہو۔'' انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوما آزین نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''ایک ذرا نظر کرم ادھر بھی عزیز من۔''

''آپ''

وہ ان سے الگ ہو کر اب اس سے گلے مل رہا تھا۔

''میں آزین ظفر یاب'' اس نے اپنا تعارف کروایا اور پھر زمل کی طرف اشارہ کیا۔

''اور یہ زمل شاہ زیب۔''

تب ہی ثوبان شاہ فریش ہو کر آ گئے اور انہوں نے بتایا کہ وہ کراچی سے سیدھے گھر آئے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ کراچی سے کچھ اور لوگ بھی آئے تھے، اس لئے وہ حیدر آباد نہیں گئے تھے۔ مہمانوں کو وہ ڈیرے کے مہمان خانے میں ٹھہرا کر حویلی آئے تھے۔ اختر بانو ان کے لیے چائے بنوانے کے لیے اٹھی تو زمل بھی ان کے ساتھ ہی کچن میں چلی آئی اور ثوبان شاہ، آزین اور جہاں زیب بیگ سے باتیں کرنے لگے۔

ثوبان شاہ نے جہاں زیب بیگ کو بہت عزت دی اور زیادہ تر حویلی پر میں ہی رہے جبکہ ڈیرے پر ان کے ساتھ کراچی سے آنے والے مہمان بھی تھے۔ انہیں بار بار سلطان شاہ کی ہی باتیں یاد آتی تھیں، وہ اکثر کہتے تھے ثوبان شاہ میں نہ بھی رہوں تو بھی میرے یار کی اتنی ہی عزت کرنا جتنی میری کرتے ہو۔ اختر بانو کے ساتھ کبھی ناانصافی نہ کرنا، کبھی زیادتی نہ کرنا اور انہوں نے ثمرہ کے ساتھ شادی کر کے اختر بانو کے ساتھ کتنی زیادتی کی تھی اور پھر انصاف بھی نہ کر سکے تھے۔ اس نے نہ کوئی اعتراض کیا تھا نہ گلہ۔

لیکن اس کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی وہ جھرنوں جیسی ہنسی کہیں کھو گئی تھی اور یہ شاید احساس ندامت ہی تھا کہ انہوں نے جہاں زیب بیگ کا بہت خیال رکھا تھا اور مزید رکنے کے لیے اصرار بھی کیا تھا۔

لیکن وہ لوگ تین دن سے زیادہ نہیں رک سکتے تھے کہ یہاں سے واپس جا کر اگلے ہی دن آزین کو اپنی جاب کے سلسلے میں اسلام آباد انٹرویو دینے جانا تھا۔ انٹرویو کے لیے لیٹر اسے روز ملا تھا جب وہ حیدر آباد کے لیے، ٹرین میں سیٹیں بک کروا چکے تھے ورنہ انٹرویو کے بعد ہی حیدر آباد کا پروگرام بناتے۔ حیدر آباد سے آگے انہیں بذریعہ بس یا ویگن کا سفر کرنا تھا ان کا پروگرام، تین دن سے زیادہ رہنے کا نہیں تھا بلکہ جہاں زیب بیگ نے تو یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ اگر ثوبان شاہ کا رویہ اچھا نہ ہوا تو وہ ایک دن کے بعد ہی واپس آ جائیں گے لیکن اپنی اس سوچ کے متعلق انہوں نے آزین یا زمل سے ذکر نہیں کیا تھا۔ اور اب جب ثوبان شاہ نے جس طرح انہیں، عزت و احترام دیا تھا اگر آزین کے انٹرویو کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ ایک دو دن مزید رک جاتے۔

اختر بانو بہت اداس تھی۔ دو دن جیسے خواب کی طرح گزر گئے تھے۔ رات کا کھانا کھاتے ہوئے جب جہاں زیب بیگ نے بتایا کہ کل دوپہر، وہ یہاں سے چلے جائیں گے کہ انہوں نے حیدر آباد سے سات بجے ٹرین پکڑنی تھی۔

''ڈرائیور اکرم آپ کو حیدر آباد چھوڑ آئے گا۔ ویسے تو میں خود آپ کو چھوڑ آتا لیکن مجھے صبح اپنے مہمانوں کو لے کر سائیں بیدار بخت کے گوٹھ میں ملاقات کے لیے جانا ہے کہ یہ دراصل ان سے ہی

ملاقات کی غرض سے آئے تھے لیکن سائیں بیدار بخت ملاقات کا وقت نہیں دے رہے تھے۔ اپنی کچھ نجی مصروفیات کی وجہ سے۔'' ثوبان شاہ نے ادب سے معذرت کی تو وہ بے اختیار بولے۔

''نہیں بیٹا، کوئی بات نہیں۔ ہم تو بس یادِ دین سے بھی چلے جاتے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے چچا جان۔'' ثوبان شاہ مدھم سا مسکرائے۔

''گھر میں گاڑی اور ڈرائیور موجود ہے۔ مجھے جانا نہ ہوتا تو میں اور اختر بانو حیدر آباد تک آپ کے ساتھ جاتے۔''

اختر بانو نے حیرت سے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔ کتنا عرصہ ہوگیا تھا اسے ثوبان شاہ کے ساتھ کہیں باہر گئے۔ دل کا گداز آنکھوں میں نمی بن کر چمکا اور ثوبان شاہ کی نظروں نے اسے جیسے اندر تک کھوج لیا۔ اندر ہی اندر وہ نادم سا ہوئے شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ اختر بانو کے ساتھ اکثر یوں ہی بے مقصد لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے تھے۔

''ابا جان! آپ زمل کو چھوڑ جائیں نا یہاں کچھ دن میرے پاس، کتنے سالوں بعد میں اس سے ملی ہوں۔'' اختر بانو نے نگاہیں جھکا کر آنکھوں کی نمی چھپائی تھی۔

''ہاں چچا جان! زمل بیٹی کو چھوڑ جائیں۔ میں اور اختر بانو خود اسے لاہور چھوڑ جائیں گے اسی بہانے سب سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔''

ثوبان شاہ نے پھر اختر بانو کو حیران کیا تھا۔ لیکن وہ ثوبان شاہ کی طرف دیکھنے کے بجائے، سوالیہ نظروں سے جہاں زیب بیگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''زمل سے پوچھ لو کیا کہتی ہے وہ.....'' انہوں نے زمل کی طرف دیکھا زمل یہاں آکر بہت خوش تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ لاہور سے باہر کسی دوسرے شہر آئی تھی۔ اس نے منیزہ کے ساتھ جاکر تقریباً وہ سارا علاقہ دیکھ لیا تھا۔ آزین کے ساتھ جاکر ڈھیروں تصویریں بھی بنائی تھیں۔ اور صبح ناشتے کے بعد اس کا پروگرام آموں کے باغات دیکھنے جانا تھا۔ لیکن ایک دو دن مزید رکنے کی خواہش کے باوجود وہ نہیں رک سکتی تھی کہ اسے شاہ زیب کا خیال پریشان کرتا تھا۔ پتا نہیں ابا نے کھانا بھی صحیح طرح سے کھایا ہوگا یا نہیں۔ گو وہ بی بی اماں کے علاوہ شیخو بابا کو بھی تاکید کرکے آئی تھی کہ وہ بطور خاص ان کا خیال رکھیں۔ دن میں ان کی خیر خبر لینے کے علاوہ رات کو ان کے کمرے میں ہی سویا کریں کہ بی بی اماں، جب رات کو دوا کھا کر سوتی تھیں تو ان کی نیند بہت گہری ہوتی تھی اور خدانخواستہ اگر کبھی رات میں ابا کی طبیعت خراب ہوجائے تو۔

''رک جاؤ نا ملی۔'' اختر بانو نے کہا تو وہ چونکی۔

''آپ کو پتا ہے نا ابا کا۔ پتا نہیں بی بی اماں ان کا صحیح طرح سے خیال بھی رکھ پاتی ہوں گی یا نہیں۔ جب سے ابا کی یہ حالت ہوئی ہے میں سوائے یونی ورسٹی کے کہیں نہیں گئی۔ پہلی بار اس طرح اتنے دنوں کے لیے گھر سے باہر ہوں۔ آپ آئے گا نا ماں بھائی اور انکل کے ساتھ اور بہت سارے دن رہے گا۔ آئیں گے نا آپ۔''

اس نے بات کرتے کرتے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا تو وہ شفقت سے مسکرائے۔

''ہماری بیٹی نے دعوت دی ہے تو ضرور آئیں گے ان شاء اللہ۔''

تب ہی ان کا فون آگیا تو وہ معذرت کرتے ہوئے، ڈائننگ روم سے باہر نکل گئے تو اختر بانو ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''مانی بیٹا! صبح ذرا جلدی اٹھ جانا ناشتے کے بعد زمل اور زین کو آم کے باغات دکھالانا۔ تمہارے بابا نے کہہ تو دیا ہے اکرم سے لیکن تم اپنی نگرانی میں آم کی پیٹیاں گاڑی میں رکھوا دینا۔''

''آپ بے فکر رہیں اماں جان..... میں آپ کی پیٹیاں ٹرین میں بھی رکھوادوں گا کیونکہ میں اکرم کے ساتھ خود بھی نانا جان کو چھوڑنے حیدر آباد تک

جاؤں گا۔"

امان بہت بچپن میں کہیں اختر بانو کے ساتھ لاہور آیا تھا۔ تب زمل خود بھی اتنی بڑی نہیں تھی کہ اسے یاد رہتا کہ تب امان کیسا تھا لیکن اب امان اسے اچھا لگا تھا مخلص، بے تکلف اور خوش اخلاق سا۔ بالکل چھوٹے بھائی جیسا لگا تھا۔ وہ تقریباً دو سال اس سے چھوٹا تھا اس کا یہاں آنے سے پہلے خیال تھا کہ پھپھو کے بچے۔ بہت مغرور اور اکڑو سے ہوں گے لیکن امان سے مل کر اس کا خیال بدل گیا تھا۔ ریحان اور نعمان کیسے تھے یہ تو ان سے ملنے کے بعد ہی پتا چلتا تھا۔

"اور مجھے وہاں حیدر آباد اسٹیشن سے چوڑیاں بھی لینی ہیں سحرش کے لیے۔ کیا آپ کو پتا ہے امان کہ وہ کہاں سے ملیں گی۔"

"سحرش نے بطور خاص فرمائش کی تھی۔"

"یہ کون ذات شریف ہیں؟"

امان ابھی سب ماموں زاد، بہن بھائیوں کے متعلق نہیں جانتا تھا۔

"ارباب چچا کی بیٹی ہیں اور ان کا مشغلہ ٹیرس پر لٹک کر ہماری جاسوسی کرنا ہے۔"

"بطور خاص آپ کی جاسوسی"

امان مسکرایا۔

"نہیں نیچے والوں کی۔"

چلیں کبھی لاہور آئے تو سب سے ملاقات ہوگی۔ بلکہ میرا ارادہ تو پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کرنے کا ہے۔ اپلائی کر رکھا ہے۔" اس نے بتایا تو جہاں زیب بیگ یک دم خوش ہو گئے تھے ایڈمیشن کے سلسلے میں کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔ میرے کچھ کولیگز اور جاننے والے ہیں وہاں اب بھی۔"

"مجھے یہ تو پتا تھا کہ آپ پڑھاتے تھے لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ پنجاب یونی ورسٹی میں پڑھاتے تھے۔"

امان کو اتنا ہی پتا تھا کہ نانا کا تعلق تعلیم کے شعبے سے تھا۔

"پہلے گورنمنٹ کالج میں پڑھاتا تھا پھر پنجاب یونی ورسٹی میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے ہی ریٹائرڈ ہوا۔ تم نے کس سبجیکٹ میں اپلائی کیا ہے۔"

امان انہیں بتانے لگا کہ اس نے کس مضمون میں اپلائی کیا ہے اور مستقبل میں کیا پروگرام ہے اس کا۔

اختر بانو اور زمل انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ زمل نے اختر بانو سے ان کی شادی کی البم دیکھنے کی فرمائش کی تھی اور اختر بانو نے ڈنر سے پہلے البم ڈھونڈ کر رکھی تھی۔ زمل کو بہت اشتیاق تھا سب کی تصویریں دیکھنے کا۔

تصویریں دیکھ کر وہ سونے کے لیے چلی گئی تھی کہ آزین نے کہا تھا کہ صبح جلدی اٹھیں گے اور وہ امان کے ساتھ صبح صبح قریبی گوٹھ میں فوٹو گرافی کے لیے جائے گا۔ واپس آ کر ناشتہ کر کے پھر آموں کا باغ دیکھنے جائیں گے اور پھر عصر سے پہلے ہی انہیں حیدر آباد کے لیے نکلنا تھا۔ آزین کو فوٹو گرافی کا شوق تھا اور جہاں کہیں جاتا اپنا کیمرہ ضرور لے کر جاتا تھا۔

سو صبح وہ نماز کے بعد سوئی نہیں تھی، بھاگی نے بیڈ ٹی کمرے میں ہی پہنچا دی تھی آزین اور امان چائے پی کر نکل گئے تھے لیکن واپسی میں انہیں دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اختر بانو سے اجازت لے کر منیرہ کے ساتھ باغات دیکھنے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو ثمرہ لاؤنج میں بیٹھی اپنی ملازمہ سے پاؤں دبوا رہی تھی اس نے لاؤنج کے کھلے دروازے سے دیکھا۔

"یہ کون ہیں۔" اس نے کچن کی طرف جاتی نوراں سے پوچھا۔

"یہ چھوٹی بی بی ہیں اپنے میکے گئی ہوئی تھیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی ہیں۔"

نوراں نے بتایا اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی تھی جو وہ شاید کچن میں رکھنے جا رہی تھی۔

"اچھا پھپھو کی دیورانی ہیں۔ چھوٹی یا بڑی۔"

وہ ابھی تک لاؤنج کے باہر کھڑی تھی۔

"نہ جی نہ یہ تو....." منیرا نے نوراں کی طرف دیکھا۔

''اپنے ثوبان شاہ جی کی دوسری بیوی ہیں۔ عمر میں تو اپنی بانو بی بی سے کافی بڑی ہیں لیکن شاہ جی نے ان سے شادی، بعد میں کی تھی اس لیے سب انہیں چھوٹی بی بی کہتے ہیں۔''

''مطلب'' زمل حیران ہوئی تھی۔

''پھپھو کی''

''ہاں'' اب کے نوراں نے جواب دیا تھا۔

''چھوٹی بی بی آپ کی پھپھو کی سوکن ہیں۔''

اس نے ایک اذیت سی محسوس کی۔ ''بھلا پھپھو میں کیا کمی تھی جو ثوبان انکل نے دوسری شادی کرلی۔''

''کمی تو کوئی نہیں تھی پر ثمرہ بی بی، شاہ جی کے تایا کی بیٹی ہیں اور خاندان میں ان کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں تھا تو بڑے شاہ جی نے شاہ جی سے کہا کہ انہیں ہی ثمرہ بی بی سے شادی کرنا ہے۔ مہران شاہ اور زمان شاہ ایک تو چھوٹی بی بی سے کافی چھوٹے تھے دوسرا ان کے رشتے پہلے سے طے تھے اور شاہ جی بس سال بھر ہی چھوٹے تھے بی بی سے۔''

نوراں بتا کر کچن میں چلی گئی۔ وہ چند لمحے یوں ہی کھڑی رہی تب ہی تو پھپھو کی آنکھوں میں ایک اداسی سی مستقل ٹھہری ہوئی سی لگتی ہے اور دادا جان نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ..... اور وہ لاؤنج میں جانے کے بجائے گیسٹ روم کی طرف چلی گئی۔ اور منیرہ اندرونی گیٹ کھول کر باہر صحن میں چلی گئی تاکہ صحن کی صفائی کرسکے ابھی اس نے جھاڑو اٹھایا ہی تھا کہ بیرونی گیٹ کھول کر شایان اندر داخل ہوا۔ غیر ارادی طور پر منیرہ نے اپنا دوپٹا درست کیا۔

''ہے منیرہ، ادھر آؤ بات سنو۔''

شایان اندر جانے کے بجائے صحن میں ہی رک گیا تھا۔

''وہ لڑکی کون ہے جس کے ساتھ تم باغات کی طرف سے آرہی تھیں۔ اور وہ تمہارے ساتھ ہی حویلی میں آئی ہے۔''

''جی بڑی بی بی کی بھتیجی ہیں۔ لاہور سے آئی ہیں۔ بڑی بی بی کا بھتیجا اور ان کے والد بھی آئے ہوئے ہیں۔'' منیرہ نے نظریں جھکائے جھکائے ادب سے جواب دیا۔

''اچھا پہلے تو یہ لوگ کبھی نہیں آئے۔'' شایان حیران ہوا۔

''جی بی بی جی بتا رہی تھیں، بہت عرصہ بعد آئے ہیں۔ انہیں بھی میکے گئے بہت عرصہ ہوگیا تھا سو ملنے چلے آئے۔'' منیرہ کی نگاہیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''کمال ہے کیسے لوگ ہیں، کبھی بیٹی سے ملنے ہی نہیں آئے۔'' شایان بڑبڑایا اور وہاں سے ہی واپس پلٹ گیا۔ وہ حیدر آباد سے ثمرہ کے ساتھ ہی واپس آیا تھا لیکن باہر مردانے میں ہی اسے بخشو سے پتا چلا تھا کہ ثوبان شاہ ڈیرے پر گئے ہیں اور وہاں سے ہی اپنے مہمانوں کو لے کر، سائیں بیدار بخت کی طرف چلے جائیں گے اسے اپنے دوست کے لیے سفارش کروانی تھی، جس نے مہران ٹیکسٹائل مل میں جاب کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ اور اسے بابا سے کہنا تھا کہ وہ آج ہی مہران چاچو کو فون کر کے اس کے دوست کے لیے کہہ دیں، اس سے پہلے کہ وہاں کسی اور کو رکھ لیا جائے۔

ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر آموں کے باغات کی طرف سے آتی ہوئی لڑکی پر پڑی، حویلی میں کام کرنے والی منیرہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ نہ جانے کس بات پر ہنس رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر چونکا تھا۔

''یہ لڑکی کون ہے۔ نہ منیرہ کی برادری کی لگتی ہے نہ یہاں کی رہنے والی پھر کون ہے۔'' اسے لڑکیوں سے دوستیاں کرنا ان سے فلرٹ کرنا اور بے وقوف بنا کر انجوائے کرنا پسند تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ ڈیرے پر جانے کے بجائے واپس مڑ کر منیرہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ اپنی ہی حویلی تک آیا۔ وہ لڑکی اور منیرہ اندر داخل ہوگئیں۔

شاید کوئی نئی ملازمہ یا پھر کوئی مہمان ہے۔ وہ

سوچتا ہوا اندر داخل ہوا تو صحن میں ہی منیرہ اسے جھاڑو اٹھائے نظر آ گئی اور پھر منیرہ سے معلومات لے کر وہ واپس مڑ گیا کہ اس کا آج ہی بابا سے ملنا ضروری تھا۔ خیر واپس آ کر تفصیلی ملاقات ہوتی ہے۔

''کافی خوب صورت لڑکی ہے اور اس کی ہنسی تو غضب کی ہے جیسے جھرنے بہتے ہوں۔ خیر میں بھی شایان شاہ ہوں اور آج تک شایان شاہ کو کوئی لڑکی رد نہیں کر سکی۔ تو پھر یہ لڑکی بھی۔'' اس نے خود سے کہا اور دائیں ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھے سے دائیں مونچھ کو عادتاً مڑوڑتے ہوئے اس لڑکی کو پٹانے کے منصوبے بنانے لگا لیکن اس کے سارے منصوبے خاک میں ہی دم توڑ گئے جب رات کھانے کی ٹیبل پر صرف گھر کے ہی افراد تھے۔ وہ ڈیرے سے واپس گھر آنے کے بجائے ثوبان شاہ کے ساتھ ہی سائیں بیدار بخت کی طرف چلا گیا تھا کہ اس کا بیٹا حیدر آباد کالج میں اس کا ہم جماعت تھا اور اچھی خاصی دوستی تھی۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ اختر بانو کے عزیز واپس چلے جائیں گے تو وہ کبھی ثوبان شاہ کے ساتھ نہ جاتا۔

اس نے ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا اور اختر بانو سے پوچھا۔

''آپ کے مہمان کیا کھانا نہیں کھائیں گے۔''

اختر بانو نے حیران ہو کر دیکھا وہ بہت کم ہی اس سے مخاطب ہوتا تھا۔

''میرے مہمان''

''جی وہ منیرہ بتا رہی تھی کہ لاہور سے آپ کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''ہاں'' اختر بانو کو اس کا استفسار اچھا لگا تھا۔ ''وہ میرے ابا جان، بھتیجا اور بھتیجی آئے ہوئے تھے۔ آج واپس چلے گئے ہیں۔ ابا جان کو تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔''

وہ بے اختیار ہی کہہ گئی ثمرہ نے برا سا منہ بنایا اور پیشانی پر ناگواری سے شکنیں سی پڑ گئی تھیں۔

''مجھ سے ملنے کا شوق تھا انہیں'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں دراصل صرف مانی سے ہی ان کی ملاقات ہو سکی تھی تو وہ تم چاروں بھائیوں سے ملنا چاہتے تھے۔ ریحان اور نعمان بھی یہاں نہ تھے۔''

اس نے سٹپٹا کر پہلے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا اور پھر شایان کی طرف۔

''میرے ہوش میں آپ کے ابا جان وغیرہ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔'' اس نے اپنی مایوسی چھپانے کی کوشش کی تھی۔

''ویسے اب کس سلسلے میں آنا ہوا ان کا۔''

''کس سلسلے کا کیا مطلب۔ وہ اختر بانو کے میکے والے ہیں بغیر وجہ کے بھی بیٹی سے ملنے آ سکتے ہیں۔''

ثمرہ کو اس کا اس طرح مسلسل اختر بانو سے بات کرنا پسند نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں آ تو سکتے ہیں لیکن پہلے کبھی آئے جو نہیں جیسے باقی سب آتے رہتے ہیں۔ ثمینہ اور صفورا چچی کے میکے والے میرے نانکے کبھی یوں ہی ملنے کسی موقع پر۔''

اس نے چاول کی ڈش اپنی طرف کھسکائی۔

''دراصل ایک مقصد تو اماں جان سے ملنا تھا کہ انہیں اپنے میکے گئے تقریباً چھ سال ہو گئے ہیں۔''

اماں نے ایک جتاتی نظر ثوبان شاہ پر ڈالی۔

''اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ میرے ماموں زاد بھائی اور بہنوں کی شادی ہے تو وہ دعوت دینے آئے تھے کہ ہمیں شادی میں شامل ہونے کے لیے تیار رہنا ہے۔''

''کب ہے شادی۔'' شایان اب اماں سے پوچھ رہا تھا۔

''ابھی تاریخ طے نہیں ہوئی ہے شاید ڈیڑھ دو ماہ تک ہو۔''

اماں نے ثمرہ بیگم کی ناگواری محسوس کر لی تھی اس لیے، بات ختم کرنے کی کوشش کی اور اختر بانو کی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالے۔

''آپ کچھ لے نہیں رہیں اماں جان۔''

اس کی عادت تھی کہ کھانا کھاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اپنے ہاتھ سے اس کی پلیٹ میں ڈالتا رہتا تھا۔

''شادی ڈیڑھ دو ماہ بعد ہے اور دعوت دینے ابھی آئے ہیں لگتا ہے کوئی ناراضی وغیرہ تھی شادی سے پہلے صلح، مطلب راضی کرنے آئے تھے۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''لگتا ہے آپ اور بابا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں گے اور آپ نے اپنے والدین کی مرضی کے بغیر بابا سے شادی کی ہو۔'' اس نے اختر بانو کی طرف دیکھا۔ جس کا رنگ یک دم سرخ ہوا تھا۔

''شایان'' ثوبان شاہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''تم کچھ زیادہ ہی بے باک ہو گئے ہو۔''

''ظاہر ہے امان کی والدہ ہمارے خاندان کی نہیں غیر خاندان سے ہیں تو خیال آ گیا'' امی جان اکثر کہتی رہتی ہیں کہ وہ سید خاندان کی نہیں۔ بہر حال اگر آپ کو اور بڑی امی کو برا لگا ہو تو سوری۔''

وہ کچھ منہ پھٹ اور بے باک تھا لیکن ثوبان شاہ سے بہر حال ڈرتا تھا۔

''یہ شادی خالص تمہارے دادا جان کی خواہش پر ہوئی تھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو شادی سے پہلے دیکھا تک نہ تھا۔''

''ایک بار پھر سوری بڑی امی!''

اس نے معذرت طلب نظروں سے اختر بانو کی طرف دیکھا۔ اختر بانو نے سر کی جنبش سے اس کی معذرت قبول کی۔

''یہ رواج ہے میری جان، اپنے عزیزوں رشتہ داروں کو ایک دو ماہ پہلے ہی دعوت دی جاتی ہے کہ انہیں شادی میں شامل ہونا ہوگا تیاری رکھیں۔ باقاعدہ دعوت پھر تاریخ طے ہونے پر دی جاتی ہے۔''

ثمرہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا لیکن وہ سر ہلا کر پھر اختر بانو کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''کیا یہ دعوت صرف آپ لوگوں کو ہے یا ہمیں بھی ہے۔''

''صرف ہم لوگوں کو کیوں سب کو ہے۔ ابا جان نے تمہاری پھپھو اور تمہارے چچا وغیرہ کا فون نمبر لے کر انہیں بھی دعوت دی ہے۔'' اختر بانو نے بتایا۔

''اوہ اچھا پھر تو میں ضرور جاؤں گا۔ مجھے پنجاب کی شادی دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔''

''ضرور۔''

شایان کی بات پر جہاں اختر بانو کی آنکھوں میں جگمگاہٹ سی پیدا ہوئی تھی۔ وہاں ثمرہ بیگم کی آنکھیں بجھ سی گئی تھیں اور شایان ان سب سے بے نیاز ہو کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

کیونکہ اب وہ مطمئن تھا کہ شادی میں وہ اس لڑکی کو جو پہلی نظر میں اسے اچھی لگی تھی اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی لڑکی شایان شاہ سے ملے اور اس کی اسیر نہ ہو۔ اسے زعم تھا لیکن نہیں جانتا تھا زلل شاہ زیب وہ لڑکی نہیں ہے۔

☆☆☆

''زیب النساء!''

ماسٹر عبدالعزیز برآمدے میں چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور سامنے ہی کرسی پر زیب النساء دونوں ہاتھ گود میں دھرے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں۔

''تیری اماں نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ بھلا کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔ کیا اسے پتا نہیں تھا کہ ہم دونوں اس کے بغیر کیسے جئیں گے۔ ہمیں تو عادت ہی نہیں ہے اس کے بغیر جینے کی۔ پر اس نے کچھ نہیں سوچا اور وہ چلی گئی ہمیں اکیلا اور تنہا چھوڑ کر۔''

زیب النساء نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے تھے اور یہ آنکھیں تو ایک سال سے گیلی ہی رہنے لگی تھیں، جب سے زہرا بتول نے خاموشی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ تب سے یہ آنکھیں خشک ہوئی ہی نہیں تھیں۔

ایک سال دس دن ہو گئے تھے زہرا بتول کو رخصت ہوئے، لیکن ابھی تک ان آنکھوں کو خشک ہونا نہیں آیا تھا۔

''ایسا لگتا ہے زیب النساء، جیسے ہمارا سب کچھ

کھو گیا ہو خالی ہاتھ رخصت ہوئی تھی لیکن لگتا ہے جیسے سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی۔ ہماری خوشی، ہماری ہنسی، کتنا سنسان، کتنا ویران سا لگتا ہے نا یہ گھر اس کے بغیر۔ بھلا کوئی اتنی جلدی کرتا ہے زیب النساء جتنی جلدی تمہاری اماں نے کی۔"

عبدالعزیز سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

"جس طرح اچانک میری زندگی میں آئی تھی اس طرح اچانک چلی بھی گئی، کم از کم میرے آنے کا انتظار تو کر لیتی نا۔"

گلہ کرتی نظریں زیب النساء کی طرف اٹھیں۔

"پر میرا انتظار بھی نہیں کیا اور چلی گئی۔ چلو میرا نہ سہی تمہارا ہی خیال کر لیتی..... اٹھتے بیٹھتے تمہاری شادی کا ذکر کرتی رہتی تھی تو کم از کم تمہاری شادی تک تو نہ جاتی۔"

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ زہرہ بتول کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ایک سال دس دن ہو گئے تھے اور اس ایک سال دس دن کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب ماسٹر عبدالعزیز نے زیب النساء سے زہرا کی باتیں نہ کی ہوں۔ وہ اسکول سے آ کر برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتے اور زیب النساء کو کام کرتے دیکھتے ہوئے باتیں کرتے رہتے۔ زیب النساء خاموشی سے سنے جاتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے۔

"جانتی ہو نا زیب النساء تمہاری اماں کتنا کم بولتی تھی۔ بس سنتی رہتی تھی۔ پھر بھی کیسا بارونق سا لگتا تھا گھر بھرا بھرا سا اب کیسا خالی خالی اور بے رونق سا ہو گیا ہے گھر ساری رونق تو پری اماں ساتھ ہی لے گئی زیب النساء۔"

انہوں نے ایک نظر زیب النساء کی طرف دیکھا جس کے رخسار بھی اب گیلے ہو رہے تھے اور وہ انہیں ہاتھوں کی پشت سے پونچھتی جاتی تھی۔ ان کا حلق بھی نمکین ہونے لگا۔ ان کے آنسو ان کے اندر گر رہے تھے۔

"پتا ہے زیب النساء تمہاری اماں بڑی صابر، بڑی عاجز اور مسکین سی تھی درویش فطرت، نہ کوئی مطالبہ، نہ کوئی خواہش نہ کوئی فرمائش میں کہتا زہرا بتول کبھی تو کوئی فرمائش کیا کرو۔ بتایا کرو کیا جی چاہتا ہے تمہارا۔ کچھ تو کہا کرو۔ کہتی کیا کہوں سب کچھ تو بن کہے مل جاتا ہے۔ میں تو کوئی ایسی نیک صالح نہیں تھی۔ پر اللہ نے مجھے ایک انعام کی طرح آپ کا ساتھ دیا۔"

بس اس کے بعد کوئی اور چاہ ہی نہیں سوائے اس کے کہ میری ذات سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ کیا ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں دنیا میں زیب النساء تمہاری ماں جیسی نہیں نا۔ بس اسی لیے اللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اور اب وہاں جنت میں اپنے حامد کے ساتھ خوش خوش گھومتی ہو گی۔ پر اس نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا زہرا۔ بھلا کوئی ایسا بھی کرتا ہے اپنے پیاروں کے ساتھ۔"

حلق میں گرنے والے آنسو آنکھوں میں امڈ آئے۔

"آپ کے لیے کھانا لاؤں ابا۔ میں نے ماش کی دال پکائی ہے۔" زیب النساء ابا کے رونے سے خوف زدہ ہو جاتی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے زیب النساء بیٹی! تم کھا لو۔"

انہوں نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا۔

"بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے ابا!"

زیب النساء نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھا۔

"اچھا چل لے آ۔ دونوں تھوڑا تھوڑا کھا لیتے ہیں۔"

تقریباً روز ہی ایسا ہوتا تھا۔ بھوک تو کسی کو بھی نہ ہوتی لیکن دونوں ایک دوسرے کی خاطر کھا لیتے۔

"ارے ہاں زیب النساء! میں تمہارے لیے کالج میں ایڈمیشن لینے کے لیے فارم لایا ہوں۔ نیاز بھائی سے منگوائے ہیں۔"

کھانا کھاتے ہوئے عبدالعزیز کو یاد آیا۔
''ایک سال تو ضائع ہو گیا تمہارا اب اس سال تمہارا ایڈمیشن کروادوں گا۔''
''نہیں'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''میں نے اب اور نہیں پڑھنا۔''
''کیوں'' ماسٹر عبدالعزیز کو حیرت ہوئی۔
''تمہیں تو بہت شوق تھا پڑھنے کا اور تم اپنی فاطمہ باجی کی طرح لیکچرار بننا چاہتی تھیں۔''
''فاطمہ باجی تو شادی کے بعد اب لاہور چلی گئی ہیں۔ میں نے تو ان کے پاس ہی رہ کر پڑھنا تھا تو اب کہاں رہوں گی بھلا۔'' اس نے نہ پڑھنے کا جواز ڈھونڈا۔
''چھٹی نہ ہو تو..... ہوسٹل میں رہو گی تم اور کہاں۔ میں نے تو پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ تمہاری فاطمہ باجی نے تو بعد میں تمہیں کہا تھا کہ تم ان کے پاس رہنا۔''
ماسٹر عبدالعزیز کی تو شروع سے ہی خواہش تھی کہ وہ اسے ماسٹر کروائیں گے۔ خود انہوں نے بی اے۔ بی ایڈ کیا تھا لیکن زیب النساء کو تو انہوں نے ایم۔اے کروانا تھا وہ بھی انگلش میں۔ پر زیب النساء نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پڑھنے کے لیے، رحیم یار خان یا صادق آباد نہیں بھی نہیں جائے گی۔ اسے ابا کو اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ ابا اس کے جانے کے بعد تنہا گھر میں کس سے باتیں کریں گے۔
وہ ابھی تک اماں کی جدائی کے غم سے باہر نہیں نکلے تھے۔ وہ بھی چلی گئی تو تنہائی انہیں مار ڈالے گی۔ پھر ان کے کپڑے کون دھوئے گا کھانا کون پکائے گا۔ اسے خود بھی بہت شوق تھا پڑھ کر فاطمہ باجی کی طرح لیکچرار بننے کا لیکن ابا آپ کچھ بھی کہیں، کتنا بھی مجبور کریں اس نے سوچ لیا تھا وہ کہیں نہیں جائے گی بس۔
''ابا میں نے کہا نا میرا جی نہیں چاہتا اب پڑھنے کا بس۔'' اس نے کھانے کے برتن سمیٹے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''علم حاصل کرنا تو بہت سعادت کی بات ہوتی ہے زیب النساء۔''
''ماسٹر عبدالعزیز کو اس کی بات سن کر افسوس ہوا تھا۔''
''جی ابا'' وہ برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔
اور جب ماسٹر عبدالعزیز سمجھا سمجھا کر تھک گئے تو اس کے لیے کتابیں لے آئے۔
''ٹھیک ہے گھر میں پڑھ کر امتحان دے دینا۔ آسان سے مضامین کی کتابیں لایا ہوں۔ میں خود بھی پڑھا دیا کروں گا۔ پڑھائی اچھی چیز ہوتی ہے زیب النساء ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علم حاصل کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔''
''جی ابا! گھر میں پڑھ لوں گی۔''
اور ماسٹر عبدالعزیز نے سوچا چلو بارہ جماعتیں پڑھ لے پھر تب تک کچھ نہ کچھ حوصلہ ہو ہی جائے گا۔ جانتے تھے زہرا بتول کی بیٹی ہے اور ان کی وجہ سے ہی نہیں جانا چاہتی کہ وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ پگلی نہ ہو تو آخر جب اس کی شادی کروں گا تب بھی تو اکیلا ہی رہ جاؤں گا۔
لیکن شادی بھلا اس پورے چک میں کون ہے جو میری زیب النساء کے لائق ہو جسے اپنی بیٹی کا رشتہ دے کر دل مطمئن ہو۔ اور زہرا بتول کو آپا رسولاں کا بیٹا بہت پسند تھا۔ پر تب مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی چلی جائے گی اور مجھے وعدے کی زنجیر میں جکڑ جائے گی۔ میں نے تو اپنی زیبی کے لیے بڑے اونچے خواب دیکھ رکھے تھے۔ اسے پڑھاؤں گا جتنا وہ پڑھے گی۔ پروفیسر بنے گی اور پھر میں اس کی شادی کسی بہت پڑھے لکھے شخص سے ہی کروں گا۔ لیکن انسان کے ارادے اور خواب۔
بھاول پور جانے سے پہلے زہرا نے کیسے ان سے وعدہ لیا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ زیب النساء کی جلدی شادی کر دیں گے اپنی شادی سے پہلے وہ تو تیاری کیے بیٹھی تھی آخری سفر کی مجھے ہی سمجھ نہیں آئی اور میں وعدہ کر بیٹھا۔

اور اپنی شادی وہ دل ہی دل میں ہنستے۔ میں بھلا کیوں شادی کروں گا۔ زہرا بتول کے بعد بھلا مجھے کوئی اس جیسی مل سکتی ہے۔ اور مل بھی جائے تو وہ زہرا بتول تو نہیں ہو سکتی نا..... اور یہ زہرا بتول تو بس ایسی ہی بھلی باتیں کرتی رہتی تھی۔ حامد کی وفات کے بعد کتنی بار اس نے کہا تھا ماسٹر جی آپ کا دل تو چاہتا ہوگا نا کہ آپ کا بھی بیٹا ہو۔ تو آپ دوسری شادی کر لیں۔ میں خود آپ کو اجازت دے رہی ہوں نا۔

بڑی آئی اجازت دینے والی حاتم طائی کی کہی۔

وہ اس سے ناراض ہو جاتے۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی زندگی میں تو کیا مرنے کے بعد بھی دوسری شادی کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ لیکن زیب النساء کی شادی کے لیے تو انہیں کوئی اچھا رشتہ دیکھنا چاہیے۔ زندگی کا کیا بھروسہ انہیں بھی زہرا بتول کی طرح، اچانک کچھ ہو گیا تو میری زیب النساء تو اکیلی رہ جائے گی۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی تو نہیں۔ زہرا صحیح ہی تو کہتی تھی کہ میری زیبو کو جلد ہی اپنے گھر کا کر دیجیے گا تب ایک روز وہ استانی جی کے گھر چلے گئے انہیں لگا تھا کہ استانی جی ضرور ان کی زیب النساء کے لیے کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ دیں گی۔ ان دنوں وہ اس کی پڑھائی کا بھول کر ہر وقت اس کی شادی کے متعلق سوچتے رہتے تھے۔

"آپا جی!"

انہوں نے استانی جی سے دل کی بات کی تھی۔

"زہرا اس طرح اچانک چلی گئی ہے کہ دل ڈرنے لگا ہے۔ میں چاہتا ہوں اپنی زندگی میں ہی اسے اپنے گھر کا کر دوں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہو تو زیب النساء کے لیے۔"

"فکر نہ کریں ماسٹر صاحب۔" استانی جی نے انہیں تسلی دی تھی۔

"ان شاء اللہ اچھا رشتہ مل جائے گا میں فاطمہ سے بھی کہوں گی کہ اپنے سسرال میں زیب النساء کے لیے کوئی رشتہ دیکھے۔ ہماری زیب النساء لاکھوں میں ایک ہے۔ اتنی حسین پھر اتنے گنوں والی مجھے اپنی فاطمہ کی طرح ہی عزیز ہے اور جب تک اچھا رشتہ نہیں ملتا آپ اس کی پڑھائی کی طرف دھیان دیں۔ ایف۔ اے تو خیر پرائیویٹ ہی کر لے۔ لیکن بی۔ اے کے لیے کالج میں داخل کروا دیجیے گا۔ اس اثنا میں اگر مطلب کا رشتہ مل گیا تو ٹھیک، ورنہ پڑھتی رہے گی۔ میں لڑکیوں کے لیے تعلیم کو بہت ضروری سمجھتی ہوں ماسٹر صاحب۔ اگر میرے والد صاحب نے مجھے تعلیم نہ دلوائی ہوتی تو فاطمہ کے والد کی وفات کے بعد فاطمہ کی۔ اس طرح پرورش نہ کر سکتی جس طرح کی۔ میکے میں بھائی بھی تھے اور انہوں نے کہا بھی کہ وہ میری اور فاطمہ کی کفالت کریں گے لیکن میری فاطمہ ساری زندگی ان کے سامنے جھکی نظروں کے ساتھ زندگی گزارتی۔

تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کے رشتے کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اور اسے پڑھنے دیں۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ یہ نہیں کہ زہرا کا غم دل میں ختم ہو گیا ہے لیکن صبر اور حوصلہ آ گیا ہے۔ زیب النساء اب اس طرح روتی بلکتی نہیں ہے، جیسے دو سال پہلے تڑپتی تھی اور اب دل لگا کر پڑھ بھی رہی ہے۔ دو تین ماہ تک امتحان ہو جائے گا۔ اس کا تو پھر دیکھتے ہیں کچھ لیکن ماسٹر صاحب شادی جلدی کرنے کے چکر میں کسی ایرے غیرے کو زیب بٹی کا ہاتھ نہ تھما دیجیے گا۔" اور ماسٹر صاحب بہت مطمئن ہو کر گھر آئے تو گھر میں ماسی نور بھری بتاشوں اور مٹھائی کا تھال لیے بیٹھی تھی۔

"یہ کیا" انہوں نے میز پر پڑے تھالوں کی طرف اشارہ کیا۔

"دو سال ہو گئے زہرا کو گزرے تو میں تو بھئی اپنے اسلم کی بات پکی کرنے آئی ہوں۔ زہرا سے زبانی بات تو ہوئی تھی میری۔" خوشی سے چہکتے ہوئے ماسی نور بھری نے کہا تو وہ ہکا بکا سے اسے دیکھنے لگے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

سالگرہ

مہوش نذیر

آج عالیہ بہت خوش تھی۔ سالن پکاتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ روٹیاں پکاتے ہوئے بھی گرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی اور تو اور کام ختم کر کے پنکھا چلاتے ہی جب بجلی چلی گئی تو بھی کوفت کا شکار نہیں اس کے خوش ہونے کی وجہ بظاہر عام سی لیکن اس کے لیے بہت خاص تھی۔ آج اس کی کمیٹی نکلی تھی۔ اوران پیسوں سے وہ اپنی چارسالہ پرانی خواہش پوری کرنا چاہتی تھی۔

اس کی شادی پہ اسے نقلی زیورات پہنائے گئے تھے۔ تو بس ایک سونے کے لاکٹ کا بہت شوق تھا۔ حماد نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے جلد سونے کا لاکٹ بنوا کر دے گا۔ حماد کی نوکری میں، اتنی بچت ہی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس دور میں سونا خرید سکیں۔ آہستہ آہستہ یہ خواہش اس کے دل میں جڑ پکڑ گئی۔

ثنا بھابھی (نند بھی اور بھابھی بھی کیونکہ ان کا وٹہ سٹہ تھا) کے مشورے سے آٹھ ماہ پہلے کمیٹی ڈالی تھی۔ جو کہ آج کھلی تھی اور یہی سوچ کر وہ بہت خوش ہو رہی تھی کہ اب وہ لاکٹ خریدے گی۔ اسی ماہ کی پندرہ تاریخ کو ان کی شادی کی چوتھی سالگرہ تھی اور اسی دن لاکٹ پہن کر حماد کو سرپرائز دینے کا سوچا۔

ارادہ تو اس کا یہ تھا کہ لاکٹ خریدنے کے بعد بچ جانے والی رقم سے وہ حماد کے لیے تین چار شرٹس لے گی اور ایک پرتکلف سے کھانے کا بھی اہتمام کرے گی۔ انہی سوچوں میں گم شام کے چھ بج گئے۔ اور اسے یاد آیا کہ حماد تو تین ساڑھے تین بجے تک آجاتا تھا اور اگر کبھی کوئی اور ضروری کام ہو تو وہ اسے کال کر دیتا تھا۔ اسی لمحے ساری خوشی پریشانی میں بدل گئی۔ کال کی تو نمبر بند ملا۔ ابھی وہ عاصم بھائی کو کال کر رہی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ فوراً کھولنے گئی سامنے حماد تھکا ہارا کھڑا تھا۔ جلدی سے اسے ٹھنڈا پانی دیا۔

”کیا ہوا حماد! آج اتنی دیر لگا دی آنے میں۔ اور میرا فون بھی نہیں اٹھایا۔ سب خیریت تو تھی نا؟“ جیسے ہی اس کے اوسان بحال ہوئے تو پوچھا۔

”ابھی میں، عاصم بھائی کو کال کرنے ہی والی تھی۔“

"ہونا کیا تھا۔ واپسی پہ آدھے راستے میں بائیک خراب ہوگئی پاس کوئی مکینک بھی نہ تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ دھکیل کر مکینک کے پاس پہنچا۔ اس نے دو گھنٹے مرمت میں لگا دیے اور ساڑھے چار ہزار کا بل الگ بنا دیا۔ ابھی بھوک اور تھکن سے برا حال ہے جلدی سے کھانا دو پھر میں آرام کرتا ہوں۔"

حماد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ عالیہ کو اس کی یہ بات بہت پسند تھی وہ جتنا بھی پریشان ہو۔ اس پہ بلاوجہ غصہ نہیں کرتا تھا۔ وہ جلدی سے کھانا گرم کرنے لگی۔

اسے حماد پہ ترس بھی آرہا تھا۔ بے چارہ کافی عرصے سے موٹر سائیکل کی وجہ سے پریشان تھا۔ لیکن نئی موٹر سائیکل کی گنجائش نہیں نکل رہی تھی۔ تنخواہ مناسب تھی۔ لیکن مہنگائی کی بدولت گزارہ مشکل سے ہی ہوتا تھا۔ کمیٹی بھی اس نے اپنے جیب خرچ اور بھائی جو اسے جیب خرچ دیتے تھے۔ اس سے ڈالی تھی۔ آخر شوق بھی تو پورا کرنا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن پھر بائیک میں کوئی مسئلہ ہو گیا۔ حماد الگ پریشان ہو گیا۔

"حماد آپ ایسا کریں یہ بائیک بیچ کر نئی بائیک لے لیں۔ روز کی پریشانی سے جان چھوٹے گی۔"

عالیہ اب خود تنگ آ گئی تھی۔ وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ جب عالیہ نے مشورہ دیا۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔ لیکن یہ بیچ کر اور جو رقم میرے پاس موجود ہے۔ اس سے نئی بائیک نہیں آئے گی۔ جیسے تیسے اسی سے کام چلانا پڑے گا ایک دو مہینوں تک۔"

حماد نے کھانا ختم کیا۔ اور ہاتھ دھونے چلا گیا۔ پھر اس کے عشا کی نماز پڑھ کر آنے تک عالیہ نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ کمیٹی کے پیسوں سے نئی بائیک خریدے گی۔ اور اگر رقم کم پڑی تو وہ عاصم بھائی سے ادھار لے لے گی۔ اور وہ یقیناً انکار نہیں کریں گے۔ "ویسے بھی لاکٹ کا کیا ہے بعد میں بھی بنوالوں گی۔" یہ سوچتے ہوئے دل ایک لمحے کو عجیب اداس ہوا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ بائیک تو ضرورت کی چیز ہے۔ حماد کو بھی ہر روز پریشان نہیں دیکھا جاتا۔ آخر وہ میرے لیے ہی تو سارا دن محنت کر کے کماتے ہیں۔ کبھی ماتھے پر بل نہیں لاتے۔"

یہ سب سوچتے ہوئے اس کا دل اتنا ہلکا پھلکا ہو گیا کہ اس سے پہلے اسے اتنی خوشی کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ جب حماد نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ کہ وہ حماد کو اس سالگرہ پر بائیک گفٹ کرے گی۔ کیسے؟ یہ بھی اس نے سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

عاصم بھائی نے پہلی کال پر ہی فون اٹھا لیا۔ خیریت پوچھنے کے بعد خوشگوار لہجے میں فون کرنے کا مقصد پوچھا۔ انہیں اپنی یہ چھوٹی بہن بہت پیاری تھی۔

"بھائی! آپ سے ایک کام تھا۔ لیکن وعدہ کریں آپ انکار نہیں کریں گے۔"

"اب گڑیا اتنے مان سے کہہ رہی ہے تو ماننا تو پڑے گا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے سنیں پھر......" اس نے اچھی طرح انہیں اپنا منصوبہ بتایا۔

"لیکن بھائی، ثنا بھابھی سے آپ نے ذکر نہیں کرنا۔ میں سرپرائز دوں گی۔"

"گڑیا! تم کب سے اتنی سمجھدار ہوگئی ہو؟ مجھے تو پتا ہی نہ چلا۔" وہ حیرت سے کہہ رہے تھے۔

"لیکن مجھے خوشی ہے کہ میری بہن اتنے پیارے دل کی مالک ہے۔ اور تم بالکل فکر مت کرو۔ میں یہ سب اتنی رازداری سے کروں گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔" انہوں نے یقین دہانی کروائی۔

"اور اپنی بھابھی کی تو فکر ہی نہ کرو۔ اسے اتنی فرصت کہاں ان باتوں کی۔"

آخر میں ان کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔

"کیوں بھائی! اب پھر لڑائی ہوئی ہے آپ دونوں کے درمیان۔ سونی اور علی بھی پریشان ہوجاتے ہیں۔"

وہ فکرمندی سے بولی۔

"چھوڑو گڑیا یہ تو روز کی بات۔ بس تم بالکل فکر مت کرنا۔ تمہارا کام ہوجائے گا۔"

اب اسے سالگرہ کا انتظار تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ یہ سالگرہ بہت یادگار ہوگی۔ اور اس کا یقین بالکل درست تھا۔ یہ سالگرہ واقعی ہی یادگار ہونی تھی۔

☆☆☆

تین بج گئے تھے۔ عالیہ کھانا پکانے کے علاوہ سب کام مکمل کر چکی تھی۔ حماد نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ ایک دوست کی دعوت پہ چائے پینے اس کے گھر جا رہا ہے۔ خیر عالیہ کے لیے تو اچھا ہی تھا۔ جانتی تھی کہ حماد ظاہر نہیں کرتا لیکن اسے شادی کی سالگرہ یاد ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ شام کے بعد گھر آئے گا۔ جب سب تیاری مکمل ہو چکی ہوگی اور اس کے لیے تحفہ بھی لازمی لائے گا۔ چاہے گلاب کا ایک پھول ہی کیوں نہ ہو لیکن جو تحفہ وہ دینے والی تھی۔ وہ اس نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچ کر ابھی سے خوش ہو رہی تھی۔ جب حماد کی بے یقین اور خوشی سے بھرپور آنکھیں دیکھے گی۔

وہ کھانا پکانا شروع کر چکی تھی۔ سب سامان وہ ہمسائے کے حمزہ سے منگوا چکی تھی۔ سرپرائز دینے کے چکر میں اس نے سارا مینیو کینسل کر دیا اور اب صرف چکن پلاؤ اور کسٹرڈ بنا رہی تھی۔

مغرب تک اس نے سب کام مکمل کیا۔ حماد کا سوٹ وہ صبح ہی استری کر چکی تھی۔ اپنے لیے اس نے سیاہ نیٹ کا خوب صورت فراک منتخب کیا جو ایک دو دفعہ پہن چکی تھی۔ لائٹ سا میک اپ کر کے وہ فریش سی حماد کا انتظار کرنے لگی۔ دو دن سے حماد لوکل بس کا میں سفر کر رہا تھا۔ بائیک ورک شاپ پر کھڑی تھی۔

☆☆☆

کیک ٹیبل پر رکھ کر وہ حماد کو بلانے گئی۔ پندرہ منٹ پہلے ہی اس نے عاصم بھائی میسج کر دیا تھا۔ ابھی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی حماد جو فون پہ بات کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جلدی سے فون رکھا۔ عالیہ کو عجیب لگا کیونکہ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے آرام سے کوئی بھی بات کر لیتا تھا لیکن اس نے اسی وقت پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

حماد بھی پرفیوم چھڑک کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ابھی کیک کاٹا ہی تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

دونوں تیزی سے لپکے جیسے کہ دونوں کو معلوم ہو کہ کون آنے والا ہے۔

"السلام علیکم! اور دونوں کو ہی شادی کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔" بھائی اور بھابھی اکٹھے ہی بولے۔

"شکریہ بھائی، شکریہ بھابھی۔"

عالیہ انہیں راستہ دیتے ہوئے بولی۔

"عاصم بھائی، آپی میں کب سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔" حماد کا جوش دیکھنے والا تھا۔

"کیا مطلب! تمہیں کیسے پتا تھا۔ انہیں تو میں نے دعوت دی تھی۔"

عالیہ سوالیہ نظروں سے حماد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اچھا بھئی یہ بعد میں پوچھ لینا۔ ابھی تو جلدی سے چل کر کیک کھاتے ہیں۔"

عاصم بھائی نے انہیں مزید بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ سب نے خوشگوار ماحول میں کیک کھایا۔ عالیہ بار بار عاصم بھائی طرف دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے آنکھ سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ اور فون پہ کسی سے بات کی۔ دس منٹ بعد ہی پھر سے دروازے پہ دستک ہوئی۔ اب کہ بھائی نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ ایک نوجوان نئے ماڈل کی بائیک لے کر گھر میں داخل ہوا۔ حماد جلدی سے آگے آیا۔

"ارے بھائی کون ہو۔ یہ بائیک لے کے کیوں گھسے آ رہے ہو؟"

عاصم بھائی نے لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا۔

انہوں نے عالیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اب تمہیں عالیہ گڑیا بتائے گی۔" حماد حیران و پریشان سا کھڑا تھا۔

"حماد یہ میری طرف سے تمہارے لیے سالگرہ کا تحفہ۔ میری کمیٹی نکلی تھی۔ پہلے تو میرا ارادہ سونے کا لاکٹ خریدنے کا تھا لیکن پھر پرانی بائیک کی حالت اور تمہاری پریشانی دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی بائیک کے لیے رقم کم تھی۔ وہ میں نے بھائی جان سے ادھار لی ہے۔

تمہاری پرانی بائیک بیچ کر ہم ادا کر دیں گے۔
اور تمہیں سالگرہ کے ساتھ ساتھ نئی بائیک کی بھی بہت بہت مبارک ہو۔"
عالیہ کو وہ بچی خوشی مل رہی تھی کہ بیان سے باہر تھی۔ لیکن حماد..... حماد سے تو کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ ابھی بھی بے یقین نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"حماد! یہ لو۔"
بھابھی نے اپنے پرس سے ایک خوب صورت سا ڈبہ حماد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"عالیہ! تم نے تو مجھے آج بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ میں جو یہ سمجھ رہا تھا کہ میں دنیا کا سب سے اچھا شوہر ہوں۔ آج میں مان رہا ہوں کہ تم دنیا کی سب سے اچھی بیوی ہو۔ اور تمہیں بھی شادی کی سالگرہ اور ساتھ میں سونے کا لاکٹ بہت بہت مبارک ہو۔"
اس نے ڈبہ کھول کر عالیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
اور عالیہ کی بے یقین آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں چھلک پڑیں۔ بلاشبہ یہ تو وہی لاکٹ تھا۔ جو اس نے پچھلے مہینے بھابھی کے ساتھ جا کر پسند کیا تھا۔ خوب صورت، منفرد سا لاکٹ اور جس کے لیے اس نے کمیٹی کھلنے کا انتظار کیا تھا۔ اور آج وہ اس کے سامنے تھا۔ اس کا تھا۔
"لیکن حماد! یہ کہاں سے آیا؟ تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔" وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
"بائیک کی مرمت کروا کر میں نے مناسب داموں بیچ دی۔ اور کچھ میرے پاس سیونگ تھی۔ بائیک تو میں پھر بھی لے لوں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ خواہشوں کی مدت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ وقت پہ پوری نہ ہوں تو دل کا وہ حصہ خالی ہو جاتا ہے۔ اور پھر چاہے انسان کچھ بھی پالے وہ کبھی نہیں بھرتا۔ ضرورتیں تو کبھی بھی پوری ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے میں نے آپی سے تمہاری پسند پوچھی اور انہیں رقم دے کر عین موقع پر لانے کا منصوبہ بنایا۔ ابھی میں تھوڑی دیر پہلے انہیں ہی فون کر رہا تھا۔ لیکن عالیہ تمہاری قربانی کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔"
"نہیں حماد! میرے لیے تو یہ معمولی سی بات تھی۔ لیکن جو کچھ تم نے کیا وہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔" عالیہ بے خودی میں کہتی چلی گئی۔
"آج کے دور میں جو کچھ تم دونوں نے کیا۔ وہ ناقابل یقین ہے۔ اب تو سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان جتنے بھی اختلافات تھے۔ وہ تمہارے عمل سے بالکل ختم ہو گئے۔ اور ہم بھی عہد کرتے ہیں۔ کہ اب سے ہم دونوں بھی تمہاری طرح ایک دوسرے کا احساس کر کے اور ایک دوسرے کا بوجھ بانٹ کر زندگی گزاریں۔ کیوں عاصم ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"
بھابھی نے نم آنکھوں سے عاصم بھائی سے تصدیق چاہی۔
"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ یہ مختصر سی زندگی لڑ کر، ناراض ہو کر گزارنے کے بجائے واقعی ایک دوسرے کا ساتھ دے کر گزارنی چاہیے اور گڑیا تمہیں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں جو پیسے میں نے بائیک کے لیے ڈالے ہیں انہیں واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ میری چھوٹی سی گڑیا اور سمجھ دار بہنوئی جمع سالے کے لیے چھوٹا سا تحفہ۔"
وہ دونوں کو ساتھ لگا کر کہہ رہے تھے۔
"ایک منٹ آج تم دونوں کو تمہارے فیورٹ ہوٹل میں ڈنر میری طرف سے۔ چلو شاباش جو کھانا تم نے بنایا ہے۔ وہ مجھے پیک کر دو اور تم دونوں نئی بائیک پہ ڈنر کے لیے جاؤ۔" بھابھی نے جذباتی ماحول کو بدلنا چاہا۔ سب ہنسنے لگے۔
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے بھابھی لیکن پہلے میں آپ لوگوں کے لیے گرما گرم چائے لاتی ہوں۔"
عالیہ آنسو صاف کرتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔
یہ عالیہ اور حماد کی زندگی کی یادگار سالگرہ تھی یا شاید ایسے ہی موقع سب کے منتظر ہوتے ہیں۔
☆☆

ماہنامہ کرن

جنوری 2024ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "بیادِ ابنِ انشاء"،
- "نیا سال نئی امیدیں" شاہین رشید کا سروے،
- اس ماہ اداکارہ "جویریہ نیئر" کہتی ہیں "میری بھی سنیئے"،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،
- "دامنِ سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- "صنم تراش" فلک تنویر کا مکمل ناول،
- "تپتی دھوپ میں گھنی چھاؤں ہو تم" اُمِ ہانی کا مکمل ناول،
- "سپاس گزار" میمونہ صدف کا ناولٹ،
- "روشا اور منشا کا رشتہ" نازنین فردوس کا ناولٹ،
- آسیہ رئیس خان، عندلیب زہرا، ملیا سمون اور جویریہ مریم کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- "کرن کتاب"

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزیدار ریسپیز کے ساتھ

جنوری 2024ء کا شمارہ شائع ہوگیا

فرح بخاری

شام شہر ہجر

مکمل ناول

میاندم کا گھرانہ ہے جہاں ایک گھر میں دو خاندان رہتے ہیں۔ رضوانہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر مر چکے تھے، ندرت بھاوج ہیں ان کا ایک بیٹا ہے مومن جس کی منگنی رضوانہ کی بیٹی تحریم سے طے تھی۔ وسیلہ نے ایل ایل بی کیا تھا لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے پریکٹس نہیں کر سکی تھی۔ چھوٹی ایلیا کالج کی طالبہ ہے۔

تھانہ میں حویلی میں رہنے والی دادی منصب پر بہت مہربان ہیں وہ ان کے منشی کا بیٹا ہے۔ حویلی میں کوئی اس کا آنا پسند نہیں کرتا۔ دادی اس کی تعلیم کا خرچہ اٹھاتی ہیں وہ پولیس آفیسر بن جاتا ہے اس کا ٹرانسفر میاندم ہو جاتا ہے۔ منصب کی دو بہنیں ہیں میمونہ اور رمشہ، میمونہ شادی شدہ ہے۔

حویلی میں رہنے والی شہناز اور کمال خان کا بیٹا ارحم ہے جو ضدی اور بد دماغ سا ہے۔ شہناز بی بی کی بہن گلناز ہے جو نیم پاگل ہے۔ ارحم شادی کرنا چاہتا ہے۔

رضوانہ اور ندرت مومن کے ساتھ شاپنگ پر جاتی ہیں دو گاڑیوں میں قافلہ جاتا ہے ایک گاڑی وسیلہ اور دوسری مومن چلا رہا ہے راستے میں بارش اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے منصب بھی اس طوفان کا شکار ہوتا ہے۔

pklibrary.com

وسیلہ اور منصب اس طوفان میں ملتے ہیں۔ اتفاقاً وسیلہ ایک پتا پوچھتے منصب سے ٹکراتی ہے وہ اسے مختصر راستے سے اپنے گھر لے کر جاتا ہے۔ لیکن وہ اس پر شک کرتی ہے بعد میں اسے منصب کے گھر اسی پتے کی غرض سے جانا پڑتا ہے وہ شرمندہ ہوتی ہے۔

تحریم کی شادی میں وسیلہ منصب اور رمشہ کو انوائٹ کرتی ہے۔ منصب اور رمشہ کو وسیلہ اچھی لگتی ہے تحریم اور مومن پوری فیملی کے ساتھ کالام گھومنے جاتے ہیں اسی سفر میں وسیلہ اور منصب کی پھر ملاقات ہو جاتی ہے۔

ارحم رضوانہ اور ان کی فیملی کو ڈھونڈ لیتا ہے اور شہناز اور دادی کو بھی ان سے ملوانے لاتا ہے۔ رضوانہ کا خوف ختم ہو جاتا ہے، شہناز ارحم کے لیے وسیلہ کا رشتہ مانگتی ہے۔ منصب کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

تحریم کا انتقال ہو جاتا ہے مومن کی شادی ایلیا سے ہو جاتی ہے وہ اس رشتہ کو قبول نہیں کر پاتا کیوں کہ اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ تانیہ عیسیٰ کے بھائی کا علاج کرتی ہے۔ وہ اس لڑکی کی شادی کا پتا چلنے پر خودکشی کر لیتا ہے۔ عیسیٰ اس سب کا ذمہ دار ڈاکٹر تانیہ کو سمجھتا ہے۔ اس کے کلینک پر توڑ پھوڑ کی جاتی ہے۔ وہ بیگورہ چھوڑ کر میاندم آجاتے ہیں۔ شہناز شادی میں دادی کو نہیں لاتی۔ منصوبے کے تحت وہ وسیلہ کو اپنی یتیم پاگل بہن کے ساتھ تہ خانے میں بند کر دیتی ہے۔

وسیلہ کی حالت خراب ہو جاتی ہے، منصب اپنے طور پر کسی کے ذریعے معلوم کرواتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ارحم چترال میں رہ رہا ہے اور دوسری شادی بھی کر چکا ہے، وہ مومن کو اعتماد میں لے کر ساری صورت حال بتاتا ہے۔

مومن رضوانہ اور ایلیا کے ساتھ تھانہ آتا ہے۔ وسیلہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوتی ہے، اس کی دماغی حالت خراب ہو جاتی ہے وہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ منصب کی مدد سے مومن شہناز اور ارحم کے خلاف رپورٹ درج کرواتا ہے۔ ارحم اور شہناز اپنی ملازمہ کے ذریعے ہاسپٹل میں وسیلہ کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں، عین وقت پر منصب آجاتا ہے۔

مومن وسیلہ کو میاندیم لے آتا ہے۔ یہاں اس کا علاج ہوتا ہے لیکن اس کی دماغی حالت بہتر نہیں ہوتی۔ اس کے لیے تانیہ کی مدد لی جاتی ہے۔

دادی منصب کو بتا دیتی ہیں کہ وہ ان کا پوتا ہے، شہناز اسے مارنے کا پروگرام بناتی ہے اس لیے وہ منشی کی بیوی سے رضوانہ کا بیٹا تبدیل کر دیتی ہیں۔ تاکہ اس کی جان بچ جائے۔

تیرہویں قسط

چہرے نقاب سے چھپائے وہ کم از کم چھ مرد تھے جو یک لخت ان سب کے سروں پر پہنچے تھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے تانیہ کو کھینچ کر دور لے گئے تھے۔

"رکو....." منصب ہی سب سے پہلے چلا کر پیچھے بھاگا، کیونکہ باقی لوگوں کو تو سمجھ میں ہی نہیں آئی ہوا کیا۔ منصب کے لیے بحیثیت پولیس مین اعصاب بحال رکھ کر ردعمل دینا فطری رہا۔

وہ سب تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف دوڑتے جا رہے تھے۔ منصب قریب پہنچا تو ایک آدمی نے پلٹ کر اسے زور سے دھکا دیتے دور گرا دیا۔ منصب بمشکل خود کو سنبھال کر دوبارہ اٹھا۔ تب تک وہ نیچے پارکنگ میں پہنچ گئے تھے۔ منصب ابھی ڈھلان پر ہی تھا، ایک آدمی نے اسے اٹھتے دیکھا تو ریوالور نکال کر اس پہ فائر کر دیا اور اسی تیزی سے موڑ کاٹ کر غائب ہو گئے۔

گولی منصب کے ہاتھ پر لگی تھی اور ہتھیلی کے کونے کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ہاتھ سے خون کا فوارا نکلا اور منصب نے بے اختیار اپنی ہتھیلی کو کمر پہ زور سے دبایا تاکہ خون نکلنے سے روکا جا سکے لیکن خون کی روانی اس قدر تیز تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے منصب کی کمر خون سے لت پت ہو گئی۔ ادھر مومن نے آدمیوں کی فائرنگ اور تانیہ پر حملے کے نتیجے میں فوراً ایلیا اور رمشہ کو برآمدے کی طرف دھکیلا تھا۔ فوری طور پر سمجھنا مشکل تھا کہ ان حملہ آوروں کے عزائم کیا ہیں۔ تبھی وہ باقی ماندہ فیملی ممبرز کو وہاں سے دور کر رہا تھا۔ اُن آدمیوں کے تانیہ سمیت وہاں سے غائب ہوتے ہی سمجھ تو فوراً آ گیا کہ ان کا مقصد صرف تانیہ کو لے جانا تھا۔ تبھی وہ سب بھی دوڑ کر ڈھلان کے کنارے تک آ گئے تھے۔

منصب کو گولی لگتے اُن سب نے بھی دیکھا۔ مومن تو فوراً اس کی طرف بھاگا، اس کے لیے بھی سمجھنا مشکل تھا کہ منصب کو گولی کہاں لگی اور آخر میں کھڑی وسیلہ کی پھیلی آنکھوں کے سامنے منصب کی بارش سے بھیگی شرٹ کمر سے بہتا خون۔ اسے اپنے ہاتھ یک لخت خون میں لتھڑے چپچپے سے محسوس ہوئے۔ اچھا بھلا روشن دن ایک کالی اندھیری طوفانی رات میں تبدیل ہوا۔

وسیلہ کا بی پی لو ہوتے اس کے اعصابی نظام کو ایسے ڈاؤن کر گیا کہ وہ گھاس پہ ہی لہرا کر گر گئی۔ رمشہ اور ایلیا اس کی طرف بھاگیں جبکہ مومن نے بھاگتے ہوئے منصب کو جا پکڑا۔

"کیا کر رہے ہو منصب! ان لوگوں کے پاس بندوقیں ہیں۔"

"تو کیا تانیہ کو کڈنیپ ہونے دیں۔"

منصب نے جیب سے رومال نکال کر ہاتھ پر باندھنا شروع کیا تو مومن نے آگے بڑھ کر فوراً اس کی پٹی باندھی۔

"مجھے مت روکو، اور بالکل فکر مت کرو۔ مجھے ہیلپ کے لیے پولیس بلوانی پڑی تو منگوالوں گا۔ بس ان کی لوکیشن گم نہیں ہونی چاہیے۔ وہ اس بار رُکا نہیں، جمپ لگا کر دوڑتے ان آدمیوں کے پیچھے بھاگ گیا۔

☆☆☆

تانیہ اُن آدمیوں کے شکنجے میں جکڑی لگاتار مزاحمت کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ چلا بھی رہی تھی، ایک آدمی نے اپنے کندھے کا رومال تانیہ کے منہ پر باندھ دیا۔ ایک آدمی نے کال آنے پر موبائل کان سے لگایا۔

"جی سردار! کام ہوگیا۔ ہم پہنچنے والے ہیں۔" اس نے تو کہہ کر کال آف کردی لیکن تانیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ سردار سن کر پہلے تو صرف شک گزرا لیکن جب آدمی نے بتایا کہ پہنچنے والے ہیں تو رہا سہا شک بھی دور ہوگیا۔ وہ عیسیٰ کے علاقے میں تھی اور پیلس سے نکلے کچھ ہی دیر ہوئی تھی تو یقیناً اسے وہیں لے جایا جارہا تھا۔ اس مرتبہ اس نے بھی مزاحمت ترک کردی۔ مہینوں سے وہ جس ایک لمحے سے بچنے کی تگ ودو کررہے تھے بالآخر وہ اس کی زندگی میں آگیا تھا اور پہلی بار تانیہ کو احساس ہوا کہ وہ تو شاید بہت پہلے سے اس سامنے کے لیے تیار تھی۔ ہاں البتہ امی ابو سے جھوٹ بول کر نکلنے پر شدید پچھتاوا محسوس ہوا۔

"امی، ابو..... کاش میں آپ سے زندہ مل پاؤں۔" اس نے دکھ اور شرمندگی کے احساس سے آنکھیں میچ لیں۔

☆☆☆

منصب جس وقت گاڑی لیے پیچھے بھاگا، وہ آدمی اس سے بہت دور نکل گئے تھے اور سڑک پر آگے کہیں دکھائی نہ دیئے۔ تب منصب نے مقامی آبادی کے لوگوں سے سردار عیسیٰ کی حویلی کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔ تانیہ نے ہی بہت پہلے بتایا تھا کہ عیسیٰ کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ کھوجنا مشکل نہیں تھا کہ صرف تانیہ کو اٹھا کر لے جانا عیسیٰ کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ منصب کو تھوڑی دقت تو ہوئی اور وقت بھی لگا لیکن بالآخر وہ سردار عیسیٰ کے بنگلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

"سردار عیسیٰ سے ملنا ہے۔" منصب نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار کے ہاتھ پر اپنا کارڈ رکھتے اندر اطلاع دینے کو کہا۔ وہ دربان اسے رکنے کا کہہ کر فوراً اندر چلا گیا۔ منصب کی خون سے بھری شرٹ نے اسے بھی بوکھلا دیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا گیا اور کچھ دیر میں واپس آیا تو منصب کو ایک دوسرے گیٹ سے اندر جانے کو کہا۔ منصب اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے لان میں داخل ہوا تو وہاں کچھ آدمی دکھائی دیئے۔ اسے ایک کمرے میں لاکر بٹھادیا گیا۔ منصب کو بلڈنگ کی ساخت دیکھ کر ہی سمجھ میں آگیا کہ اسے مردانہ ڈیرے میں لاکر بٹھایا گیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ایک لڑکا، وہاں دو خادموں سمیت آیا۔ دونوں نے ہی ہاتھوں میں بندوقیں لے رکھی تھیں۔

"جی فرمایئے۔" لڑکا کچھ اکھڑ اور مغرور قسم کا لگتا تھا۔ بنا سلام دعا نہایت روکھے لہجے میں دریافت کیا۔

"میں اے ایس پی منصب رضا ہوں۔ میری ساتھی تانیہ سرفراز کو آج ہی ابھی کڈنیپ کرکے یہیں لایا گیا ہے۔" منصب نے اس سے بھی زیادہ اکھڑے لہجے میں اعتماد سے مدعا ظاہر کیا۔

"جی ہاں۔ مس تانیہ یہیں ہیں۔ اور محفوظ ہیں۔" اس نے بھی سہولت سے تسلیم کیا۔

"آپ سردار عیسیٰ ہیں؟ منصب نے کچھ اُلجھ کر دریافت کیا۔"

"جی نہیں، میرا نام عزیر ہے، میں سردار عیسیٰ کا چچازاد ہوں۔"

"مجھے عیسیٰ صاحب سے ملنا ہے۔ اور مس تانیہ سے بھی۔"

"جی، ہو جاتی ہے ملاقات۔ آپ کچھ دیر انتظار کریں۔" وہ بنا منصب کا جواب سنے اس بار باہر نکل گیا۔ منصب نے عزیر کی گفتگو کے بعد اپنے تناؤ میں واضح کمی ہوتی محسوس کی۔ اسے مومن اور باقی گھر والوں کا خیال آیا تو فوراً موبائل نکال کر مومن کو کال ملائی اور اسے صورت حال سے آگاہ کر کے تسلی دی۔

"میں وہاں آؤں؟" مومن نے اجازت چاہی۔

"نہیں مومن! میرا خیال ہے تم لوگوں کو اگر زیادہ کچھ مسئلہ نہیں تو وہیں پر ہمارا انتظار کرو۔ وہاں سب ٹھیک ہیں؟"

"ہاں، یوں تو کوئی پرابلم نہیں۔ یہاں آرام سے بیٹھا جا سکتا ہے، بس وسیلہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جوس وغیرہ دیا تو ہوش میں آ گئی ہے۔ اسے اندر لٹا دیا ہے۔ اب بہتر ہے۔"

"ہوں، میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" منصب نے کسی کو اندر آتے دیکھا تو کال آف کر دی، کچھ ہی دیر میں نوجوان اندر داخل ہوا۔ نجانے کیوں دیکھتے ہی منصب کو یقین ہو گیا کہ یہی عیسیٰ ہو گا وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور عیسیٰ کی نظر منصب کی شرٹ پر پڑی جو خون سے بھری ہوئی تھی۔

"اوہو...... آپ تو زخمی......" وہ پریشان ہو کر بے اختیار آگے بڑھا تو منصب نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"جی نہیں، یہ ہاتھ کا خون ہے جو دبانے کی وجہ سے یہاں لگ گیا۔"

"اوہ۔ اچھا اچھا۔" عیسیٰ بھی تسلی ہونے پر اپنی جگہ رک گیا، کیونکہ منصب کے ہاتھ پر رومال بندھا بھی [illegible] ہوا دیکھ لیا۔

"میں شرمندہ ہوں میرے آدمیوں کو گولی چلانی پڑی، جبکہ میں نے انہیں منع کیا تھا۔"

"مس تانیہ کہاں ہیں۔ اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ انہیں اس انداز میں کیوں لایا گیا۔" منصب نے اس کی شرمندگی کو اگنور کیا۔

"آپ تشریف رکھیں۔"

"نہیں مجھے تانیہ سے ملنا ہے، ان کی خیریت جاننی ہے۔" منصب کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"آپ مس تانیہ کے؟" عیسیٰ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی وہ ہماری ایک پیشنٹ کی ڈاکٹر ہیں۔ میری کزن کا ذہنی علاج چل رہا ہے۔ اور......"

"تو۔ آپ۔ آئی مین۔ کیا تانیہ کی شادی نہیں ہوئی؟" عیسیٰ کچھ گڑبڑا سا گیا۔

"شادی۔" منصب متعجب ہوا۔

"جی نہیں۔"

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔ مجھے لگا تانیہ نے شادی کر لی ہے۔ اور آپ سب سسرالی رشتہ دار وغیرہ۔

آئی ایم رئیلی ویری سوری۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔" عیسیٰ اس وقت نہایت پشیمان سا لگ رہا تھا۔ منصب نے خاموشی سے اسے دیکھا، پہلی فکر تانیہ کی طرف سے لاحق ہوئی۔ عیسیٰ کچھ جذباتی مزاج کا بندہ معلوم ہوتا تھا۔ عجلت میں کچھ بھی کر بیٹھنے والا۔

"وہ ایکچوئلی، میں مہینوں سے تانیہ کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے اُن سے معافی مانگنی تھی۔"

"معافی؟" منصب کے لیے یہ ایک نئی بات تھی، کیونکہ اُسے تو کچھ اور معلوم تھا۔

"تانیہ میری منگیتر ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی کی ڈاکٹر بھی رہی ہیں۔ میرے بھائی نے سوسائیڈ کر لی تھی، مجھے لگا تھا یہ سب ڈاکٹر تانیہ کی [illegible] کی وجہ سے ہوا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔"

"اچھا۔" منصب [illegible] اسے بغور سن رہا تھا۔ اگرچہ یہ سب باتیں اسے معلوم تھیں لیکن

اسے عیسیٰ کو سننا تھا اس لیے چہرا سپاٹ رکھا۔

"میرا بھائی جس کار میں گھر سے نکلا اُس کے بریکس فیل تھے۔ میرا ڈرائیور مکینک کو بلانے گیا ہوا تھا، اسی دوران صہیب باہر نکلا اور کار اسٹارٹ کر کے کہیں نکل گیا۔ اس کی نیت سوسائڈ کی نہیں تھی۔ حادثہ کار کی خرابی کی وجہ سے پیش آیا لیکن اِدھر دوسرے معاملات کچھ ایسے حساس ہو چکے تھے کہ مجھے لگا اس نے صدمے سے اپنی جان لے لی، میرے آدمیوں نے کلینک کی توڑ پھوڑ کی، تانیہ کے گھر بھی گئے، ارادہ تب بھی تانیہ کو اُٹھوا لینے کا تھا لیکن یہ لوگ پہلے ہی کہیں چلے گئے تھے۔ مجھے البتہ بھائی کی موت کے دو تین روز بعد پتا چلا کہ معاملہ سوسائڈ کے بجائے بریکس فیل ہونے کا تھا۔ لیکن تب دیر ہو چکی تھی۔ میں تب سے اگر تانیہ کو ڈھونڈ رہا ہوں تو وجہ صرف اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا تھا۔"

"او۔ اگر ایسا ہے تو پھر ابھی آپ کے آدمیوں نے گن پوائنٹ پر تانیہ کو کیوں اٹھایا، فائرنگ بھی کی اور طریقہ بھی۔"

"آئی ایم سو سوری، میں بہت شرمندہ ہوں۔" عیسیٰ کا ایک بار پھر سر جھک گیا۔

"مجھے عزیر نے کچھ اس انداز میں بتایا کہ صاف لگا تانیہ کہیں شادی کر چکی ہیں اور اپنے شوہر اور سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ گھومنے آئی ہوئی ہیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں مہینوں سے تانیہ کی تلاش میں سرگرداں ہوں اور معافی مانگ کر اپنے رشتے دوبارہ بحال کرنا چاہتا ہوں تو میرے لیے یہ بہت شاکنگ ثابت ہوا کہ میری منگیتر نے کہیں اور شادی کر لی ہے۔"

"تانیہ اپنے والدین کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ اور کوئی رشتہ شادی وغیرہ اب تک نہیں ہوئے۔ ہماری فیملی کے ساتھ تانیہ کے دوستانہ مراسم ہیں۔ میری بہنوں کے ساتھ ان کی اچھی دوستی ہے۔ اور اِسی رشتے کی مناسبت سے میں بھی تانیہ کو اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔" منصب نے عیسیٰ کا مزاج دیکھتے وضاحت سے جواب دینا مناسب سمجھا اور جسے سن کر عیسیٰ کے تیور کچھ اور بھی درست ہوتے گئے۔

"کیا آپ مجھے تانیہ سے ملوا سکتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے نا؟" منصب کو پھر اس کی خیریت کی فکر لاحق ہوئی۔

"جی وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ لیکن میری ابھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آیئے، میں آپ کو اُن سے ملوا دوں۔" عیسیٰ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تو منصب نے بھی پیش قدمی کی۔ مختلف راہداریوں سے گزر کر وہ ایک کمرے کے سامنے رُکا۔ اور اس کا دروازہ منصب کے لیے کھولا۔

"جو کچھ میں نے ابھی آپ کو بتایا وہ آپ تانیہ کے سامنے دوہرا دیں۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" عیسیٰ بجائے اندر جانے کے وہیں سے پلٹ گیا اور منصب کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک سنگل پلنگ رکھا تھا ساتھ دو کرسیاں، جن میں سے ایک پر تانیہ بیٹھی تھی اور سخت بے چین دکھائی دیتی تھی۔ منصب کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"منصب...... تم......" وہ بے ساختہ دو قدم آگے بڑھی۔

"تم ٹھیک ہو۔" اسے یاد تھا منصب کے آگے بڑھنے پر فائر کیا گیا تھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" منصب کو خود پہلی مرتبہ اطمینان محسوس ہوا۔ جب تک وہ تانیہ کو زندہ سلامت دیکھ نہ لیتا، سکون ملنا ناممکن تھا۔

"تمہیں یہاں تک کیسے آنے دیا گیا۔" وہ منصب کے باآسانی کچھ ہی دیر میں پیچھے آجانے پر حیران تھی۔ منصب مسکرا دیا۔

"بیٹھ جاؤ بتاتا ہوں۔" وہ خود بھی کرسی گھسیٹ کر سامنے بیٹھ گیا اور جو کچھ عیسیٰ نے بتایا تھا سب تانیہ کے سامنے دہرا دیا اور جسے سن کر تانیہ

کا بھی حیرت سے برا حال تھا۔
"واقعی......" وہ بے یقینی سے ہنس دی۔ صہیب کی جان میری وجہ سے نہیں گئی۔ یہ تو۔ یہ تو۔"
"میں نے کہا تھا تانیہ کہ تم ایسا کر ہی نہیں سکتیں، بس تمہیں ہی خود پر بھروسا نہیں رہا تھا...... اور......" منصب نے گلا کھنکارا۔
"عیسیٰ تم سے شرمندہ ہے، سامنا بھی کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ خصوصاً ابھی جس انداز میں یہاں لایا گیا، وہ پشیمان ہے کہ پھر عجلت میں بول گیا تھا۔"
"ہوں......" تانیہ نے سمجھ کر سر ہلایا "ہر کام میں عجلت دکھاتے رہے ہیں۔ انہوں نے تو پروپوز بھی بنا سوچے سمجھے کیا تھا۔"
"ایک منٹ مومن کی کال۔" منصب نے کال اٹینڈ کرکے مومن کو بھی اب تک کی ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔
"او گڈ...... یہ تو تانیہ کے حوالے سے بہت اچھی خبر ہے...... تو منصب پھر وہاں سے آپ لوگوں کی روانگی۔"
"ہاں میں عیسیٰ سے بات کرتا ہوں۔ ہمیں اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔" اس نے کال آف کرکے کمرے سے باہر جھانکا تو ایک گن مین دکھائی دیا۔
"بھائی، سردار عیسیٰ کو بھیج دیں۔" وہ پیغام دے کر واپس اندر آ گیا۔
"تمہیں عیسیٰ سے بہت نارمل انداز میں بات کرنا ہوگی، کوئی پرانا گلہ شکوہ نہیں۔ وہ سب بعد میں دیکھنے کے معاملات ہیں۔" منصب نے اسے آہستہ سے تنبیہ کی اور تانیہ نے بھی سر ہلا دیا۔ عیسیٰ بھی کچھ ہی دیر میں وہاں آ پہنچا اور اس مرتبہ بھی اس نے دروازے پر دستک دی۔ منصب دستک سن کر خود ہی باہر آ گیا۔
"جی، وہ میری پوری فیملی وہاں سفید محل میں رُکی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ سب ہماری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ اور مجھے کلینک بھی جانا ہے۔" منصب نے اپنا زخمی ہاتھ سامنے کیا۔
"جی مجھے بھی احساس ہے۔ اور میں نے تو آپ کے لیے ڈاکٹر کو بلوا بھیجا ہے۔ اگر آپ۔"
"جی نہیں شکریہ۔ آپ بس ہمیں اجازت دیجیے۔"
"میرے آدمی آپ کو چھوڑ آئیں گے۔ لیکن۔" وہ کہتے کہتے جھجک کر رُکا "میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔ جو کچھ بھی ہوا۔"
"جو کچھ بھی ہوا۔ اُس پر ایک مرتبہ آپ خود ہی مس تانیہ سے بات کر لیں۔" منصب نے اس مرتبہ مسکرا کر عیسیٰ کی بات کاٹی اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ دیا اور اسے ابرو سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ عیسیٰ پہلے تو بری طرح جھینپ گیا لیکن جب دیکھ لیا کہ منصب خود ساتھ نہیں آ رہا تو اپنا اعتماد بھی بحال ہوتا محسوس کیا۔ تانیہ سے اکیلے میں بات کرنا اس کے لیے نسبتاً آسان تھا۔ وہ منصب کو وہیں چھوڑ کر کمرے میں چلا آیا۔ تانیہ نے جب عیسیٰ کو اندر آتے دیکھا تو گھبرا کر پیٹھ پھیر لی۔ منصب بھی ساتھ نہیں تھا۔ وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔ دل کی دھڑکن بھی بے ترتیب تھیں۔ گلا بری طرح خشک ہوا تھا۔
"مجھے معاف کر دو تانیہ!" عیسیٰ کے صاف، سادہ الفاظ پر اس نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا تو عیسیٰ نے اپنے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں تانیہ کے سامنے جوڑ رکھے تھے۔
"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" وہ بے ساختہ کچھ قدم آگے آئی۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ نیچے دیکھنے لگی۔
"میں نے بار بار تمہارا دل دکھایا ہے۔ یہ معافی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں۔"
"مجھے صہیب کی ڈیتھ کا بہت افسوس ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں کہ اس غم کی گھڑی میں، میں

آپ کے ساتھ نہیں تھی۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور جوان بھائی کی موت کی تعزیت جو مہینوں سے تانیہ کے دل میں دبی تھی، اس نے سب سے پہلے اس کا اظہار کیا، جس پر عیسیٰ کو بھی بہت تعجب ہوا۔

"بے شک، صہیب کی موت بہت ہی دکھ کا وقت تھا۔ پر مجھے افسوس ہے کہ اس میں کچھ اور ان چاہے عوامل بھی شامل ہو گئے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تکلیف میں انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔"

"تو تم نے مجھے معاف کر دیا تانیہ!" اس نے بے ساختہ ہی تانیہ کی کلائی تھام لی تھی۔

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے عیسیٰ! آپ جس تکلیف سے گزر رہے تھے، اس میں انسان سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔" تانیہ نے غیر محسوس طریقے سے ہاتھ بھی چھڑا لیا۔

"تھینک یو تانیہ! اور میں تمہیں اس انداز میں یہاں بلوائے جانے پر بھی معذرت خواہ ہوں۔"

"جی، یہ واقعی غلطی ہے۔" اس مرتبہ تانیہ نے عیسیٰ کی طرف دیکھا تو چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"کیونکہ میرے ساتھ ایک بہت حساس ذہنی پیشنٹ بھی موجود تھی۔ اس کی ذہنی حالت پر اس کا بہت برا اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ میں اس کی بھی معالج ہوں اور اپنی وجہ سے ایک اور مریض کا نقصان اب افورڈ نہیں کر سکتی۔"

"آئی ایم سوری۔" وہ بس یہی کہہ پایا۔

"اب ہمیں اجازت چاہیے، دراصل ان کی فیملی وہاں مرغزار میں ہماری آمد کی منتظر ہے۔ اور وہ سب کافی پریشان بھی ہیں۔"

"ہاں مجھے احساس ہے۔ آیئے۔" عیسیٰ کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تو کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آنکھیں کھلیں تو نجانے ایسا کیوں لگا جیسے بہت لمبی نیند لی ہو۔ اتنی لمبی کہ اُسے اپنی زندگی کے واقعات چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں یاد آ رہے تھے۔ اور ایک بات جو بار بار ذہن سے ٹکرا رہی تھی وہ منصب کی کمر سے خون کا بہنا تھا۔ دریا کا کنارا، انگوری دوپٹہ، بچہ۔ پانی سے نکلتا نوجوان، اس کی خون سے لت پت کمر۔ آنے والے دنوں میں خون سے ڈرتے رہنا، منصب سے اتفاقی ملاقاتیں، تحریم کی شادی، ارحم، منگنی۔ جڑواں بچوں کی پیدائش۔ تحریم کی ڈیتھ۔۔ پھر اس کی ارحم سے شادی، تھانہ۔ پگلی، تہہ خانہ۔ تو۔ تو پھر منصب ان سب حالات میں دوبارہ اس کی زندگی میں کب آیا۔ کیونکہ ابھی نیند میں جانے سے پہلے ہی مرغزار

میں اس کی کمر سے خون۔ جبکہ خون تو اس کے سر سے نکل رہا تھا۔ وسیلہ نے بے اختیار اپنے سر کو ہاتھ لگایا، اسے تو شہناز تائی نے سر پر سریا مارا تھا۔ وہ چیخ کر نیچے گری اور پھر۔ پھر منصب کہاں سے آیا۔ وہ بہت الجھی الجھی سی کچھ گزری بیتی باتوں کو یاد کرنی چھت کو گھور رہی تھی۔ اور چھت کے نقشے، وال کلاک، دیواروں کے رنگ کو دیکھتے یک لخت تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

"مم۔ میں اپنے گھر ہوں۔ میاندم۔ ا۔ اپنی امی کے پاس۔ امی۔" وہ خوشی سے رو دی۔ اور فوراً بستر سے نکلی۔ اسے تہہ خانے سے، تھانہ سے، پگلی سے۔ تائی سے سب سے نجات مل گئی تھی۔ وہ بھاگ کر دروازے میں آئی۔ لیکن پاؤں یخ ٹھنڈے فرش پر لگے تو وہ حیرت سے رُک گئی۔ وہ تو سخت گرمی کے ماحول میں تہہ خانے میں بند تھی۔ اور یہاں تو بہت ٹھنڈ۔

"تم یہاں آ گئیں۔ میں تو بس نکلنے ہی والا تھا۔" باہر سے مومن بھیا کی آواز آئی تھی۔ وسیلہ نے ذرا سا سر باہر نکال کر دور راہداری کے آخری اینڈ کی طرف دیکھا، جہاں مومن بھیا اور ایلیا ایک

دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''جی مومن جی، وہ ریبا کو امی کے پاس چھوڑنے آئی تھی۔ اب آپ ہی کی طرف آرہی تھی۔'' ایلیا نے بازو پہ ریبا کو اٹھا رکھا تھا۔ مومن کندھے پر لیپ ٹاپ لٹکائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے آفس کے لیے بالکل تیار ہو۔

''بس اب میں یہیں سے نکل رہا ہوں، تمہیں دیکھنے آیا تھا۔'' مومن نے آواز کچھ آہستہ رکھتے مسکرا کر کہا اور آگے بڑھ کر بچی کے گال پہ پیار کیا اور پھر اُسی تیزی سے اچانک ہی ایلیا کا گال بھی چوم لیا۔ وہ جھینپ کر پیچھے ہٹی لیکن مومن ہنس کر ہاتھ لہراتے وہاں سے دور چلا گیا۔ وسیلہ کے لبوں پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اور آنکھیں پانی سے نم ہوگئیں۔ تہہ خانے کی تنہائی اور اکیلے پن میں وہ ایسے ہی مناظر کو تصور کیا کرتی تھی۔ سوچتی تھی کیا مومن اور ایلیا نے ایک دوسرے کو ہنسی خوشی قبول کرلیا ہوگا۔ اور آج۔ مومن کی خوشی اسے حیرت میں مبتلا کرگئی تھی۔ وہ تو تحریم سے شادی کے بعد بھی ایسے شوخ و شرارتی نہ ہوئے تھے۔ وہ ایلیا کے ساتھ خوش تھے۔ اور..... یہ..... بچی..... ریبا..... اس کے گال پہ آنسو لڑھک آئے۔ وہ جب بیاہ کر یہاں سے گئی تھی تو بچے چھ سات ماہ کے تھے۔ اب تو کتنی بڑی لگ رہی تھی۔ ایلیا واپس اندر چلی گئی تھی۔ دونوں راہداری کے اینڈ والے کمرے کے دروازے میں کھڑے تھے۔

دونوں نے وسیلہ کو نہیں دیکھا تھا۔ وسیلہ نے پلٹ کر جوتے تلاش کیے اور پہن کر واپس راہداری میں آئی۔ امی کے کمرے کے باہر وہ کچھ دیر تو گم سم کھڑی یہ سوچتی رہی کہ اُسے امی سے کس طرح ملنا ہے۔ شاید وہ رات کو یہاں آئی ہے۔ لیکن سر پر کوئی زخم کیوں نہیں ہے۔ وہ ڈھیر ساری حیرت لیے بالآخر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

رضوانہ اور ایلیا کی ایک ساتھ وسیلہ پہ نظر پڑی۔ اُن دونوں نے بنا کوئی تاثر دیئے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ چہرے ایک دم سپاٹ تھے۔ وسیلہ کو دیکھ کر ان کے چہروں پر کوئی ایکسائٹمنٹ تھی نہ خوشی۔ وہ دونوں ایک دم سنجیدہ، خاموش اور کچھ جھجکی ہوئی سی تھیں۔

''امی.....'' وسیلہ نے نہایت آزردگی اور مایوسی بھرے لہجے میں پکارا تو رضوانہ نے حیران ہوکر ایلیا کو دیکھا۔ مرغزار سے واپسی پر بھی وسیلہ ایک دم نڈھال اور سوئی سوئی سی تھی۔ انہوں نے اسے جوس پلا کر نیند کی گولی کھلا دی تھی۔ ساری رات وہ سوتی رہی تھی۔ تانیہ کو منصب اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اپنے والدین کو وہ خود ہی سمجھا دے ساری تفصیل سے آگاہ کردے گی۔ مومن نے کلینک لے جا کر منصب کے ہاتھ کی ڈریسنگ کروائی تھی اور صبح وہ اپنی ڈیوٹی پر بھی چلا گیا تھا۔ وسیلہ کو انہوں نے ڈسٹرب نہیں کیا۔ سوچا جب تک اس کا دل چاہے وہ آرام کرتی رہے۔ اور اب۔

''ایلیا.....'' وہ روتے لہجے میں ایک بار پھر بولی تو اس مرتبہ ایلیا اور رضوانہ ایک ساتھ ہی شاک کی کیفیت سے باہر نکلیں۔ تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا، سمجھا اور ایلیا بھاگ کر وسیلہ کے قریب آئی۔

''آپی!'' اس نے بے یقینی سے وسیلہ کی آنکھوں میں دیکھا تو وسیلہ اس سے لپٹ گئی۔

''ایلیا..... کیسی ہو تم..... میں..... میں تڑپ گئی تھی تم سب کو دیکھنے کے لیے، گھر واپس آنے کے لیے۔ امی امی۔'' وہ ایلیا کو چھوڑ کر ماں کی طرف بھاگی، رضوانہ بھی تب تک سمجھ چکی تھیں کہ ان کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ ان کی وسیلہ کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ وہ وسیلہ کو اپنے ساتھ لپٹائے بے تحاشا پیار کیے جارہی تھیں۔

''شکر ہے میری بچی تم ٹھیک ہوگئیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

''امی آپ نے مجھے پہچانا نہیں تھا، ابھی جو میں کمرے میں آئی؟'' وہ آنکھیں صاف کرتے اب حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''آں، نہیں۔ وہ اصل میں تم ہم سے ڈرتی

تھیں نا۔ تو۔"

"میں۔ آپ سے۔" اس نے حیرت سے ایلیا کو دیکھا۔

"میں کیوں ڈروں گی، اور کب؟" وہ حیرت سے سوال کر رہی تھی، کچھ بھی سمجھنا مشکل تھا۔

"آپی میں سب کچھ بتاتی ہوں، تم پہلے آرام سے یہاں بیٹھو اور ناشتہ کرو، کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔" ایلیا نے اسے پکڑ کر سامنے کے بیڈ پر بٹھایا۔ وہ جان گئی کہ وسیلہ کو یہ سب کچھ اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آئے گا۔

"میں میانم کب آئی؟" وہ پھر سوال پوچھنے لگی۔ اور اس کے سوال پر ایلیا مسکرا دی۔

"اس کا جواب تمہیں حیران کر دے گا اس لیے کہہ رہی ہوں پہلے تم آرام سے ناشتہ کرو، فریش ہو جاؤ، پھر پوری تفصیل بتاتی ہوں۔"

"ربا تو کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اور عانی۔" وہ کہاں ہے؟ وہ ایلیا کو دیکھ رہی تھی۔

"عانی مامی کے پاس ہے۔ اسے بھی لے آتی ہوں۔" اس نے آنکھوں آنکھوں میں امی کو کچھ اشارہ کیا اور باہر نکل آئی۔ سب سے پہلے دادی اور رمشہ کو جا کر خوش خبری سنائی، لیکن دونوں کو ہی وسیلہ کے سامنے جانے سے منع کیا۔ ایلیاء کو اندازہ تھا کہ دادی کو دیکھتے ہی وسیلہ کو پھر سے سوال ستانے لگیں گے۔ پھر وہ بھاگ کر ماموں اور مامی کے پاس آئی انہیں جلدی جلدی خوش خبری سنا کر بالترتیب، مومن منصب اور تانیہ کو بھی کال کر کے وسیلہ کی یادداشت واپس آنے کا بتایا اور اسی تیزی سے کچن میں آ کر ناشتہ بھی تیار کیا۔ تانیہ نے کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں وہ خود وہاں آ رہی ہے۔ منصب اور مومن دونوں نے بھی کہا کہ تانیہ ہی وسیلہ کو سارے حالات سے آگاہ کرے۔

☆☆☆

"حیرت ہے مجھے واپس آئے تین ماہ ہو گئے ہیں۔" وہ ساری باتیں سن کر پہلا حیرت بھرا ردعمل بھی دے پائی۔ اپنے اوپر گزرے حالات بھی وسیلہ نے سب کو سنا دیئے۔ دادی سے بھی ملاقات کی۔ البتہ رمشہ کو اپنے گھر میں دیکھ کر اُسے بہت حیرت ہوئی تھی۔ اور وہ تو وہاں سب سے بہت گھل مل رہی تھی جبکہ۔ وسیلہ کو اچانک ہی پچھلی شام کا وہ آخری منظر یاد آیا جب اس نے زخمی منصب کو دیکھا تھا۔ لیکن اسے کسی سے منصب کے متعلق پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

تانیہ نے ہی اسے بتایا کہ پچھلے روز وہ سب مرغزار گھومنے گئے تھے اور وہیں اس کی یادداشت واپس آئی تھی، لیکن منصب کا ذکر کسی نے نہیں کیا تو وہ بھی چپ ہو گئی۔ کہنے سننے کو اتنی باتیں تھیں کہ ابھی وہ اس معاملے میں اپنا ذہن نہیں تھکانا چاہتی تھی۔ اس کے حالات یہاں ہر ایک کے لیے بہت حیرت اور صدمے کا باعث تھے۔ ایلیا کو بہت دکھ تھا کہ وہ تھانہ کی حویلی تک جا کر بھی خالی واپس لوٹ آئی تھی، اسے تو پتا ہی نہیں تھا کہ نیچے کسی تہہ خانے میں اس کی بہن بے بسی کی زندگی جی رہی ہے۔ مزید یہ معلوم ہونے پر کہ اس روز کسی بچھڑے کی نہیں بلکہ وسیلہ کا کھانا پینا بند ہونے کی بات ہو رہی تھی۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ شہناز تائی کے مظالم، ارحم کی لاتعلقی، دادی کی بے خبری، ایک عدد پگلی کی اذیت ناک قربت۔ کتنی باتیں تھیں جنہیں دکھ اور حیرت سے سنتے نجانے وہ سب کتنی مرتبہ روئے تھے۔

وہ پورے گھر میں گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو چھو کر اپنے یہاں ہونے کا یقین کر رہی تھی۔ اور وہ خوش بھی ہو رہی تھی کیونکہ یہاں بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اسے توفیق ماموں کو صحت یاب دیکھ کر ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح نارمل انداز میں بات چیت کر سکتے تھے۔ چل پھر سکتے تھے۔ پھر دوسری بڑی خوشی مومن اور ایلیا کے تعلقات دیکھ کر ہوئی۔ تحریم کے چلے جانے کے بعد تو لگتا تھا روشنی اِن در و دیوار کے اندر دوبارہ شاید داخل ہی نہ ہو گی۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ اور مومن بھیا۔ اس نے مسکرا

کروال کلاک کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک اُن سے نہ مل سکی تھی۔ لیکن اب وہ آفس سے آنے والے تھے۔ اُسے اُن سے بھی بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔

☆☆☆

''ہم نے ابھی تک وسیلہ کو یہ حقیقت نہیں بتائی کہ وہ ہماری سگی بہن نہیں ہے اور وہ سب باتیں جو دادی سے پتا چلی تھیں۔''

''بتانا بھی نہیں چاہیے۔'' تانیہ کی آواز بھی نہایت دھیمی سرگوشی جیسی تھی۔ مومن اور منصب جیسے ہی ڈیوٹی سے واپس آئے ایلیا نے تانیہ کو بلوا بھیجا۔ اب تک کے وقت میں وہ وسیلہ کے ساتھ بیٹھی اس کے حالات ڈسکس کرتی رہی تھی اور بہت سارے معاملات ابھی بھی ایسے تھے جن پر بات کرنا بہت ضروری تھا۔ مومن ابھی تک وسیلہ سے نہیں ملا تھا۔ منصب کو بھی آفس سے آنے پر سیدھے یہیں بلا لیا گیا۔ وہ سب اس وقت مومن کے گھر پر تھے۔

''وسیلہ بیک وقت بہت ساری حیرتوں سے نمٹ رہی ہے۔ اور اس کی ذہنی حالت کے لیے اتنا دباؤ بھی کم نہیں ہے۔ فی الحال اسے اپنے اور منصب کے بیچ سے بے خبر ہی رکھنا چاہیے۔''

''لیکن میری اور رمشہ کی اس گھر میں موجودگی پر آپ کیا جواز پیش کریں گے۔ شاید مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔'' منصب نے مشورہ دیا۔

''نہیں منصب بھیا۔ ہم کچھ اور سوچتے ہیں۔'' ایلیا کو یہ صلاح پسند نہیں آئی۔

''جذباتی مت بنو ایلیا! فی الحال صرف وسیلہ کے بارے میں سوچو۔'' منصب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے ایک آئیڈیا آیا ہے۔'' تانیہ نے باری باری سب کو دیکھا۔

''ہاں کہو۔ کیسا آئیڈیا؟'' منصب نے ہی سوال کیا۔

''ایلیا نے وسیلہ کو صرف اتنا بتایا کہ وہ جب زخمی ہو کر ہسپتال پہنچی تو ہم سب تھانہ پہنچے۔ اس نے میمونہ اور منصب کا ذکر اس وقت جان بوجھ کر نہیں کیا۔ اب رضوانہ آنٹی وسیلہ کو وہ ساری تفصیل بتائیں۔ اور اس سے کہیں کہ پہلے میں بھی منصب سے بدگمان ضرور تھی لیکن تین ماہ پہلے جب منصب کی کوششوں سے ہی تمہیں تہہ خانے سے نکال کر یہاں لایا گیا۔ اور اس میں جھوٹ تو کوئی نہیں ہے، منصب اگر اس صبح میمونہ کو حویلی نہ بھیجتا تو وسیلہ کا زندہ بچنا تک محال تھا۔

منصب نے نہ صرف ارحم اور اس کی ماں کی سازشوں کو ناکام بنایا بلکہ وسیلہ کے گھر والے یعنی آپ سب جو یہاں بے خبر بیٹھے تھے ان کو بھی وسیلہ کی حالت کی اطلاع دی۔ وسیلہ کے اردگرد اس کے اپنوں کے پہنچتے ہی اس کی زندگی خطروں سے باہر آسکی۔ منصب کے احسانات کی وجہ سے آپ سب کا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا۔''

''اچھا جی۔ اور اتنا صاف ہو گیا کہ اٹھا کر منصب کو اپنے گھر ہی رکھ لیا۔'' منصب کو ابھی بھی تسلی نہیں ہوئی۔

''وہ تو پہلے بھی کہا تھا نا کہ تم یہاں کرایے دار ہو۔ وجہ کچھ بھی بتا دیں گے۔'' تانیہ مصر تھی۔ منصب نے ـــ مومن کو دیکھا تو اس نے بھی مسکرا کر تائید کی۔

''تمہیں یہاں سے جانے تو نہیں دیں گے۔ اور ہاں منصب یہ معاملہ تو چلو سلجھ ہی جائے گا۔ آگے کے متعلق کیا رائے ہے۔ وسیلہ نے اپنے حالات تو تفصیل سے بتا دیئے، اب کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے؟''

''ہوں۔'' منصب نے متانت سے سر ہلایا۔ وسیلہ کے حالات سے متعلق انہیں ایلیا نے کچھ دیر پہلے ہی تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

''وسیلہ کا بیان ریکارڈ ہونے سے پہلے ہمیں ڈاکٹر تانیہ اور سرجن کفایت سے وسیلہ کی میڈیکل رپورٹ حاصل کرنی ہوگی جس کے مطابق اب وہ

ذہنی لحاظ سے بالکل فٹ ہے۔ اس کے بعد وسیلہ کا بیان جس میں وہ خود پر گزری اب تک کی روئیداد سنائے گی اور اس کے بعد خلع کا دعویٰ کرے گی۔ ساس کے مظالم سے بھی اہم شوہر کی لاتعلقی کا معاملہ ہے۔

شادی کر کے یہاں سے رخصت کرا لے جانے والا وہاں پہنچ کر دوبارہ دکھائی تک نہیں دیا۔ بیوی کے حقوق پورے کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اور وسیلہ کے میکے والوں کی طرف سے اس سے کی رپورٹ درج کروانا کہ ارحم بنا پہلی بیوی کی اجازت یا علم میں لائے دوسری شادی کر چکا ہے اور اس عورت کو چوری چھپے حویلی میں رکھا ہوا ہے۔ اس درخواست کی بنا پر سرچ وارنٹ حاصل کیا جائے گا اور حویلی پر ریڈ ہوگی۔ ریڈ تو خیر اس رپورٹ پر بھی بن جائے گی کہ بہو پر مظالم ڈھائے گئے، اسے کسی تہہ خانے میں محبوس رکھا گیا اور اس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔"

"ہوں صحیح۔" مومن نے ڈاکٹر تانیہ کو دیکھا۔

"میں ڈاکٹر کفایت سے بات کرتی ہوں۔ شاید ہمیں وسیلہ کو ساتھ لے جانا پڑے۔ ڈاکٹر صاحب اس کا خود چیک اپ کریں گے، اسے سنیں گے اور فٹنس رپورٹ دیں گے۔ اس کے بعد پھر میں بھی رپورٹ بناتی ہوں۔"

"اوکے، اور اس سب میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ تھانہ تک وسیلہ کی صحت یابی کی اطلاع نہیں پہنچنی چاہیے ورنہ وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے اور کچھ بھی نیا سوچ لیں گے۔ ہو سکتا ہے غائب ہی ہو جائیں۔" منصب نے مزید کہا جس پر سب نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"کیا ہوا امی۔ ریبا کیوں روئے جا رہی ہے۔" وسیلہ اسی وقت نہا کر نکلی تھی۔ ریبا کے رونے کی آواز سنی تو بال سلجھاتے امی کے کمرے میں آ گئی۔

"ایلیا اپنے گھر گئی ہے۔ مومن آفس سے آیا ہے نا، اس کو شاید کھانا دے رہی ہو۔"

"مومن بھیا آ گئے۔ مجھے ملنا ہے اُن سے۔ میں ریبا کو وہیں لے جاتی ہوں۔" اس نے برش رکھ کر ریبا کو بازوؤں پہ اٹھا لیا۔

"ارے کوئی بات نہیں۔ میں کال کر کے ایلیا کو بلا لیتی ہوں۔ تمہاری طبیعت۔" رضوانہ نے موبائل اٹھایا۔

"میری طبیعت کو کیا ہوا ہے۔" وہ مسکرا دی۔ "بالکل ٹھیک ہوں اب۔" وہ ان کی ایک نہ سنتے ریبا سے باتیں کرتی درمیانی دروازے میں آئی تو سامنا منصب سے ہو گیا۔

"آ۔ آپ۔" وہ حیرت سے چند قدم پیچھے ہوئی۔ منصب کے پچھلے روز مرغزار میں ہونے کو اس نے پھر ایک اتفاق ہی گردانا تھا، لیکن یہاں اپنے گھر میں۔

"السلام علیکم۔" منصب خود بری طرح گڑبڑا گیا۔ وہ تو یہ سوچ کر یہاں تک آ گیا کہ اس کا کمرہ درمیانی دروازے سے نکلتے ہی عین سامنے تھا۔ بنا اندر لاؤنج میں جائے وہ جلدی سے کمرے میں داخل ہو سکتا تھا۔ سوچا کہ ادھر جب مومن اور امی وغیرہ وسیلہ کو اس کے متعلق سمجھا دیں گی تو تب سامنا بھی کر لے گا لیکن۔ اس نے دل ہی دل سخت پشیمانی محسوس کی۔ وسیلہ نے اس کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ اسے یہ سوچ کر سخت افسوس ہو رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والوں نے کیسے منصب کی ہر زیادتی کو فراموش کر دیا تھا۔ وہی منصب آج ان کے گھر کے اندر موجود تھا، امی تو کل تک جسے برداشت بھی نہ کرتی تھیں۔ وہ آنکھوں میں پانی کی نمی لیے وہیں سے واپس پلٹ آئی۔ منصب سے کسی قسم کی بات چیت کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

"آپی۔ میری بات سمجھو۔" ایلیا نے اس کا کندھا چھوا تو اس نے بری طرح ایلیا کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"تمہاری کوئی بھی بات مجھے بالکل مطمئن نہیں

کرسکتی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ لوگ اتنے جلدی بدل جائیں گے۔"

"تم ایک بار ٹھنڈے دل سے ہماری بات سنو۔" مومن بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے وسیلہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"مومن بھائی، بات یہ نہیں کہ کسی شخص نے مجھے ٹھکرا دیا تھا اور میں وہ شکست بھول نہیں پائی، ہر انسان اپنی رائے میں آزاد و خود مختار ہے، مجھے ویسے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن منصب نے انکار کر کے ارحم کے میری زندگی میں آنے کی راہ ہموار کی جبکہ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ منصب کا بچپن، جوانی جس حویلی میں گزری وہ اس کے مکینوں سے خوب واقف تھا لیکن اس نے پھر بھی میری زندگی اس جہنم میں جھونک دی، اسی سے بچنے کی کوشش کریں کہ بدلہ یا انتقام میں نہیں لے رہی، اس نے مجھ سے لیا تھا۔ آپ صرف اتنا پوچھ کر بتا دیں، کہ اس نے مجھے کس بدلے کی آگ میں جھونکا تھا۔"

"یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے وسیلہ، ورنہ خود سوچو کہ دادی تمہی تو اسی حویلی کا حصہ تھیں اور منصب سے کہیں زیادہ ان سب کو جانتی تھیں، پھر انہوں نے آخر ایسا کیوں ہونے دیا؟"

"کیوں؟ وسیلہ نے بے ساختہ سر اٹھایا کہ یہ خیالات تو اسے تہہ خانے میں بھی ستاتے تھے کہ آخر دادی نے ان سب کو کیوں اندھیرے میں رکھا تھا۔"

"ہم سب بھی ان لوگوں کی ظاہری اچھائی کا شکار ہوئے، انہوں نے دادی کو اچھائی کا ڈھونگ کر کے بہلا دیا تھا۔ خود منصب کا بھی یہی ماننا تھا کہ اگر دادی اس رشتے سے مطمئن ہیں تو وہ کون ہوتا ہے کچھ کہنے والا۔ اور جہاں تک بات ہے ہمارا دل صاف ہونے کی تو اس کے لیے یہی ایک بات ہی کافی ہے وسیلہ! کہ آج اگر تم ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ سلامت موجود ہو تو اس کی وجہ منصب ہے۔

اللہ پاک کو اگر تمہاری زندگی منظور تھی تو منصب وہ سبب بنا جسے اللہ نے بروقت تم تک پہنچایا۔ منصب شروع دن سے ان سب کی طرف سے مشکوک تھا۔ جس روز تمہیں حادثے کا شکار کیا گیا۔ منصب نے صبح سویرے اپنی بہن میمونہ کو حویلی بھیجا تھا، اسے اپنے ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ ارحم چترال سے واپس آ رہا ہے اس نے تمہاری خیریت جاننے کے لیے اپنی بہن کو بھیجا۔

جس وقت تمہارے سر پر چوٹ لگی، ارحم اور تمہاری ساس نے بجائے ہسپتال لے جانے کے تمہیں ڈیرے میں چھپا دیا۔ وہ تمہیں زخمی حالت میں ہی مار دینا چاہتے تھے۔ میمونہ کی مداخلت کی وجہ سے تمہیں ہسپتال لے جانے پر مجبور ہوئے اگر منصب پولیس کی مدد نہ لیتا تو وہ تمہارے زندہ بچ نکلنے کی ہر راہ مسدود کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ یہی منصب ہی تھا جس نے فی الفور تمہیں تمہاری حالت کی اطلاع دے کر تھانہ جانے کو کہا۔ ہمارے پہنچنے کی وجہ سے بھی تمہاری ساس اور شوہر پر بہت دباؤ پڑا اور وہ کچھ غلط کرنے کی پوزیشن میں نہ رہے۔" مومن نے اس بار کچھ زیادہ تفصیل سے منصب کا دفاع کیا۔

"اور امی تو ابھی تک اسی غلط فہمی میں تھیں کہ تم اپنی سسرال میں ہی خوش رہ سکتی ہو، یہ تو منصب بھیا نے ہمیں کہا کہ وسیلہ کو دوبارہ اس کی سسرال والوں کے حوالے نہ کیا جائے۔" ایلیا نے مزید کہا۔

"بھائی بھی بنا لیا۔" وسیلہ نے شکایتی نظروں سے ایلیا کو دیکھا۔

"او کے۔ تم مت بنانا بھائی۔" ایلیا نے ہنس کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالیں تو مومن کا بے ساختہ قہقہہ نکلا، جبکہ وسیلہ بری طرح شرمندہ ہوئی۔

"لیکن گھر لے آنے کا کیا مطلب۔ امی تو بنا سوچے کسی پر بھی بھروسا کر لیتی ہیں۔" وسیلہ کا انداز اب کچھ دھیما سا تھا۔

"وہ اس لیے کہ منصب بھائی کی لائف کو کچھ خطرات تھے۔ اب امی اسے اپنا بیٹا ماننے لگی ہیں تو اس لیے انہوں نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور یہاں کرایے

پر آ گئے۔ اور اب تم بھی اپنا دل صاف کرو۔ کیا تمہیں ہم سب پر بھروسا نہیں ہے آپی، کیا ہم کچھ غلط فیصلہ کریں گے۔"

"ہوں۔" وسیلہ نے نیم رضامندی سے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"عیسیٰ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"بات۔ مجھ سے۔ تمہیں کیسے پتہ، مطلب تم سے کیا رابطہ۔" تانیہ ایک دم بری طرح بوکھلائی جس پر منصب کو ہنسی آ گئی۔

"اچھا تو ڈاکٹر صاحبہ بھی نروس ہوتی ہیں؟" وہ اسے تنگ کرنے لگا جس پر تانیہ بری طرح خفت زدہ ہوئی۔ وہ اس وقت ناشتہ کر کے بالکل ہی فارغ بیٹھی تھی جب منصب کی کال آ گئی۔ وہ بھی اپنے آفس میں تھا اور تھوڑا فری وقت میسر آیا تو تانیہ کو کال ملالی۔

"صاف بتاؤ منصب، کیا کہا عیسیٰ نے؟"

"اس روز مرغزار میں اس نے میرا نمبر لیا تھا، اور رات اس کی کال آ گئی، کہتا ہے تم سے بات کرنا چاہتا ہے اور گھر بھی آنا چاہتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بری طرح گھبرائی "امی ابو تو بہت پریشان ہو جائیں گے۔"

"کیوں، تم نے ان کو بتایا نہیں، جو کچھ وہاں مرغزار میں پیش آیا؟" منصب حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

"بتایا تھا منصب اور بہت ڈانٹ بھی کھائی، کیونکہ میں گھر پر جھوٹ بول کر گئی تھی۔"

"ہوں۔ اور عیسیٰ کا سچ؟" منصب نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔

"ہاں، وہ سب باتیں بھی بتائی تھیں۔"

"پھر تو انہیں خوش [illegible] چاہیے، کیونکہ تمہاری جان کو اب کوئی خطرہ نہیں، الٹا وہ [illegible] کے رویے پر شرمندہ بھی ہے۔"

"ہاں لیکن امی ابو کو اس کا یقین بھی تو آئے۔" تانیہ کا لہجہ کچھ سست اور مایوس کن سا تھا۔

"مطلب؟" منصب چونکا۔

"وہ کہتے ہیں یہ اس کی کوئی چال نہ ہو۔ بدلہ وغیرہ لینے کے لیے۔"

"ہوں۔" منصب بھلا اس امکان کو کیسے رد کر سکتا تھا۔ جبکہ وسیلہ کی ہنستی بستی زندگی اس کے سامنے تھی جو ایک انتقام کی بھینٹ چڑھتے اسے کیا سے کیا بنا گئی تھی۔

"تو۔ کیا کہتی ہو، کیا کہنا چاہیے عیسیٰ کو۔ اور کیسے پتا چلے گا حقیقت کا۔"

"میں کیا کہوں منصب۔ تم ہی کوئی مشورہ دو۔ امی ابو صرف جذباتی بن کر سوچتے ہیں اور میں۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "میرا دماغ کچھ بالکل کام نہیں کر رہا۔"

"میرا تو یہ کہنا ہے تانیہ کہ عیسیٰ کی معذرت اور اس کے بیان پر شک کرنا بھی چلو۔ ایک لحاظ سے درست بات ہے، رسک لینا خود کو خطرے میں ڈالنا ہو گا لیکن اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ کیا پتا وہ سچا ہو۔ تب ایسی صورت میں محض شک کی بنیاد پر ایک اچھے شخص کو کھو دینا بھی تو جائز نہیں۔"

"یہی تو ساری کنفیوژن ہے۔"

"تب تو ایک ہی حل ہے۔" منصب سیدھا ہو بیٹھا۔

"ہاں کہو۔"

"تمہیں بتا کی لیٹی کے عیسیٰ پر اپنے خدشات ظاہر کر دینے چاہئیں۔ میں ہی اسے سمجھاؤں گا کہ اگر وہ رشتہ بحال کرنے میں انٹرسٹڈ ہے تو اسے یقین دہانی تو کروانی پڑے گی۔ کیونکہ درمیان میں جو اتنا کچھ ہوا اسے اتنی آسانی سے اگنور نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اگر والدین کی نظر سے دیکھا [illegible] تحفظ اس کی [illegible] ان کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے وہ میری بات سمجھ جائے گا۔"

"تم صحیح کہتے ہو منصب۔ سیدھے اور صاف الفاظ میں ہی اپنا موقف سامنے رکھنا چاہیے۔ گول مول رویوں اور اپنی طرف سے بہت کچھ فرض کر لینا

پھر ایسے ہی نتائج سے ہمکنار کرتا ہے جیسا وسیلہ کے ساتھ ہوا۔ رضوانہ آنٹی اپنی طرف سے بہت کچھ فرض کرتی گئیں۔ دادی نے الگ مفروضے قائم کیے۔ کوئی بھی کھل کر کسی سے کچھ نہیں کہہ پایا اور دشمن اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔"

"ہوں۔ تم اپنے امی ابو کو بھی بتا دو موجودہ صورت حال، میں پھر عیسیٰ سے بات کر کے بتاتا ہوں۔" منصب نے یہ کہہ کر اجازت لی اور تانیہ بھی ایک نئی سوچ میں گم ہوگئی۔

☆☆☆

حویلی کی سرخ اینٹوں سے لٹکتی بیلیں خزاں کی وجہ سے بے رنگ، باسی اور مرجھائی ہوئی سی نظر آرہی تھیں۔ حویلی سے دور کچھ فاصلے پر جیپ میں منصب اور مومن بیٹھے تھے۔

"ایسے حالات میں اعصابی طور پہ خود کو مضبوط اور حاضر رکھنا پڑتا ہے مومن، یہ سچویشن ایسی ہے کہ جس میں کچھ بھی پیش آنے کی توقع رکھی جاتی ہے۔" منصب نے سنجیدہ نظروں سے مومن کو دیکھا اور اس نے بھی سر ہلا دیا۔ وہ دونوں اس وقت تھانہ میں تھے۔ کچھ دن پہلے بھی وہ یہاں آئے تھے۔ اس وقت وسیلہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ تب وہ تینوں صرف پولیس اسٹیشن گئے تھے۔ پولیس نے اس کا بیان لیا تھا۔ اور اس کی میڈیکل رپورٹس بھی دیکھی تھیں۔ اسی کی بنیاد پر سرچ وارنٹ تیار کیا گیا تھا۔ اور آج مومن اور منصب یہاں دوبارہ آئے تھے۔ پولیس کی گاڑی ان سے آگے تھی۔ یہاں کے اے ایس پی، دو لیڈی پولیس اور پانچ چھ کانسٹیبل اب پولیس وین میں حویلی پر ریڈ کرنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ منصب نے اپنی جیپ حویلی کے باہر روک دی۔ اسی پولیس وین سے نکل کر ڈیرے اور حویلی کو گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ ارحم ڈیرے پر موجود تھا۔

اس اچانک افتاد نے اسے سنبھلنے اور بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ بیوی پر تشدد اور جان لیوا حملے کے شبے میں اسے گرفتار کر لیا تھا۔ خواتین پولیس حویلی کے اندر گئیں تو وہاں صرف چار عورتیں موجود تھیں۔ جنہیں تھوڑی بہت مزاحمت کے بعد گرفتار کر لیا گیا۔ وسیلہ کے بیان میں جس تہہ خانے کا ذکر تھا اس کی تلاشی لی گئی، وہاں سے گلناز کو باہر لایا گیا۔ چترالی عورت نے بھی فوراً ہی تسلیم کر لیا کہ وہ ارحم خان کی بیوی ہے۔ وسیلہ کے بیان کی بہت سی باتیں موقع پر ہی درست ثابت ہوگئی تھیں۔ گلناز کی دستیابی پر اے ایس پی شفقت باہر منصب کے پاس آئے۔

"منصب، یہ ایک خاتون تو ذہنی طور پر معذور دکھائی دیتی ہے، اسے کیسے جیل میں ڈالیں۔"

"ہوں۔" منصب دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ ارحم کے ڈیرے اور حویلی کو اس کی موجودگی میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہی ملازمین، ارحم، اس کی بیوی اور شہناز کو گرفتار کر کے وین میں ڈال دیا گیا۔

"یہ ارحم خان کی خالہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اپنی ذہنی حالت کی وجہ سے بے قصور بھی ہے۔"

"کہیں یہ عورت ناٹک نہ کر رہی ہو، میرے خیال سے اس کو بھی۔"

"نہیں نہیں سر۔" منصب نے ہاتھ بڑھا کر روکا "میں انہیں بچپن سے جانتا ہوں، یہ وانستہ کسی معاملے میں ملوث نہیں......اور......میرا خیال ہے انہیں میں اپنے ساتھ ہی لے جاتا ہوں۔ فی الحال یہاں کوئی ایسا نہیں جو ان کی دیکھ بھال کر سکے۔"

"آر یو شیور؟" سر شفقت اب جانے کے لیے تیار دکھائی دیتے تھے۔

"ہوں۔ انہیں میں میاندم ساتھ لے جاؤں گا۔ اور آپ سے تو رابطہ رہے گا ہی۔ اور ابھی تو ہم پولیس اسٹیشن تک ساتھ آرہے ہیں۔"

"ہاں، اب دیکھتے ہیں ارحم اپنے بچاؤ کے لیے کیا ہاتھ پیر مارتا ہے۔" سر شفقت پولیس جیپ میں بیٹھ گئے۔ پیچھے پیچھے منصب بھی مومن کو ساتھ لیے اپنی جیپ میں پولیس اسٹیشن چلا آیا۔ گلناز فی الحال پولیس وین میں تھی۔ منصب کا ارادہ تھا کہ میاندم

pklibrary.com

روانگی کے وقت وہ انہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اور اس سے آگے کے معاملات پر اس نے زیادہ سوچا ہی نہیں۔

جس وقت منصب جیپ روک کر تھانے کے اندر آیا، ارحم بری طرح چلاتے ہوئے ذاتی وکیل ہائیر کرنے کی بات کر رہا تھا۔

"ضرور ہائیر کرو وکیل اور اسے جتنے جھوٹ سکھانے پڑھانے ہیں، کر دیکھو۔" وہ بنا ارحم کی طرف دیکھے استہزائیہ ہنسا۔ وہ تکلیف دہ دن ایک لمحے کے لیے بھی منصب کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا تھا جب ارحم، اس کے آفس میں دندناتے ہوئے داخل ہوا تھا، کرسی کو ٹھوکر مار کر وہ اسے اپنے احسانات اور منصب کی نمک حرامی کی لسٹ سناتے اس کا سارا سکھ چین چھین کر لے گیا تھا۔ سچ ہے کہ وقت بھی کسی کا دوست نہیں ہوتا، اس دن خالی ہاتھ، خالی دامن گھر لوٹتے منصب کو بھی اچھا وقت واپس آنے کا امکان یکسر دکھائی نہ دیتا تھا۔ نجانے ظلم کرنے والے بھول کیوں جاتے ہیں کہ وہ پروردگار بازی پلٹ بھی سکتا ہے۔

☆☆☆

"گلناز......" رضوانہ نے حیرت سے سامنے دیکھا۔ منصب جس عورت کا ہاتھ تھام کر سہارا دینے کے انداز میں اندر لا رہا تھا، وہ بلاشبہ گلناز ہی تھی۔ رضوانہ نے جسے برسوں پہلے دیکھا تھا اور آج وہ کتنی مختلف تھی۔

"اماں، یہ تو کتنی لاغر اور کمزور ہو گئی ہے۔ کوئی اس کا خیال نہیں رکھتا؟" انہوں نے حیرت سے پاس کھڑی ساس کو دیکھا۔

"خیال تو بہت رکھتی تھی اس کی بہن۔" اماں جی نے ہی آگے بڑھ کر گلناز کو بازو سے پکڑا۔ "لیکن عمر بھی تو کتنی ہو چکی، پھر ایک نیم پاگل انسان اپنے موڈ کا غلام ہوتا ہے۔ اس پر زور زبردستی نہیں چلتی۔ اس کا دل چاہتا ہے تو کھا لیتی ہے، ورنہ یونہی کھانا خراب ہوتا رہتا ہے۔" وہ بولتے ہوئے اسے اندر لے آئیں۔ منصب نے فون پر ہی امی کو بتا دیا تھا کہ وہ گلناز خالہ کو اپنے ساتھ لا رہا ہے۔ فیروزہ اور ایلیا نے ایک کمرا اس کے لیے خالی کیا۔ جس وقت اسے اندر لا کر بٹھایا گیا۔ تانیہ بھی وہاں موجود تھی۔

وہ بڑے دھیان سے گلناز کو دیکھ رہی تھی۔ ایک عجیب و غریب کردار کہ جس کے متعلق وسیلہ کی روئیداد میں بہت کچھ سننے کو ملا تھا، جس کا ایک دھندلا سا خاکہ تانیہ کے ذہن نے ترتیب دے دیا تھا۔ گلناز اس خاکے سے اگرچہ بہت حد تک، مشابہہ تھی لیکن تانیہ کی حیرت اس وقت کسی اور وجہ سے تھی۔ وہ بہت دھیان سے گلناز کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہی تھی۔ نئی جگہ اور نئے چہروں کے بیچ اس کی جھجک، آنکھوں کا گھبرایا سا تاثر تانیہ کو کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں تانیہ؟" وسیلہ نے آہستہ سے اس کا کندھا چھوا تو وہ چونک کر مڑی پھر مسکرا دی۔

"کچھ نہیں بس ویسے ہی ایک ڈاکٹر کی نظر سے ان کو دیکھ رہی تھی۔" تانیہ نے ابرو سے دور بیٹھی گلناز کی طرف اشارہ کیا۔

"تو...... کیا دیکھا پھر۔" وسیلہ کے انداز میں دلچسپی سی تھی۔

"تم نے ان کے ساتھ بہت قریب سے وقت گزارا ہے وسیلہ۔ تو کیا میں کچھ پوچھ سکتی ہوں۔" وہ بات کرتے باہر نکل آئی۔

"شیور۔ اجازت لینے کی بات نہیں ہے۔ پوچھیں۔" وہ دونوں چلتے ہوئے وسیلہ کے کمرے میں آ گئیں۔

"کیا یہ بات چیت کرتی ہیں؟"

"آں۔ نہیں۔" وسیلہ نے نفی میں سر ہلایا "چپ کر کے بیٹھی رہتی تھی۔ کبھی زور زور سے ہنسنے لگتی، کبھی ہنسنے لگتی، کبھی اچانک حملہ آور ہو جاتا لیکن بولنا تو کبھی نوٹس نہیں کیا۔"

"تم نے کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش کی؟"

pklibrary.com

"سچ کہوں تانیہ تو۔ ہاں میرا بہت مرتبہ یہ دل چاہا کہ بجائے ڈرنے کے کیوں نہ اسے دوست بنالیا جائے۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں قید میں تھی، باہر مستقل تالا پڑا ہوتا تھا۔ میں صرف اسی ڈر سے اپنی سوچ پر کبھی عمل نہیں کر پائی کہ اگر بات چیت کا نتیجہ کچھ خطرناک نکلا تو میرے پاس بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے، بس اسی لیے مکمل گریز اور خاموشی اختیار کیے رکھی۔"

"ہوں۔ یہ بات تو تمہاری صحیح ہے۔" تانیہ نے متانت سے سر ہلایا۔

"یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں آئی تانیہ؟"

"ہاں، ہے ایک وجہ، لیکن ابھی کچھ واضح نہیں ہے۔ میں منصب سے مشورہ کر کے کچھ بتا سکتی ہوں۔"

"منصب سے..... کیوں؟" وسیلہ نے چونک کر تانیہ کو دیکھا۔

"اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ منصب تو باہر کا بندہ تھا، گلناز سے متعلق مشورہ تو گھر کے کسی فرد سے لینا چاہیے جیسے دادی، یا اس کی امی۔"

"وہ....." تانیہ کچھ دیر کے لیے گڑبڑائی "وہ اصل میں منصب انہیں ساتھ لایا ہے نا اپنی ذمہ داری پر..... تو....." تانیہ کو بروقت جواب سوجھا تو وسیلہ نے بھی سر ہلا دیا۔

☆☆☆

"جی شفقت صاحب..... سب خیریت....."

منصب نے اے ایس پی تھانہ کی طرف سے کال آتی دیکھی تو موبائل کان سے لگاتے ایک سائیڈ پر نکل آیا۔

"ہاں کہہ سکتے ہو خیریت ہے۔" شفقت کا لہجہ کچھ ڈھیلا سا تھا۔ منصب مکمل اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"دراصل ارحم خان نے وکیل مقرر کر دیا ہے۔ اور بری خبر یہ ہے کہ اس نے الٹا تم پر کیس فائل کر دیا ہے۔"

"مجھ پر..... کیسا کیس؟" منصب ہمہ تن متوجہ تھا۔

"ارحم کا کہنا ہے کہ منصب کی نظر شادی سے پہلے سے، اس کی بیوی وسیلہ پر تھی اور اسی وجہ سے وہ اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ وسیلہ کو اس کی طرف سے بدگمان کرنے میں سارا ہاتھ منصب کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ وسیلہ کے گھر پر اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔"

"اچھا؟" منصب کو سن کر حیرت ہوئی "اور یہ بات ارحم خان تک کیسے پہنچی کہ میں یہاں رہتا ہوں، مطلب وسیلہ کے گھر۔"

"اس کے وکیل نے تمہارے متعلق معلومات حاصل کروائیں تو اس کے علم میں آئی یہ بات۔ کیا واقعی ایسا ہے منصب؟" شفقت کو بھی سن کر حیرت سی ہوئی۔

"ہاں ایسا ہے، لیکن اس کی ایک وجہ ہے۔ میں کچھ شواہد وغیرہ کے ساتھ ایک دو روز میں پہنچتا ہوں۔ اور۔" وہ رکا۔

"ارحم کا اپنی چترالی بیوی کے متعلق کیا کہنا ہے؟"

"کہتا ہے پہلی بیوی نے اول روز سے ایک فاصلہ بنائے رکھا، اس لیے کچھ مہینے ڈیڑھ بعد دوسری شادی کی نوبت آئی۔"

"حالانکہ یہ تو اگلے ہی روز چترال نکل گیا تھا۔"

"ہاں یہاں اس نے ہیرا پھیری سے کام لیا اور اپنی دوسری شادی کو ڈیڑھ مہینے بعد شو کر رہا ہے۔"

"اوکے، میں آ کر ان سب معاملات کو دیکھتا ہوں۔"

"جلدی آنا۔ وہ لوگ ضمانت کے لیے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ کروا ہی لیں گے۔"

"ہوں۔" منصب نے کال آف کر کے اگلا نمبر مومن کا ملا لیا۔

pklibrary.com

☆☆☆

''کیا یہ واقعی ایک بالکل نارمل لڑکی تھی دادی۔ آپ کو یقین ہے؟'' گلناز کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد تانیہ کی حیرت بجا تھی۔

''میرا مطلب ہے کیا پتا وہ بظاہر ٹھیک دکھائی دیتی ہو لیکن ذہنی طور پر بہت کمزور ہو۔''

''نہیں بیٹا۔ گلناز کو میں بارہ تیرہ برس کی عمر سے ہی بہت قریب سے دیکھتی آئی ہوں۔ وہ اپنی بہن شہناز کے بیاہ کے موقع پر اس کے ساتھ ہی چولی آئی تھی۔ بالکل نارمل شوخ اور شرارتی سی بچی تھی، گھر بھر میں اودھم مچائے رکھتا بھاگ دوڑ کر سارے کام انجام دینا، میرے ساتھ بیٹھ کر مجھ سے پرانے قصے سننا، کہیں کچھ بھی عام لڑکیوں سے ہٹ کر نہیں تھا۔''

''کم کو تھی؟''

''بالکل نہیں۔'' دادی نے فوراً نفی کی ''ہر وقت ہنسنا مسکرانا اور باتوں کی پٹاری کھولے رکھنا، کم کو تو بالکل نہیں کہہ سکتے۔''

''عجیب بات ہے ویسے۔'' وہ گردن موڑ کر کمرے کے اس انتہائی کونے کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں سمٹ کر بیٹھی گلناز اردگرد تو کیا پورے جہان سے بے خبر دکھائی دیتی تھی۔ تانیہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر گلناز کے قریب آئی اور پھر وہیں نیچے ہی فرش پر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ گلناز نے پلکیں جھپکیں جیسے اسے اپنے سامنے کسی کی موجودگی کا ادراک تو ضرور ہوا تھا لیکن اس نے دانستہ دیکھنے سے گریز کیا۔ تانیہ نے اپنا ہاتھ ہلکے سے اس کے گھٹنوں پہ رکھے ہاتھ پہ رکھا۔

''بات سنو۔'' تانیہ نے آہستہ سے اسے پکارا تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ کیا میں آپ سے بات کرسکتی ہوں؟'' تانیہ نے ہاتھ پھر اس کے ہاتھ پہ رکھا۔ گلناز کی پلکیں ایک بار پھر جھپکیں اور اس کی آنکھوں نے فرش پر، دائیں بائیں دیکھا لیکن نظروں کو سامنے اٹھایا نہیں۔ تانیہ کی پوری توجہ اس کے چہرے اور آنکھوں پر تھی اور ابھی تک صرف آنکھوں سے تانیہ کی باتوں کا رسپانس دے رہی تھیں۔ یا بس اتنا کہ اس نے اپنا ہاتھ ایک بار پیچھے کھینچا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' تانیہ نے ہمت نہ ہارتے پھر بات کو آگے بڑھایا لیکن وہ یونہی بیٹھی رہی۔

''میرا نام تانیہ ہے، میں یہاں بالکل اکیلی ہوں۔ میرے ساتھ بات کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر آپ مجھ سے بات کریں تو مجھے اچھا لگے گا۔''

''دادی بتا رہی تھیں کہ آپ کی آواز بہت خوب صورت ہے۔ کیا میں آپ کی آواز سن سکتی ہوں۔'' تانیہ نے پھر اس کا ہاتھ ہلکا سا ہلا کر متوجہ کیا لیکن اس نے اپنے لب بے ساختہ بھینچ لیے تھے۔ تانیہ کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ گلناز اسے سن بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔

''اچھا تو آپ کا نام گلناز ہے۔ دیکھیں آپ نے تو نہیں بتایا، مجھے دادی نے بتا دیا۔ ویسے بہت خوب صورت نام ہے گلناز۔''

''مجھے لگتا ہے گلناز آپ کی ہنسی بہت پیاری ہوگی۔ لیکن آپ اتنی سنجیدہ رہتی ہیں۔ ہنسا مسکرایا کریں۔ بہت اچھی لگیں گی۔'' تانیہ نے ہمت نہ ہارتے یک طرفہ گفتگو جاری رکھی اور متواتر اس دوران گلناز کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر مزید اس نے کچھ ایسی ہی ملی جلی باتیں کیں، لیکن پھر ایلیا نے آواز دے کر متوجہ کیا تو تانیہ کو اٹھنا ہی پڑا۔

''اچھا گلناز! میں پھر آؤں گی۔ آپ سے باتیں کر کے مجھے بہت اچھا لگا۔'' وہ مسکرا کر اسے دیکھتی وہاں سے اُٹھ آئی۔ دادی نے مسکرا کر سر نفی میں ہلایا، انہیں تانیہ کی یہ کوشش بالکل بے فائدہ لگی۔

☆☆☆

''میں نے پہلے کہا تھا امی! غیروں پہ اتنا مہربان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ دیکھ لیا

ارحم کی گندی سوچ نے اس کا کیا فائدہ اٹھایا۔"
وسیلہ نے جب سے سنا کہ ارحم نے الٹا منصب کو پھنسانے کی کوشش کی تھی اس کا ڈپریشن کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ ارحم نے بجائے اپنے گناہ قبول کرنے کے وسیلہ کو ہی شک کے دائرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ ریپوٹیشن پر سوال اٹھائے جانا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ وسیلہ کو اس کا خوب ادراک ہو رہا تھا۔

"اچھا اب خود کو پریشان کر کے کیا ملے گا۔ منصب ہے ناسب دیکھنے کے لیے۔" رضوانہ کو وسیلہ کی فکر ہونے لگی۔ "آج کل تو ہر چھوٹی بڑی بات وہ ذہن پہ سوار کر لیتی تھی۔

"منصب، منصب۔" وہ غصے سے چلا اٹھی "کتنا ڈیپنڈ کرنے لگی ہیں امی آپ اُس پر۔ اور یہ کیا طریقہ ہے کسی کے احسان چکانے کا کہ لا کر گھر میں ہی بٹھا دیا جائے، آپ کی یہ چھوٹی سی لاپروائی ارحم اور تائی کے سارے بڑے بڑے گناہ چھپا دے گی لیکن آپ کو ابھی بھی ایک ہی نام بھائی دے رہا ہے۔"

وہ بنا تھکے بولے ہی چلی گئی۔ رضوانہ نے بے بسی سے ساس کی طرف دیکھا۔ ان سب نے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ فی الحال وسیلہ کو اس سچ سے بے خبر رکھا جائے لیکن یہ بھی ارحم کی مہربانی کہ ایسا نہیں ہو پایا اور اس کے قائل کردہ کیس کے متعلق وسیلہ کو بھی پتہ چل گیا۔

"یہاں آؤ وسیلہ! ادھر میرے پاس بیٹھو۔" دادی نے اسی اطمینان بھرے لہجے میں اسے مخاطب کیا تو وہ جھلائی ہوئی سی ان کے نزدیک آئی۔

"آپ ہی سمجھائیں امی کو۔ ان لوگوں کا ہمارے ہاں رہنا بالکل ضروری نہیں۔ کرائے کے مکانوں کی کمی ہے کیا۔ یہ لوگ اگر ابھی بھی یہاں سے چلے جائیں تو ہم ارحم کو غلط ثابت کر سکتے ہیں۔"

"ارحم غلط ہی ثابت ہوگا، کیوں اتنا بوکھلا رہی ہو۔ بیٹھو شاباش۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر وسیلہ کو اپنے پاس بٹھایا اور رضوانہ کو آنکھ کے اشارے سے باہر جانے کا کہا۔

رضوانہ خود بھی مجبور بیٹھی اب یہی سوچ رہی تھیں کہ وسیلہ کو سچ بتائے بنا اب چارہ نہیں ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ وسیلہ کو تو اماں ہی صحیح انداز میں سمجھا سکتی تھیں۔ اور ایسا ہی ہوا، ہاجرہ بیگم نے نرمی سے وسیلہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے، اسے شہناز کے اُن عزائم سے بھی آگاہ کر دیا جنہوں نے ماضی میں اس کی ماں کو کتنا نقصان پہنچایا تھا اور جن کے نتیجے میں خود ہاجرہ بیگم کو کیسے کٹھن فیصلے کرنے پڑے تھے۔

"من..... صبا..... امی..... کا..... بیٹا....." وہ کھلا منہ لیے حیرت سے دادی کو دیکھ رہی تھی۔

"اور۔ مم۔ میں۔" اگلا سچ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔

وہ اپنی ماں کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی۔ اس کی بہنیں، دادی، مومن بھیا، مامی ماموں بچے۔ کوئی بھی اس کا اپنا نہیں تھا۔ اور وہ۔ وہ برسوں سے اکیلی تھی۔ اور اس کی امی بیٹے کی محبت میں کتنی مجبور تھیں۔ وہ امی سے ان کے بیٹے کو باہر نکالنے کا کہہ رہی تھی۔ جب کہ اس گھر پر خود اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ عجیب بے ڈھنگے انداز میں سوچتی جا رہی تھی اور جتنا زیادہ سوچ رہی تھی اتنا ہی انتشار کا شکار ہو رہی تھی۔

"وسیلہ۔ رُکو۔ کہاں جا رہی ہو۔" دادی اسے باہر نکلتا دیکھ کر پکارتی رہ گئیں لیکن وہ باہر صحن میں نکل آئی تھی۔ عجیب بے خبری کی سی کیفیت تھی، وہ برآمدے کے زینے پر ہی بیٹھ گئی۔ دادی نے ایلیا کو اس کے پیچھے بھیجا۔

"آپی، یہاں کیوں بیٹھ گئیں۔ اندر آؤ۔" ایلیا نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کہ متوجہ کیا لیکن وہ ہاتھوں پہ ماتھا گرائے رو رہی تھی۔ رمشہ بھی ایلیا کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی تھی۔

"رو کیوں رہی ہیں؟ ہم کیا آپ کے لیے

پرائے ہوگئے اب۔ رشتے کیا صرف خون کے سچے ہوتے ہیں۔ بولو نا آپی۔" ایلیا کو بوکھلاہٹ میں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے تسلی دے۔

"ہوتے ہیں۔ سچے رشتے تو خون کے ہی ہوتے ہیں۔" وہ کچھ اور زور سے رو پڑی۔

"نہ ہوتے تو کیا امی بنا کسی مصلحت کو خاطر میں لائے منصب کو اپنے گھر لے آتیں۔ اب اتنی باتیں سن رہی ہیں لیکن بیٹے کو گھر سے بھیجنے کو تیار نہیں۔"

"کیونکہ وہ خوش ہیں آپی! انہیں ان کا بیٹا ملا ہے۔ کیا آپ خوش نہیں ہیں۔"

"ہونا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنے رندھے گلے پر قابو پایا، آنکھیں البتہ ابھی بھی برس رہی تھیں۔ "لیکن یہ مجھ سے ہو نہیں پا رہا۔ مجھے اپنا اکیلا پن بہت برا لگ رہا ہے۔" وہ پھر رونے بیٹھ گئی اور رمشہ جو ان دونوں کی پشت پہ کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی، وسیلہ کے دائیں جانب آ کر بیٹھ گئی۔ وسیلہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سے وہ اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی اور دوسرا اس کے گھٹنے پہ دھرا تھا۔ رمشہ نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"کیا اس لمحے میں بھی خون کے سچے رشتے کی حدت محسوس نہیں ہو رہی۔"

"ہوں؟" وسیلہ نے روتی پلکیں اٹھا کر تعجب سے دائیں طرف بیٹھی رمشہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک وہ عجیب خالی خالی نظروں سے، رمشہ کو دیکھے ہی گئی جیسے اسے رمشہ کی بات ہی سمجھ نہ آئی ہو۔ یا جیسے اس کا اس پہلو پر دھیان ہی نہ گیا ہو۔

"رمشہ اور میمونہ آپ کی سگی بہنیں ہیں آپی، آپ کا اپنا خون۔" ایلیا نے اس مرتبہ مسکرا کر یاد دلایا۔

"ہاں اور خوش صرف یہ لوگ ہی نہیں، ہم بھی ہوئے ہیں وسیلہ! ہمیں بھی تو اللہ نے بہن دی ہے۔ اور دکھی صرف تم نہیں کہ تم نے بہت سے سگے رشتے یک لخت کھو دیے، ہم بھی ہیں کہ ہم نے اپنا سگا بھائی کھویا ہے۔" رمشہ نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا لیکن آدھے جملے میں ہی اس کی پلکیں بھی نم ہو گئیں اور وسیلہ نے بے اختیار جذباتی ہو کر رمشہ کو اپنے گلے لگا لیا۔ وہ واقعی اب تک یہ نہیں سوچ سکی تھی کہ اس دنیا میں اس کی سگی، دو بہنیں ہیں جو اسے ابھی ابھی ملی ہیں اور اکیلی تو وہ بھی نہیں تھی۔ نجانے یہ حسد بھی اتنی بری چیز کیوں ہے، حقیقتیں ہی دھندلی پڑ جاتی ہیں۔

"آئی ایم سوری رمشہ! میں واقعی اس بارے میں تو سوچ ہی نہیں رہی تھی۔ اور مجھے میمونہ آپی سے بھی ملنا ہے۔" اس نے آنکھیں صاف کرتے مسکرا کر رمشہ کو دیکھا تو وہ بھی ہنس دی۔

"جی، وہ بھی بہت بے چین ہیں ملنے کے لیے۔ میں انہیں آج ہی کہتی ہوں کہ وہ کچھ روز کے لیے یہاں آجائیں۔"

"مجھے امی سے بھی معافی مانگنی ہوگی، بلاوجہ میں ان پر اتنا چلائی ہوں۔" وہ اب سخت پشیمان لگ رہی تھی۔

"آپ جانتی ہیں وہ کبھی خفا نہیں ہوتیں، پھر آپ کا جذباتی ہونا بھی جائز ہے آپی!" ایلیا نے اس کا ہاتھ دبا کر تسلی دی۔

"لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی، ارحم کے الزامات کا کیا کریں گے۔" وہ ایک نئی فکر میں پڑ گئی۔

"جی۔ وہ بھی سوچ لیا ہے۔" ایلیا اپنی جگہ سے اٹھ کر وسیلہ کے پیچھے آئی، اس کے بکھرے بال سمیٹ کر ہیئر بینڈ میں مقید کیے۔

"اور وہ یہ آپی، کہ اب اس سچ کو دنیا پر بھی تو ظاہر کرنا ہے۔ اور جب یہ سامنے آئے گا تو ارحم کے بے بنیاد الزامات اپنے آپ دم توڑ جائیں گے۔"

"کیا وہ لوگ مان جائیں گے۔" وسیلہ نے آنکھیں صاف کرتے اس بار لہجہ درست کیا۔ اس کا ذہن پہلی مرتبہ ایک اور سمت روانہ ہوا۔

"ماننا ہی پڑے گا۔ منصب بھیا آج کل ان ہی شواہد کو اکٹھا کرنے میں لگے ہیں۔ اور کر لیں گے ان شاء اللہ۔"

"اب اندر چلیں؟" اس نے وسیلہ کی ٹھوڑی اونچی کرتے مسکرا کر دیکھا تو اس نے بھی سر اثبات میں ہلایا۔ اسے اندر جا کر امی اور دادی سے معذرت کرنی تھی۔ بلکہ امی کو تو مبارک باد بھی دینی تھی، اللہ نے انہیں بیٹے کی خوشی سے بھی نوازا تھا۔ بس یہ خوشی ان تک پہنچنی دیر سے تھی۔

☆☆☆

"اب اِن لوگوں کو بچنا نہیں چاہیے ارحم۔ ان کے گناہ اب ناقابلِ معافی ہو چکے ہیں۔" شہناز کا سینہ سلگ رہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"بچ کر نکل بھی نہیں سکتا۔" ارحم نے ہاتھ میں پکڑے پیپرز کو جیسے منصب کی گردن سمجھ کر دبوچا۔ منصب کے گلے میں اس نے کیس تو ایسا پھنسایا تھا کہ اس کے بچ نکلنے کی راہ، ارحم کو دور دور تک دکھائی نہ دیتی تھی۔ اسے یقین تھا منصب اب وسیلہ کا رشتہ مانگنے کی بات کو جھٹلا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ وسیلہ کے زخمی ہونے کے موقع پر بھی وہ تھانہ آ پہنچا تھا، ہاسپٹل میں بھی موجود تھا۔ اور اسے یہاں سے نکال لے جانے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ اور اب ان کے گھر کرائے دار بن کر رہنے کی حرکت تو جیسے اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑی مارنے والی حرکت تھی۔

"اور گلناز کو بھی اب جلد از جلد واپس لے آؤ ارحم! نجانے میری بہن وہاں کس حال میں ہے اور یہ کم بخت اسے کسی مقصد کے تحت نہ لے گئے ہوں۔" شہناز کو اچانک ایک خیال نے پریشان کیا تو وہ سخت تشویش میں اُٹھ کر ارحم کے نزدیک آئیں۔

"سنو ارحم! کہیں انہوں نے میری بھلی بہن کے ساتھ کچھ کر نہ دیا ہو۔ اس نے بھی تو وسیلہ کو بہت پریشان کیا تھا تہہ خانے میں، کہیں وہ اس کا بدلہ۔"

"نہیں۔" ارحم نے سر نفی میں ہلایا۔ بھنویں آپس میں جوڑے اب وہ سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا "خالہ کی واپسی پر ابھی چپ رہیں۔"

"ہائیں۔ کیوں ارحم! اب میں واپس آ گئی ہوں، میں کیوں اپنی بہن کو اُن ظالموں میں چھوڑ دوں۔"

"اس لیے کہ یہاں اُس منصب پر ایک اور کیس بن سکتا ہے۔ میں شکایت درج کرواؤں گا کہ انہوں نے میری خالہ کو حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے اور ہمیں بلیک میل کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"ہیں..... اچھا؟" شہناز کو بات کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آئی۔

"نہ تو وہ کیا میری آپ کی اجازت سے لے گیا ہے خالہ کو؟" ارحم الٹا ان سے پوچھنے لگا تو شہناز نے سر کو نفی میں ہلایا۔

"پوچھا تو نہیں تھا۔"

"تو بس فی الحال مجھے کیس وائز کرنے دیں۔ اسے تو میں چاروں جانب سے پھنساؤں گا، اور ایسے ایسے کیسز کہ پولیس والے کی عقل ٹھکانے آ جائے گی۔" وہ قہقہے لگاتا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ شہناز بھی اب کچھ کچھ سمجھتے اس رخ پر سوچنے بیٹھ گئی تھیں۔ بات تو ارحم کی سولہ آنے درست تھی۔ وہ بھلا کیا لگتا تھا گلناز کا کہ یوں اُچک کر ساتھ لے گیا۔ منصب کی نیت اور اس کے ارادوں پر بجائے پریشان ہونے کے اُلٹا انہیں اسی کے گلے کی رسی بنانا چاہیے۔

☆☆☆

"انکل میں اپنے کیے پر سخت شرمندہ ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے شہر، اپنے گھر واپس آ جائیں، شاید اس طرح بھی میرے پچھتاووں میں کچھ کمی آ سکے گی۔" عیسیٰ نے سر جھکائے ازحد شرمندگی سے آغاز کیا اور سرفراز صاحب بس خاموش ہی بیٹھے رہے۔ منصب نے انہیں عیسیٰ سے ملاقات کے لیے تیار کیا تھا۔ منصب کی بات وہ ٹال نہیں پائے، ورنہ ان کا دل اب عیسیٰ کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ اُن دونوں کی ملاقات ایک

ریسٹورنٹ میں ہو رہی تھی کیونکہ سرفراز احمد اسے گھر بلانے پر آمادہ نہ ہوئے تھے۔

"میری وجہ سے آپ سب ہجرت پر مجبور ہوئے، تانیہ صاحبہ کا کلینک بند ہوا۔ میں آپ کے ہر نقصان کا ازالہ کرنے کو بھی تیار ہوں۔" عیسیٰ بول تو رہا تھا لیکن کچھ مواقع زندگی میں واقعی ایسے آجاتے ہیں کہ انسان کے پاس الفاظ ہی ختم جاتے ہیں۔ وہ بھی اس وقت بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اپنا مدعا کن لفظوں میں سرفراز صاحب تک پہنچائے۔

"وہ نقصان قطعی اتنے اہم نہیں ہیں برخوردار، جن کی جانب آپ اشارہ دے رہے ہیں۔"

"سوری انکل! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" عیسیٰ ایک بار پھر بوکھلا سا گیا۔

"بس آپ میرے جوان بھائی کی موت کا صدمہ سمجھ کر میری کوتاہیوں کو فراموش کر دیں۔ میں حقیقتاً آپ سے نظریں ملانے کے بھی قابل نہیں ہوں۔" عیسیٰ نے اس مرتبہ اپنے دونوں ہاتھ سرفراز صاحب کے سامنے جوڑ دیے۔

"یہ سب مت کرو عیسیٰ!" سرفراز صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ چھڑوائے۔

"میرے دل میں تو کوئی گلہ کوئی شکایت باقی نہیں ہے۔ ہاں بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ ہمیں آزادی سے جینے دیا جائے۔" وہ دبے لفظوں میں اسے جتا گئے کہ اب وہ اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے۔ عیسیٰ نے ان کی بات پر حیرت سے انہیں دیکھا۔

"اس کا مطلب آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔ انکل میں شرمندہ ہوں، معافی کا طلبگار بھی ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتا ہوں کہ تانیہ سے میرا رشتہ بھی قائم رہے۔"

"اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی یہ توقع رکھنا۔" سرفراز صاحب نے دانستہ بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"انکل! میں سمجھ سکتا ہوں، آپ کے خدشات بھی بالکل بجا ہیں۔ لیکن میں ہر قسم کی گارنٹی دینے کو تیار ہوں۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ اور سچ پوچھیں انکل تو صہیب کی موت کے وقت بھی کچھ ایکدم ہی اتنا میسڈ اپ ہو گیا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی کام کرنا چھوڑ چکی تھی، ورنہ یقین مانیں میں ہر قسم کے حالات میں عموماً بہت متوازن رہتا ہوں۔ لیکن جوان بھائی کی موت۔ آپ پلیز سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"سردار عیسیٰ! میں اُن والدین میں سے ہوں جو اپنے بچوں کے ہنر ان کے ٹیلنٹ کے آڑے آنے کے بجائے ان کی صحیح سمت میں رہنمائی کرتے ہیں۔ میں نے تانیہ کی قابلیت اس کے اپنی ذات پر اعتماد کی بدولت اسے وہی کرنے دیا جو وہ کرنا چاہتی تھی اور وہ اپنے پیشے اور اپنے کام سے بے حد مطمئن تھی، لیکن چند ماہ پہلے جو حادثہ اس کی زندگی میں پیش آیا اس نے بظاہر تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، لیکن میری بیٹی کا اپنی ذات پر سے اعتماد بالکل تہس نہس کر دیا ہے۔ صہیب آپ کا بھائی لیکن تانیہ کا پیشنٹ تھا، بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ آپ کے خوف کی وجہ سے اپنا کلینک چھوڑ گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ اپنے کام کو جاری رکھ سکے، اسے لگتا ہے وہ اپنے پیشے سے انصاف نہیں کر پائی۔ اور مجھے جہاں اِن دکھائی دیتے حالات پر تکلیف ہے وہاں کچھ مستقبل کے اَن دیکھے خدشات کی فکر بھی لاحق ہے، آج کرائسس کا شکار اس کا پیشہ ہوا، کل کو ازدواجی زندگی کی اونچ نیچ میں بھی وہ اپنی شخصیت کے ساتھ یہی سب کر بیٹھی تو ذمہ دار کون ہوگا۔ کیا میں نئے سرے سے کچھ اور پچھتاووں کے گرداب میں پھنس جاؤں گا کہ جانتے بوجھتے میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ کیا کر دیا۔"

"مجھے بھی ان سب باتوں کا احساس ہے انکل! اور میں ان سب کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتا

ہوں۔ میں جانتا ہوں سر! کہ یہ ایسی خوشیاں نہیں جن کا حصول دولت سے ممکن ہو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تانیہ کی شخصیت کا کوئی رنگ آئندہ کبھی پھیکا نہیں پڑے گا یا کم ازکم اس کی وجہ عیسیٰ نہیں ہوگا۔"

"ہوں......" سرفراز صاحب نے اس مرتبہ سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا۔

"میں اس معاملے میں تانیہ کی رائے کو ترجیح دوں گا۔ وہ بہت سمجھ دار بچی ہے، اپنا اچھا برا خود سمجھ سکتی ہے۔ باقی آپ کو سننے کے بعد اتنا ضرور کروں گا کہ اگر اس کا جواب ناں میں ہو تو اس کو کنوینس کرنے کی ایک کوشش کروں گا۔"

"جی بہت شکریہ انکل! مجھے تانیہ کے جواب کا انتظار رہے گا۔" عیسیٰ کے لیے یہ بھی کیا کم تھا کہ انکل کا جواب مکمل انکار سے نیم رضامندی کی طرف آ گیا تھا۔

☆☆☆

"یہ تو بہت بڑا ٹوئسٹ ہے۔" اے ایس پی شفقت نے حیرت سے منصب کو دیکھا۔ "ارحم کو اس بارے میں معلوم ہے؟"

"بالکل نہیں۔" منصب ہنس دیا "ان کے لیے نہ صرف شاکنگ بلکہ بالکل بے یقینی کا معاملہ ہوگا۔"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔ وہ اسے اپنی دادی کی سازش، اور جھوٹ تصور کریں گے۔ اور یکسر جھٹلا دیں گے۔"

"نہیں جھٹلا پائیں گے۔" منصب نے ایک بڑا لفافہ سامنے میز پہ رکھا۔ شفقت احمد نے حیرت سے پہلے لفافہ اور پھر منصب کو دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ میری ڈی این اے رپورٹس۔ جو میری بہن ایلیا اور والدہ رضوانہ سے میچ ہوئی ہیں۔ اور میری بہن میمونہ اور رمشہ کی رپورٹس جو وسیلہ سے میچ ہیں۔"

"واؤ...... گریٹ منصب......" اے ایس پی شفقت نے تعریفی نظروں سے منصب کو دیکھا۔

"اور میری دادی جان خود بھی بیان دینے کے لیے موجود ہیں۔ جو کچھ ماضی میں پیش آیا تھا، وہ اسے عدالت میں دہرانے کے لیے تیار ہیں۔"

"ہوں۔ تو مطلب ارحم کے الزام کو جھٹلانے کے لیے ہمارے پاس نہ صرف ایک مضبوط جواز آ گیا ہے بلکہ ان ثبوتوں کی وجہ سے ارحم کا دائر کردہ کیس بھی خارج ہو جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ اب تو تم حویلی کے وارث کی حیثیت سے اپنے حق کا دعویٰ بھی کر سکتے ہو۔"

"ہوں۔ لیکن وہ سب فی الحال نہیں۔ ابھی کے لیے بس اتنا کہ یہ لوگ اپنے گناہ قبول کریں اور وسیلہ کو خلع مل جائے۔ اور اس کے لیے میں نے چترال سے بھی کچھ شواہد اکٹھے کیے ہیں۔ وہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ گواہی دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ ارحم عین اپنی شادی کی پہلی رات اپنی دلہن کو یہاں چھوڑ کر چترال روانہ ہو گیا تھا۔ اور دوسری شادی ڈیڑھ دو ماہ بعد نہیں بلکہ دو دن بعد ہوئی تھی۔"

"ہاں اور اس کی دوسری بیوی کی میڈیکل رپورٹ بھی مددگار ثابت ہوگی۔ یہ ارحم پریگننسی کے معاملے میں جھوٹ سے کام لے رہا تھا۔" اے ایس پی شفقت نے بھی تائید کی۔

"اچھا سر تو مجھے اجازت۔"

"او کے منصب! اب یہ ان شاء اللہ با آسانی ہو جائے گا۔" منصب کے کھڑا ہونے پر شفقت احمد بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور منصب نے مصافحہ کر کے اجازت لی۔

ارحم کو چند دن پہلے ہی ضمانت پر رہائی مل گئی تھی۔ وہ سب دوبارہ اپنی حویلی چلے گئے تھے۔ اور ارحم نے منصب پر الزام لگا کر جو کیس فائل کیا تھا اس کے بل پر اسے پورا یقین تھا کہ وہ منصب کو پھنسا کر با آسانی اس شکنجے سے باہر نکل آئے گا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ منصب کا سچ تو خود اس کی حویلی کی دیواروں کو ہلا دینے والا ہے۔ منصب

ان ماں بیٹے کی حیرت کو محض تصور کر کے ہی اندر تک مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی اماں۔" رضوانہ نے چائے کا کپ ساس کے سامنے رکھا اور اپنا کپ لیے ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"ہاں کہو۔"

"منصب بتا رہا تھا کہ ارحم اور شہناز کی ضمانت پر رہائی ہوگئی ہے اور وہ حویلی چلے گئے ہیں۔ تو پھر وہ گلناز کی کوئی خیر خبر کیوں نہیں لے رہے۔ شہناز بھابی تو گلناز کے حوالے سے بہت حساس رہی ہیں۔"

"وہ تو میں بھی سوچ رہی تھی کہ گلناز کو وہ کیوں بلوا نہیں رہی۔" ہاجرہ بیگم بھی اپنی جگہ حیران تھیں۔

"السلام علیکم۔" تانیہ اسی وقت کمرے میں مسکراتی ہوئی داخل ہوئی تو ان دونوں کی توجہ ادھر چلی گئی۔

"وعلیکم اسلام، جیتی رہو..... آؤ..... آؤ....." دادی نے اپنے قریب جگہ بنائی۔

"کیسی ہیں دادی۔ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی۔"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا۔"

"اور آنٹی آپ۔" تانیہ نے رضوانہ کی طرف دیکھا "آپ کیسی ہیں؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں، شکر ہے۔ تم سناؤ۔ امی کیسی ہیں۔"

"سب خیریت ہے آنٹی۔ اور۔" تانیہ کی نظر بات کے دوران کمرے کے کونے میں گئی۔ گلناز آج بھی کمرے کے کونے میں نیچے زمین پر بیٹھی تھی۔ تانیہ نے سوالیہ آنٹی کی طرف دیکھا۔

"یہ کیسی ہیں۔ دوائی وغیرہ لے رہی ہیں۔" تانیہ ہی پچھلی مرتبہ گلناز کے لیے کچھ دوائیں لکھ کر دے گئی تھی۔

"ہاں۔ رمشہ کے ہاتھ سے کھا لیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ رمشہ کو پہچانتی ہے، کیونکہ وہ بتاتی ہے کہ ان کا بچپن سے حویلی میں آنا جانا ہے۔"

"جی یہی وجہ ہوگی۔" تانیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر گلناز کے قریب آئی اور اس کے سامنے نیچے بیٹھ گئی۔

"السلام علیکم۔ کیسی ہیں گلناز! تانیہ نے نہایت بشاش لہجے میں نہایت دوستانہ انداز میں گلناز کا ہاتھ تھاما۔

گلناز نے بے ساختہ سر اٹھا کر تانیہ کو دیکھا تو چہرے کا تاثر بدلا، پہچان کی ہلکی سی جھلک کے ساتھ ایک خوشی کی لہری دوڑی تھی چہرے پر۔

تانیہ نے ان سب تاثرات کو بڑی خوشی کی نظر سے دیکھا، پہلے کچھ بولنے کا ارادہ کیا لیکن ذرا دیر رک کر کچھ سوچا پھر گلناز کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا۔ وہ بھی میکانکی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہوتے حیرت سے تانیہ کو دیکھے گئی، جبکہ تانیہ مسکراتے ہوئے اسے دروازے کی طرف لے جانے لگی۔ اور راہداری سے ہوتے وہ گلناز کو باہر لان میں لے آئی۔ پہلے کرسی پر بیٹھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس کا ہاتھ تھامے کیاریوں کے نزدیک لے آئی۔

"پھول اچھے لگتے ہیں گلناز!" تانیہ نے ایک پھول توڑ کر گلناز کے ہاتھ میں دیا، اور تانیہ کو شدید حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ گلناز نے بے ساختہ پھول کو ناک کے قریب لے جا کر سونگھا تھا۔ بظاہر یہ ایک بہت معمولی بات تھی لیکن تانیہ جانتی تھی کہ یہ ہرگز ایک معمولی بات نہ تھی۔ گلناز کا عام انسانوں جیسے رسپانس دینا بہت اچھا سائن تھا۔ اور یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ تانیہ نے اس سے بات چیت شروع کی تھی اور گھر جاتے وقت وہ دوسروں کو بھی یہ تنبیہ کر کے گئی تھی کہ گلناز کے ساتھ خاموشی سے پیش نہیں آنا بلکہ زیادہ سے زیادہ بولنا ہے۔ بھی ایلیا اور رمشہ بھی اس سے بات کرتی رہی تھیں۔ کھانا دیتے وقت باقاعدہ اس سے پوچھا جاتا کہ وہ کیا پسند کرے گی۔

ایلیا اس کے سامنے کئی قسم کی چیزیں لے آتی

اور کہتی کہ اپنی پسند کی چیز اٹھالو۔ اور وہ بھی آگے سے ایسا ہی کرتی، جو پھل اسے اچھا لگتا وہ صرف اسی کو اٹھاتی۔ رمشہ نے اس کے کپڑے تبدیل کرواتے وقت اس کے سامنے تین ڈریس رکھے اور اس کی پسند پوچھی، گلناز نے تب بھی ایک گلابی ڈریس کو اٹھا لیا۔ کبھی کرتے وقت بھی رمشہ اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔

"تو پھول آپ کو اچھے لگتے ہیں گلناز!" تانیہ نے اس کے لیے رنگ برنگے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر گھاس پر چلنا شروع کیا۔

چلنا پھرنا صحت کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی اچھا دوست مل جائے تو اور بھی مزا آتا ہے۔ وہ اسے تقریباً کھینچ کر اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر رہی تھی کیونکہ گلناز کی چال نارمل نہ تھی، وہ جیسے کھنچی چلی آرہی تھی۔ تانیہ نے بھی کوشش جاری رکھی اگرچہ اسے کافی وقت ہو رہا تھا لیکن پھر تیسرے چکر تک کھینچا تانی میں بہت حد تک کمی آگئی، حتیٰ کہ پانچویں چکر تک گلناز خود ہی چلنے لگ گئی۔ تانیہ نے اس سے بولنا بھی متواتر جاری رکھا تھا، اگرچہ دیکھ چکی تھی کہ گلناز کی طرف سے جواب ملنے کی کوئی امید نہیں لیکن وہ ہمت نہیں ہارنا چاہتی تھی۔ اسے یہ سن کر بہت حیرت ہوتی تھی کہ ایک بالکل نارمل لڑکی بنا کسی سر کی چوٹ وغیرہ کے کیسے اس حال تک پہنچ سکتی ہے۔

جہاں تک اس کی اسٹڈی بتاتی تھی تو یہ جمود کی کیفیت ہو سکتی تھی جس کو توڑنے کے لیے دوسروں کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یا پھر کوئی اتنا شدید صدمہ کہ جو انسان کو اندرونی طور پر بری طرح توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اور اس سے نجات کے لیے بھی ظاہر ہے کہ علاج ہوتے ہیں۔ وہ گلناز کو لیے بہت دیر تک چلتی رہی، تبھی منصب اپنے آفس سے آتا دکھائی دیا۔ وہ گھر کے بیرونی باڑھ والے اوپن لان میں تھی۔ مسکرا کر منصب کو ہاتھ ہلایا اور گلناز کو کرسی پر بٹھا دیا۔ منصب بھی جیپ بند کر کے اسی طرف آگیا۔

"واہ۔ خوب۔ ڈاکٹر صاحبہ تو بالکل ہمت ہارنے کو تیار نہیں۔"

"جی۔ اور کاش کہ اسے بہت پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھا دیا جاتا۔" وہ گلناز کو کرسی پر بٹھا کر ایک سائیڈ پر آگئی۔

"ہاں، یہ تو تم نے صحیح کہا، لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ایسا کبھی نہیں کیا گیا۔ مجھے اپنی امی کی باتیں یاد ہیں۔ وہ گھر میں یونہی ذکر کرتے بتاتی تھیں کہ بڑی بی بی بیمار رہتی ہے، ہر وقت کا سر درد انہیں بستر پر لا چکا تھا۔ گھر کے سارے کام کاج گلناز نے سنبھال لیے تھے۔ تبھی یونہی امی تبصرہ کرنے کے انداز میں بتاتیں کہ گلناز کو بالکل چپ لگ گئی ہے۔ بہن کی بیماری اور جمال خان کی بے وفائی نے اسے صدمہ لگا دیا ہے۔

گلناز بی بی کو دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوتا ہے تانیہ۔ اب تو یہ سوچ کر کہ وہ میرے امی ابو کے فیصلے کی وجہ سے۔" منصب کا لہجہ دکھی سا ہو گیا، تانیہ نے بے اختیار اس کے بازو پر تسلی دینے کے انداز میں تھپکی دی تھی۔ ادھر تانیہ کا بھیجتے وسیلہ جب گیٹ پر آئی تو قدم بے اختیار یہ دیکھ کر وہیں رُک گئے کہ منصب اور تانیہ سامنے لان میں آمنے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ تانیہ نے اس کے بازو پہ اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ اور۔ گلناز۔ وہ تو ان دونوں سے کافی دور کرسی پر اکیلی بیٹھی تھی۔ وسیلہ نے فوراً ہی اپنے قدم واپسی کے لیے کھینچ لیے، البتہ منصب نے اسے گیٹ پر آکر رکتے اور پھر واپس پلٹ کر جاتے دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

"یہ کیا بکواس ہے ارحم۔ دماغ تو درست ہے ان لوگوں کا۔" شہناز کا ایک دم ہی پارہ چڑھ گیا۔

"منصب رضوانہ کا بیٹا ہے۔ یہ کون سا نیا افسانہ ہے۔ اور کون جاہل ہوگا جو ایسی فضول من گھڑت کہانی پر

یقین کرے گا۔"

"تو کیا یہ جھوٹ ہے کہ رضوانہ چچی کے بچے کی پیدائش منشی نوریز کے گھر پر ہوئی اور اسی رات اس کی بیوی کو بھی بچہ ہوا؟" ارحم نے جاننے کے انداز میں ماں سے سوال کیا تو وہ مزید جھنجھلا اٹھیں۔

"یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن یہ اس واقعے کو ایسا نیا موڑ دیں گے یہ تو سراسر گھٹیا حرکت ہے۔"

"تو کیا پیدائش آپ کی موجودگی میں ہوئی تھی۔" ارحم کا لہجہ ایکدم سنجیدہ تھا۔ وہ ماں کی طرح غصے میں دکھائی نہ دیتا تھا۔

"نہیں، جس وقت میں وہاں پہنچی، بچے پیدا ہو چکے تھے۔ تمہاری دادی تھی ان دو عورتوں کے پاس۔"

"تب تو یہ ممکن ہے نا کہ بچے تبدیل کر دیئے گئے ہوں؟"

"تم بھی ان کی دو نمبری میں آ رہے ہو۔ اور وہ دایہ۔ کیا نام ہے کم بخت کا۔ ہاں وہ ثریا۔ وہ ہٹی کٹی آج بھی موجود ہے۔ وہی ان کا جھوٹ سامنے لائے گی۔ میں آج ہی۔"

"کسی ثریا دوریا کی ضرورت نہیں۔ منصب کے پاس ڈی این اے رپورٹ ہے۔" ارحم کا لہجہ سرد اور ڈھیلا سا تھا، شہناز نے چونک کر بیٹے کو دیکھا۔

"کیا ہے منصب کے پاس؟"

"وہ ایک ٹیسٹ کی رپورٹ ہوتی ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منصب رضوانہ چچی کا بیٹا اور وسیلہ اس منشی کی بیٹی ہے۔"

"ہائے، ایسا کون سا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ اور یہ رپورٹ شپوٹ تو جعلی بھی بنتی ہے نا۔ کیا ہوگا اس پولیس والے نے ایسا کوئی گھپلا۔"

"اس نے کہا کہ چاہیں تو ہم اپنی مرضی کی لیبارٹری سے دوبارہ یہ ٹیسٹ کروا سکتے ہیں۔" ارحم نے گویا جل کر اطلاع دی اور اس مرتبہ شہناز کا بھی منہ کھلا رہ گیا۔

"منصب حویلی کا وارث بن جائے گا۔ وہ بھی آدھو آدھ۔" شہناز تو صدمے سے جیسے گرنے والی ہو گئیں اور یہ سب کیا دھرا تمہاری دادی کا ہے۔ برسوں پہلے وہ اپنے پوتے کو بچا لے گئی تھی۔ جبکہ اس رات تو۔" وہ جیسے پلنگ کے کونے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔

اس رات کیا۔ ارحم چونکا۔

"اس منحوس کے بیٹے کا پتا تو میں اسی رات ہی صاف کرنے والی تھی۔ ایک بردہ فروش کے رقم بھی حوالے کر دی تھی۔ ارے اسی دن سے تو بچنا چاہ رہی تھی، اس کروڑوں کی جائیداد کا تمہیں اکیلا وارث بنانے کے لیے تو سارا چکر چلایا تھا۔ میں بھلا اس باہر والی، میری بہن کا حق غصب کرنے والی کی اولاد کو کیوں ہماری حق حلال کی دولت پر قبضہ کرنے دیتی۔ لیکن یہ بڑھیا۔ یہ اس معاملے میں بھی اپنی چال چل گئی۔ ارے ارحم اس رپورٹ کا کچھ کر سکتے ہو تو سوچو۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے۔" ارحم نے سانس اندر کھینچا، سوائے اس کے اب کوئی حل نہیں کہ اس منصب کو ہی دنیا سے اٹھوا دیا جائے۔

"ارے ہاں نا۔ تو کرواس کا کچھ۔ ابھی کنوارا ہے، بال بچے کوئی نہیں۔ نکال پھینکو اس کانٹے کو۔"

"اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک تو وہ پولیس میں ہے، دوسرے ایسے حساس موقع پر کوئی بھی واقعہ خود ہمیں مشکوک کر دے گا۔"

"تو کچھ ایسا کرو کہ موت بالکل حادثہ لگے۔" شہناز تو ایکدم ہی سنجیدہ ہو گئیں، جیسے اب اس کے سوا اور کچھ سجھائی نہ دیتا ہو۔

"ہوں۔ کرتا ہوں کچھ۔" ارحم اچانک ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ یکے بعد دیگرے اتنا کچھ ہوا تھا کہ اسے اب سوچنے کے لیے بھی باقاعدہ فراغت چاہیے تھی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆

اُمِ ہانی

جو اک شکر نے آزاد کیا

مکمل ناول

"ایکسکیوز می۔ کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟"

اس کے قریب پہنچ کر وہ بولی تو اریب نے مڑ کر دیکھا۔ وہ پہلی بار اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو خواہ مخواہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈھیلا سا فرشی فراک اور سر پہ اسکارف اوڑھے کسی بھی میک اپ سے بے نیاز، وہ بالکل سادہ سی لڑکی اس مزاج کی نہیں لگتی تھی کہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی۔ لیکن بہرحال اریب نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور اپنی ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ حرم اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ذہن پہ مزید زور ڈالا مگر کہاں یہ یاد نہیں آ رہا۔ اور ایسی کسی صورت حال میں دل و دماغ بہت الجھ جاتے ہیں۔ اس کے بھی الجھ گئے تھے۔

"شاید اس کی شکل کسی ایکٹر سے ملتی ہوگی تب ہی اتنا دیکھا دیکھا لگتا ہے۔"

اس نے سر جھٹکا اور اپنی ٹرالی میں صابن اور شیمپو رکھنے لگی۔ ایک بار پھر سے مڑ کر دیکھا جو اس سے کچھ فاصلے پہ ہی، کسی پراڈکٹ کو اٹھائے غور سے پڑھ رہا تھا۔ نقوش سے وہ ایشیائی ہی لگتا تھا۔ شاید پاکستانی ہی تھا یا ہو سکتا ہے انڈین ہو۔

جب سے وہ گروسری اسٹور میں سے داخل ہوئی تھی اس کی نظر جو مختلف کاؤنٹرز پہ اپنی مطلوبہ چیزیں ڈھونڈ رہی تھی، پھر یک دم اسی ایک شخص پہ ٹھہر

pklibrary.com

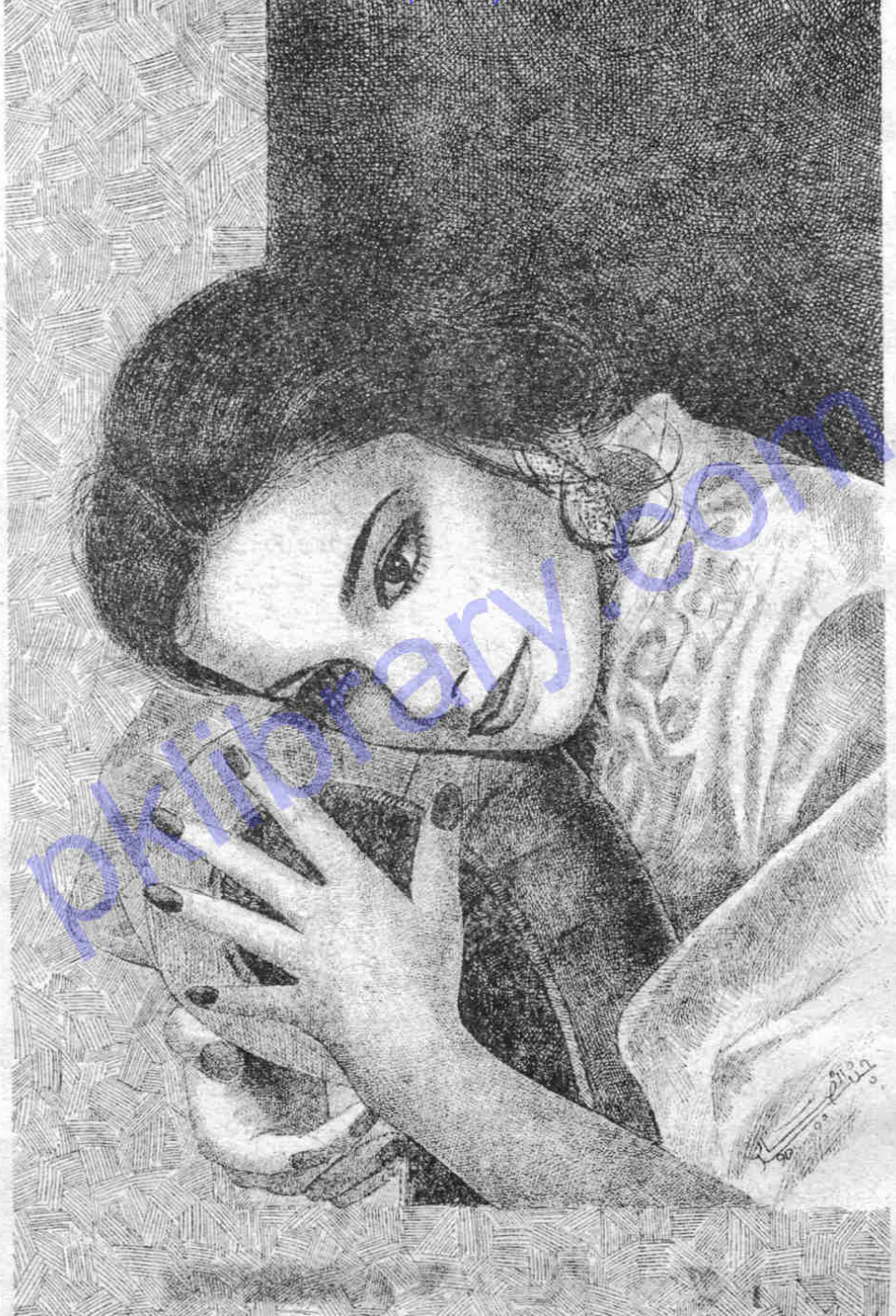
pklibrary.com

سی گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی بہت خوب صورت تھا یا اس نے اس سے پہلے کبھی کوئی حسین مرد دیکھا نہیں تھا۔ بس پہلی نظر میں ہی وہ اسے کچھ شناسا سا لگا تھا۔ وہ الجھ گئی تھی کہ اس نے اسے کہاں دیکھ رکھا ہے۔ بہت سوچنے پہ بھی یاد نہیں آیا۔ تو مجبور ہو کر، براہ راست اسے مخاطب ہی کر ڈالا لیکن وہ تو بس نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کی الجھن نہیں سلجھی تھی۔ دماغ اسی بات پہ اٹک گیا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے لیکن کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ اپنی ٹرالی کمپلیٹ کر اس سے پہلے کاؤنٹر پہ پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس کا بل بن رہا تھا اور وہ لائن میں لگا اپنی باری کے انتظار میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بل اس کے ہاتھ میں دیا گیا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اتنا بل کیسے بن گیا۔ اس نے تو اتنی شاپنگ نہیں کی تھی۔ اب وہ پشیمان ہو رہی تھی اور اپنا بیگ ٹٹول رہی تھی۔ اندر موجود رقم اس نے چپکے سے گن ہی لی۔ بل کی رقم سے کچھ ہی کم تھی۔ لیکن اب کیا وہ اسے اتنی رعایت دیتے۔ اس نے جھٹ سے معافی مانگی۔

"آپ یہ دو آئٹم نکال دیں پلیز۔ میرے پاس اتنا اماؤنٹ نہیں ہے۔" وہ شرم سار تھی اسی لیے خود سے ہی اس نے دو اشیاء نکال کر ایک طرف کر دیں۔

"اگر آپ لینا چاہتی ہیں تو میں پے کر دیتا ہوں۔" پیچھے سے کسی کی آواز آئی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے وہی کھڑا تھا اور نجانے کتنی دیر سے کھڑا تھا۔ اس پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"اٹس اوکے۔ یہ اتنی اہم نہیں ہیں۔" وہ اس کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو وہ اشیاء ضرور یہ میں سے ہی تھیں۔ اریب نے انہیں اس کے سامان میں رکھ کر نرمی سے کہا۔

"ابھی میں دے دیتا ہوں۔ آپ مجھے بعد میں پے کر سکتی ہیں۔" اس کی اس بات پہ حرم نے سر ہاں میں ہلا دیا۔ اریب نے باقی پیسے ادا کیے اور اپنا بل بنوانے لگا۔ وہ اپنا سامان لے کر باہر چلی آئی۔ ایسے وہ نہیں جا سکتی تھی جب تک اس کا ٹھیک سے شکریہ ادا نہ کرتی۔ پھر اس نے تو اس کا اتا پتا بھی تو لینا تھا تاکہ اس کے پیسے اسے واپس کر سکے۔

اسے انتظار کرتے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ وہ بھی اپنی گروسری سمیت باہر آیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی جانب بڑھی تو وہ بھی اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

"تھینک یو سو مچ۔" وہ نرمی سے مسکرائی تھی۔ اس کے انداز میں ایک دھیما پن تھا جو کوئی بھی محسوس کر سکتا تھا۔

"اٹس اوکے۔" اب کی بار وہ بھی مسکرایا تھا تاکہ وہ جس شرمندگی کا شکار اسے کچھ دیر پہلے دیکھ چکا تھا وہ جاتی رہے اور ایسا ہوا بھی تھا۔ حرم کافی حد تک پرسکون ہو گئی تھی۔

"ایشین؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پاکستانی۔" اس کے جواب پہ وہ بالکل پرسکون ہو گئی تھی۔

"میں بھی پاکستان سے ہوں۔" یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے اردو میں ادا کیا تھا۔

"میری اردو اتنی اچھی نہیں ہے۔" اس نے شانے اچکائے۔ حرم کو لگا تھا کہ وہ کسر نفسی سے کام لے رہا ہے کیونکہ اس کا تلفظ اور لہجہ بالکل صاف تھا تو یقیناً وہ اردو بھی ٹھیک سے بول ہی لیتا ہوگا۔

"حرم سلیمان۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

اریب نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیتے اسے دیکھا۔

"اریب۔" حرم کو اس کا نام اچھا لگا تھا۔

"آپ مجھے اپنا پتہ دے دیں۔"

"وہ کیوں؟ آپ اب میرے گھر تک آئیں گی؟" اس نے لہجے کو زرا شرارتی سا بنایا تاکہ اگر اس کے اندر کچھ تھوڑی بہت پشیمانی ہے بھی تو وہ جاتی رہے۔

"تاکہ میں آپ کو پیسے پہنچا سکوں۔" اریب نے کان کھجائے۔

یہ بات تو اس نے یونہی کہہ دی تھی کہ وہ اسے بعد میں واپس کر دے۔ اب کیا وہ سات پاؤنڈ کے لیے اسے اپنا ایڈریس دیتا اور وہ اس کے پتے پہ پیسے بھجواتی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے اب۔" حرم کے چہرے کے تاثرات بدلے تو اس نے یک دم جملے کی تصحیح کی۔

"میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں پاکستانی ہیں اور ایک ہم وطن اپنے ہم وطن کے اتنا کام تو آسکتا ہے۔" حرم نے اس کی اس بات کو رد کرتے ہوئے سرنفی میں ہلایا۔

"بالکل نہیں۔ میں یہ فیور نہیں لے سکتی۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کل کو مجھے ضرورت ہوگی تو آپ کام آجایئے گا۔" حرم نے اسے کچھ عجیب طرح سے دیکھا کہ کیا وہ، مستقبل میں ملتے رہیں گے جو وہ یہ بات کہہ رہا تھا۔

"ایک شرط پہ میں یہ بات مان سکتی ہوں۔" اریب نے اسے اچھنبے سے دیکھا۔

"کیا ہم پہلے ملے ہیں۔؟ یہاں یا پاکستان میں؟ اگر ملے ہیں تو پلیز بتا دیں کیونکہ مجھے پہلی نظر میں ہی آپ چہرہ شناسا سا لگا ہے۔" اریب نے اس کے وہی سوال دہرا دینے پہ پھر سے نفی میں سر ہلایا۔

"میں اس سے پہلے آپ سے کبھی نہیں ملا۔ نہ مجھے آپ کا چہرہ دیکھا ہوا لگ رہا ہے۔ نجانے آپ کو کیوں ایسا لگ رہا ہے۔؟"

"پہلی نظر میں ہی مجھے آپ کا چہرہ مانوس سا لگا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کسی سے ملتے جلتے ہوں۔" اریب نے شانے اچکا دیے۔ اب وہ کیا کہہ سکتا تھا کہ اسے ایسا کیوں لگ رہا ہے۔ اس کے اندر ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔

دونوں اپنا سامان لے کر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک اسٹریٹ کے سامنے پہنچ کر حرم ٹھہر گئی۔

"میرا گھر اسی اسٹریٹ میں ہے۔" اریب یک دم چونکا۔ اس نے اسٹریٹ کو دیکھا اور پھر سے اسے دیکھا۔

"اسی اسٹریٹ میں۔؟" وہ بڑبڑایا۔

"سیکنڈ لاسٹ فرام رائٹ سائیڈ۔" کچھ ایسا تھا جس نے اریب کو فریز کیا تھا۔ وہ بالکل سن سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"اوکے دین۔ سی یو۔" وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی لیکن اریب مسکرا تک نہ سکا۔

"تو کیا وہ؟" اس نے دور جاتی حرم کو دیکھا تھا۔ اندر مقید سانس کو خارج کیا تھا اور الجھ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر پہنچی، تو خالہ اور ممی کی باتوں کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ خالہ گھر پہنچ چکی تھیں، یہ حیرت کی بات بھی کیونکہ ان کی ڈیوٹی شام چار سے پہلے ختم نہیں ہوتی تھی اور اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ ڈیوٹی کے بعد پیدل واک کر کے گھر آتیں تو بیس منٹ اور لوکل ٹرام پکڑ کر آتیں تو بھی انہیں گھر پہنچنے میں دس منٹ تو لگتے ہی تھے۔

"ابھی وہ یہاں کے ماحول سے واقف نہیں ہے طیبہ! اور پھر وہ بچی ہے۔ تمہیں اسے ایسے نہیں جانے دینا چاہئے تھا۔" یہ فکرمندی آواز خالہ کی تھی جن کے لیے وہ بیس سال کی لڑکی، اب بھی شاید وہی چار سال کی بچی تھی جسے وہ پاکستان میں چھوڑ کر یہاں انگلینڈ چلی آئی تھیں۔

"میں اب بچی نہیں رہی خالہ۔" اس نے سامان سامنے صوفے پہ رکھتے ہوئے باآواز بلند اعلان کیا۔

دونوں اس کی طرف گھوم گئیں۔

"شکر ہے کہ تم گھر آگئیں۔ مجھے تو بہت وہم ستا رہے تھے۔" ممی نے ہاتھ جوڑتے اللہ کا شکر ادا کیا۔

"حرم! تمہیں ایسے اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ ابتسام کا ویٹ کر لیتیں تو وہ تمہیں لے جاتا۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی سامان لینے کی۔"

"وہ کون سا بہت بڑا ہے۔ مجھ سے چھوٹا ہی تو ہے۔ اس کے ساتھ جاؤں یا اکیلی جاؤں ایک ہی بات ہے۔" وہ اب مزے سے مطمئن انداز میں صوفے پہ ڈھے گئی۔

"وہ لڑکا ہے۔ ساتھ ہوتا تو ہم بے فکر ہو جاتے۔" خالہ کی بات اسے ہضم نہیں ہوئی۔ وہ اس آزاد خیال ملک میں اتنے سالوں سے رہ کر بھی ایسی

بات کررہی تھیں۔

''یہ آپ کہہ رہی ہیں وہ بھی یہاں رہ کر خالہ۔''

''یہاں رہتی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں۔ تم ابھی اس ملک سے واقف نہیں ہوئی۔ جب ہو جاؤ گی تو بے شک اکیلے چلی جایا کرنا لیکن تب تک کے لیے ابتسام کو ساتھ لے جایا کرو تو اچھا ہے۔'' وہ مزید بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی اس لیے ہاتھ اُٹھا دیے کہ بات ختم کردی جائے۔

''مجھے بہت بھلا انسان مل گیا تھا وہاں۔ پاکستانی تھا اور کافی اخلاق والا بھی تھا۔ میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تو اس نے پے کردیے تھے اور اب وہ مجھ سے لے بھی نہیں رہا۔ پاکستانی ایسے ہی دیالو ہوتے ہیں یہاں آکر کیا؟''

طیبہ نے اسے کچھ گھور کر دیکھا۔ اس کی تربیت کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتی رہی تھیں۔ وہ جتنی بھی آزاد خیال ہوں لیکن کچھ معاملات میں وہ بہت تنگ نظر تھیں۔ ان کی نظروں سے گھبرا کر ہی حرم نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے انہیں شانت کرنے کی کوشش میں کہا۔

''جانتی ہوں کہ میں جن اقدار کے ساتھ پاکستان سے آئی ہوں انہی کے ساتھ مجھے یہاں بھی رہنا ہے مما۔ آپ میری عمر کے بیس سال کا زیرو کھا جاتی ہیں اور مجھے ہمیشہ دو سال کا ہی سمجھتی ہیں۔ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ بہت اچھی طرح صحیح غلط کی پہچان کرسکتی ہوں۔ اکیلی ہوں گی تو بھی ایسا کچھ نہیں کروں گی جو غلط ہو۔ پاکستان سے انگلینڈ آجانے کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ میں غلط کو صحیح ماننے لگ جاؤں گی۔ اس لیے اتنا پریشان نہ ہوں اور اپنی بیٹی کے ساتھ اپنی تربیت پہ بھروسا رکھیں۔'' اس کی ایسی صاف گو تقریر نے طیبہ کو مکمل پرسکون کردیا تھا۔

ایک الوہی چمک ان کے چہرے پہ آگئی تھی جیسے انہیں اپنی تربیت پہ فخر ہو اور ایسی ہی ایک چمک ثوبیہ کے چہرے پہ بھی آئی تھی جیسے انہیں بہن کی تربیت اور بھانجی کی شخصیت پہ مان ہو رہا ہو۔ ایسے ہی تو وہ اس لڑکی سے اتنی محبت نہیں کرتی تھیں۔ جب وہ چار سال ان کے ساتھ پاکستان میں رہی تھی تب بھی اور اب بھی۔

''اچھا اماں جی۔ اب ذرا اٹھ کر ہم بڈھیوں کو چائے بنا کر پلا دو۔'' طیبہ ہولے سے مسکرا دیں۔ اس کی بڑی بڑی باتیں جہاں انہیں اچھی لگتیں وہاں وہ اسے اس لقب سے بھی پکارا کرتی تھیں۔

حرم نے برا سا منہ بنایا۔

''باہر سے میں آئی ہوں اور چائے بھی میں ہی بناؤں۔ یہ اچھی رہی۔''

''میں بھی باہر سے خوار ہو کر ہی آئی ہوں۔ آج تو اس فلو کی وجہ سے ہلکا سا بخار محسوس ہو رہا تھا تو جلدی چھٹی مل گئی۔

اب آ ہی گئی ہوں تو بھانجی سے کچھ خدمت تو کروالوں۔ بچپن میں بہت بھگایا ہے تم نے مجھے۔ اب ذرا تم بھی اچھی لڑکی بن کر بھاگ کر دکھا دو۔''

اب اسے یاد آیا کہ خالہ کو کل رات سے سخت نزلہ ہو رہا تھا۔ صبح وہ اسٹور چلی گئی تھیں لیکن اب بخار کی وجہ سے جلدی آنا پڑ گیا۔ وہ یہاں قریب ہی پاکستانی ڈریسز کی کپڑے کی بوتیک پہ سیلز گرل تھیں۔ اچھا کماتی تھیں۔ خالو بھی ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ تب ہی یہاں شفٹ ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی دونوں نے اپنا گھر خرید لیا تھا۔ اسی گھر میں اب وہ دونوں بھی رہ رہی تھیں جو حال ہی میں پاکستان سے انگلینڈ شفٹ ہوئی تھیں۔

''اور میری طرف تو دیکھنا بھی مت۔ میں صبح سے کچن کے ساتھ لانڈری بھی کر رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کمر نکالی ہے صوفے پر۔ جسم میں شدید درد ہے اب۔ اس لیے اچھی لڑکی بن کر اٹھو اور ہم دونوں بڈھیوں کو چائے پلا دو۔'' دونوں خواتین کی بلیک میلنگ بھی کمال تھی۔ کام کروانے کے وقت خود کو بڈھیاں کہہ دیتیں اور سارا دن جوان بنی پھرتی تھیں اور وہ جو ہمیشہ بچی ہوتی، کام لینے کے وقت 'اچھی لڑکی' بن جاتی۔

وہ منہ بناتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی تو دونوں ہی اسے مسکرا کر جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

اگلی بار وہ صبح واک کرنے کے لیے نکلی تھی جب مین روڈ پہ نکل کر کچھ آگے جا کر وہ اس سے ٹکرایا تھا۔ وہ بھی جاگنگ کرنے ہی نکلا تھا اس کے ٹریک سوٹ سے عیاں تھا۔ اس بار اسے دیکھ کر مسکرانے میں پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی۔ حرم بھی مسکرا دی۔ دیار غیر میں پاکستانی دکھائی دینا، کسی اپنے کے مل جانے جیسا ہی تھا۔ وہ اپنے پاکستانی لباس میں ہی ملبوس تھی۔ واک کے لیے اس نے کوئی مخصوص لباس نہیں پہنا تھا۔ اسے ہمیشہ سے شلوار قمیض پسند تھا۔ کبھی کبھار وہ کھلے گھیر والی فراک پہن لیا کرتی تھی جب کوئی خاص تقریب ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس نے تہیہ کیا تھا کہ وہ یہاں آ کر کبھی بھی کوئی ایسی ڈریسنگ نہیں کرے گی جو اس کے نزدیک قابل اعتراض ہو۔ اپنی حدود اس نے خود سے متعین کر رکھی تھیں جس کے لیے ممی نے اس پہ کبھی زور زبردستی نہیں کی۔ اسے خود سے پتا تھا کہ اسے کب کہاں کیسے رہنا ہے۔

"کیسی ہیں آپ۔؟" سلام اس نے کیا تھا جس کا اس نے سر ہلا کر مبہم سا جواب دیا۔

"آپ کو بھی واک کی عادت ہے۔؟" حرم ہولے سے مسکرا دی۔

سچ تو یہ تھا کہ اسے ایسے باہر نکل کر واک کی عادت نہیں تھی۔ پاکستان کے جس محلے میں وہ رہتی تھی اس کی گلی اس قابل نہیں تھی کہ وہاں واک کی جاتی۔ تنگ گلی اوپر سے ہر وقت گزرتی بائیک اور چھوٹی گاڑیاں، آگے، پیچھے ممی بھی اسے نکلنے نہیں دیتی تھیں کیونکہ سیکیورٹی تو تھی نہیں۔ اس لیے وہ اپنا شوق رات کو چھت پر جا کر پورا کرتی تھی۔ اب یہاں وہ بات تو تھی نہیں۔ چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا اور وہ بھی بند، تو اسے واک کرنے کے لیے باہر ہی نکلنا تھا۔

"مجھے مارننگ واک کی نہیں، نائٹ واک کی عادت ہے۔ لیکن موسم اتنا اچھا تھا کہ اندر رہ نہیں سکی۔ سوچا باہر کا چکر ہی لگا آؤں۔"

"پاکستانیوں کو کم ہی واک کی عادت ہوتی ہے۔" وہ ہولے سے مسکرا دی۔ وہ کافی حد تک ٹھیک بھی تھا۔ ورزش اور چہل قدمی جیسی چیزیں اب زندگی سے نکل گئی تھیں لیکن سامنے کھڑا، وہ چھ فٹ کا نوجوان جس کے سامنے وہ پانچ فٹ دو انچ کی لڑکی بونی سی لگتی تھی، کی جسامت سے لگ رہا تھا کہ وہ ورزش کے نام پہ کافی محنت کرتا ہے۔

"کب شفٹ ہوئی ہیں۔؟" وہ دونوں اب چہل قدمی کر رہے تھے۔

"دو ہفتے پہلے۔" اور اس دو ہفتے کے پیچھے خالہ کی دو سالیوں کی محنت تھی انہیں وہاں بلوانے کی۔ یہ الگ کہانی تھی۔

"اکیلی میں کون کون ہے آپ کی؟"

"بس ممی ہیں۔ بابا کی ڈیتھ ہوئی تھی دو سال پہلے۔" باپ کا ذکر کرتے ہوئے اس کا لہجہ اداس ہوا تھا۔ اس ذکر سے اس کے اندر ہمیشہ اداسی پھیل جاتی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" وہ خاموش رہی۔ اس موضوع پہ اس کے پاس بات کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا سوائے آنسوؤں کے۔

"تو یہاں کوئی ریلیٹو رہتے ہیں آپ کے؟"

"جی۔ خالہ اور انکل ہیں۔ ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ ہم ان ہی کے ساتھ انہی کے اپارٹمنٹ میں رہ رہے ہیں۔ خالہ نے ہی ہمیں یہاں بلوایا ہے۔" اس کی بات پہ وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ تامل سے اس نے پوچھا۔

"پڑھتی ہیں آپ۔؟ میرا مطلب پاکستان میں پڑھتی تھیں؟"

اس نے سر ہلایا۔

"بی ایس کیا ہے کمپیوٹرز میں۔ آگے ایم ایس کا ارادہ ہے۔"

"اور آپ؟" اس نے جلدی سے اس کے بارے میں سوال کیا۔ کب سے وہ اس کا انٹرویو لے رہا تھا۔ اپنے بارے میں تو اس نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ سچ تو یہ تھا وہ ایک نام کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

"میں کیا؟" اس نے سوالیہ اس کی طرف دیکھا۔

"آپ پڑھتے ہیں؟" اس نے سر ہلایا۔

''پڑھتا بھی ہوں اور جاب بھی کرتا ہوں۔ بلکہ دو جاب کرتا ہوں۔'' حرم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''دو دو جاب۔''

''گزارا کرنا ہے تو نوکری تو کرنا ہی ہوتی ہے۔ ایک نوکری سے گزارا نہیں ہوتا تو کبھی دو کبھی تین نوکریاں کرنا پڑتی ہیں۔'' حرم یک دم بہت متاثر سی دکھائی دینے لگی۔ بڑی بات تھی کہ پڑھائی کے ساتھ وہ دو نوکریاں کر رہا تھا۔ خود جب تک وہ پاکستان میں تھی مارے باندھے پڑھائی کرتی اور ممی کا ہاتھ بٹا کر احسان کرتی۔

''اور فیملی؟'' اس سوال پہ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

''وہ نہیں ہے۔'' حرم نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

''کوئی تو ہوگا۔''

''مما کی ڈیتھ ہوگئی تھی جب میں سال کا تھا اور ڈیڈ نے دوسری شادی کر لی۔ وہ اپنی لائف میں سیٹ ہیں اپنی دوسری فیملی کے ساتھ اور میں اپنی لائف میں کمفرٹیبل ہوں۔'' حرم کو اس کے لیے کچھ افسوس سا ہوا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں ماں کو کھو دینا، جبکہ وہ اتنی بڑی ہو کر بابا کی وفات پہ گھنٹوں رویا کرتی تھی۔

''تو وہ اب کہاں ہیں۔؟'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ حرم کو لگا کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتا۔ شاید باپ کا ذکر اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔

''یہیں ہوتے ہیں۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہیں رہتا۔'' اس کے جواب پہ اسے مزید دکھ ہوا۔

''آپ کو ان کے ساتھ رہنا چاہیے جو بھی ہو وہ آپ کی فیملی ہے۔'' وہ اس کی بات پہ ہولے سے ہنس دیا۔

''یہاں بچے بڑے ہو کر ویسے ہی اپنے ماں باپ سے الگ ہو جاتے ہیں اور آپ کو لگتا ہے کہ مجھے اپنی اسٹیپ مام کے ساتھ جڑ کر بلکہ مل جل کر رہنا چاہیے تھا جو مجھے برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔'' اس کے لہجے میں کچھ طنز تھا، نفرت بھی تھی۔ حرم کو تھوڑا عجیب سا لگا۔ اسے واقعی یہ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ یوں بھی یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا بھلا وہ کون تھی بولنے والی۔

''آپ کہاں رہتے ہیں۔؟'' جہاں تک وہ پہنچے تھے۔ وہ وہیں رک گیا۔

''بس یہاں سے قریب ہی ایک اپارٹمنٹ ہے۔ اپنے ایک جاننے والے کے ساتھ شیئرنگ پہ رہتا ہوں۔ آپ کو نہیں بتاؤں گا ورنہ آپ پیسے لوٹانے آجائیں گی۔'' وہ مضحکہ خیز انداز میں بولا تو وہ بھی ہنس دی۔

''اب نہیں لوٹاؤں گی۔ ایک پاکستانی کا اتنا فرض تو بنتا تھا کہ وہ اجنبی ملک میں دوسرے پاکستانی کی مدد کرے۔''

''جلدی سیکھ گئی ہیں آپ۔ اچھی اسٹوڈنٹ لگتی ہیں۔'' وہ ہولے سے ہنس دیا تو حرم کھل کر مسکرا دی۔

دونوں ایک دوسرے کو الوداع کہتے لوٹ گئے لیکن حرم کا دل کیا کہ وہ پھر چاہا اس سے بھی ٹکرائے۔

☆☆☆

''میں جاب کرنا چاہتی ہوں تو اس میں کیا حرج ہے ممی؟''

اس دن کے بعد سے وہ اریب سے نہیں ملی تھی لیکن اس کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اگر اسے آگے پڑھنا ہے تو اس سے پہلے، اسے جاب کرنا ہوگی۔

جاب کرنا یوں بھی ضروری تھا کیونکہ وہ اپنا اور ممی کا خرچا خود اٹھانا چاہتی تھی۔ اسے کسی پہ یوں بیٹھ کر بوجھ بننا پسند نہیں تھا۔ ایک دو دن کی تو اب بات تھی نہیں کہ چلو آج یہاں تو کل واپس۔ اب انہیں مستقل یہیں رہنا تھا۔

بابا کی وفات کے بعد وہ دونوں گھر میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ بابا کی فیملی میں بس تایا ہی تھے جو تائی کے اشاروں پہ چلتے تھے۔ ان سے اس کا تعلق بس اتنا ہی رہا تھا کہ ملتے تو سر پہ ہاتھ رکھ دیتے، پوچھ لیتے کہ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔ اس سے زیادہ کی ہمت وہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ شاید کبھی دل سے وہ محبت کرتے بھی ہوں لیکن تائی کی وجہ سے اظہار نہیں کیا۔ بھائی کی وفات کے بعد بھی انہیں۔ ایک آدھ دن دنیا داری کے لیے یقین دلایا کہ وہ ساتھ ہیں اور پھر مڑ کر خبر نہیں لی تو وہ دونوں

سمجھ ہی گئیں کہ وہ کتنا ساتھ ہیں۔

ماموں بھی ایک ہی تھے۔ ماموں اچھے تھے۔ ممانی ہتائی کی نسبت اچھی خاتون تھیں۔ اس نے ہمیشہ ممانی کو مہربان دیکھا تھا۔ نرم خو اور ملنسار عورت تھیں لیکن کوئی کتنا بھی اچھا کیوں نا ہو دوسروں کی ذمہ داری تو نہیں اٹھا سکتا۔ ماموں کا یہ احسان تھا کہ انہوں نے خود سے ممی کا جائیداد میں حصہ دے دیا تھا اور اسی حصے کے ملنے کے بعد خالہ نے ان ماں بیٹی کو اپنے پاس بلانے کی تگ و دو شروع کر دی تھی۔

خالہ ممی سے چھوٹی تھیں اور شادی کے بعد سے وہیں سیٹل تھیں۔ انہوں نے پہلے بھی بابا کو کئی بار کہا تھا کہ وہ یہاں آجائیں لیکن بابا نہیں مانتے تھے۔ بابا کو اپنے ملک سے بے حد محبت تھی اور وہ صرف بہتر مستقبل کے لیے وہاں سے نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ روٹی سوکھی جیسے بھی ہو وہ اپنے ملک سے نہیں جائیں گے۔ لیکن اب بابا کے جانے کے بعد ان دونوں کے پاس اکیلے پاکستان میں رہنے کا کوئی جواز نہیں بچا تھا۔

اکیلی جوان بیٹی کے ساتھ طیبہ ویسے بھی کرائے کے گھر میں نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے وہ خالہ کے کہنے پہ ان کے پاس آگئی تھیں۔ خالہ کا اتنا احسان بہت تھا کہ انہوں نے ان ماں بیٹی کو اپنے گھر میں ایک کمرہ دے دیا تھا۔ دیارِ غیر میں رہائش کا بندوبست ہو جانا بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ اب اس کی اتنی ذمہ داری تو تھی نا کہ اپنا اور ماں کا خرچا خود پورا کرتی۔ ممی پورا دن خالہ کے گھر کے کام کر کے ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ خالہ جب کام سے لوٹتی تھیں تو گھر کا بیشتر کام ہوا مل جاتا تھا۔ اس سے انہیں سکون مل جاتا اور تھکاوٹ اتارنے کا موقع بھی۔ وہ ممی کی شکر گزار ہوتیں جو ان کے کہے بنا ان کا اتنا سارا کام کر دیا کرتی تھیں۔ اب اسے بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھنا تھا۔ پہلے کوئی نوکری ڈھونڈنا تھی اور پھر آگے پڑھائی کا سوچنا تھا۔

"تم نے کبھی ایسے کام نہیں کیے۔ اب کیسے کرو گی؟" ممی تو اب بھی اسے چھوٹی بچی ہی سمجھتی تھیں لیکن اسے پورا احساس تھا کہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے اور یہ احساس بابا کے اس دنیا سے، جانے کے بعد ہی ہوا تھا جو یہاں کینیڈا آنے کے بعد مزید بڑھ گیا تھا۔

"نہیں کیے تو اب کر لوں گی۔ کبھی نا کبھی تو ہمیں وہ کام کرنا ہی ہوتا ہے جو پہلے کبھی نہیں کیا ہوتا۔"

"اور پڑھائی کا کیا بنے گا۔؟ وہ بیچ میں رہ جائے گی کیا؟"

وہ پاکستان سے ہی ارادہ کر کے آئی تھی کہ اسے آگے پڑھنا ہے۔ یہ بابا کی بھی خواہش تھی کہ حرم، بہت سارا پڑھے اور خود اسے بھی اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا لیکن وہ کیا کرتی کہ حالات، پہلے جیسے نہیں رہے تھے اور حالات جیسے جیسے بدلتے ہیں انسان کو خود کو بدلنا پڑتا ہے۔

"وہ بعد میں ہو جائے گی۔ پہلے میں جاب کروں گی۔ اس کے ساتھ پڑھائی۔" ممی کچھ حیران ہوئیں۔

"وہ مشکل کام کیسے کرو گی بیٹا۔؟"

"جیسے باقی سب کرتے ہیں۔ یہاں تو لوگ ایک وقت میں دو اور بعض دفعہ تین نوکریاں بھی کرتے ہیں ممی۔" اس کے سامنے یک دم اریب کی شبیہہ لہرائی تھی جو دو نوکریوں کے ساتھ پڑھائی بھی کرتا تھا اور یقیناً گھر کے کام بھی کرتا ہو گا کیونکہ وہ فیملی کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔

"سوچ لو۔" ممی کا انداز اسے یہ جتاتا ہوا تھا کہ وہ اتنی محنت کیسے کرے گی۔ یہ سچ تھا کہ اسے پڑھائی میں محنت کے علاوہ اس قسم کے کاموں کی عادت نہیں تھی لیکن اب وہ ارادہ بنا چکی تھی تو اسے ہر حال میں پورا کرنا تھا۔

"محنت کے لیے کمر باندھ لی ہے میں نے ممی! اب تو میں کر کے ہی دم لوں گی۔"

ممی اسے کچھ حیرت سے دیکھنے لگیں۔ کام کرنے کی انہیں ہمیشہ سے عادت تھی اور وہ بس ہلکا پھلکا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی لیکن اس وقت تو ان کے سامنے ایک نئی حرم کھڑی تھی، جو محنت کرنے کی بات کر رہی تھی۔

"تم ایسی نہیں تھیں۔" انہیں اندر سے خوشی ہو رہی تھی کہ ان کی بیٹی ذمہ دار ہو گئی ہے۔

''حالات بدل جائیں تو انسان بدل جایا کرتے ہیں ممی۔ آپ کو ہمیشہ محنت کرتے دیکھا ہے۔ اب آپ کی بیٹی ہونے کا کچھ حق تو ادا کرنا ہی ہے۔'' ممی کو سچ مچ اس پہ فخر ہوا۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

بابا کی تنخواہ محدود تھی اور جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی اخراجات بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں ممی نے گھر میں فروزن آئٹمز تیار کر کے بیچنے کا کام شروع کیا تھا۔ کام بہت زیادہ تو نہیں چلتا تھا لیکن اتنا ہی غنیمت تھا کہ چند پیسے اضافی کما لیتی ہیں۔ اتنی رقم مل جاتی تھی کہ اس سے ان کے ماہانہ چند اخراجات پورے ہو جاتے۔ پھر ممی کو لگا کہ اس کام کے ساتھ انہیں کچھ اور بھی کرنا چاہیے تو انہوں نے چھوٹے بچوں کو ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیں۔ ممی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انگلش میں ماسٹرز کر رکھا تھا لیکن جوانی سے ہی انہیں پیروں کی کمزوری لاحق ہو گئی تھی تو وہ گھر سے باہر نکل کر کام نہیں کر سکتی تھیں۔ بعد میں ٹیوشنز کا کام ہی اتنا چل گیا کہ انہوں نے فروزن آئٹمز والا کام ختم کر دیا۔ یوں بھی عمر کے ساتھ ان کی ہمت کم ہوتی جا رہی تھی۔ بابا ہمیشہ سے ممی کے مشکور رہے تھے، جو مشکل حالات میں شوہر کا بازو بن گئی تھیں۔ اور جب وہ سمجھ دار ہوئی تو اسے اپنی ماں پہ خود بخود فخر ہونے لگا جو اتنی محنتی تھیں۔

اگلی صبح وہ ثوبیہ سے نوکری کے لیے کہہ رہی تھی کہ وہ اسے اپنی ہی بوتیک پہ کام دلوا دے۔ ثوبیہ کا بھی وہ ہی روٹین تھا کہ اسے جاب کی کیا ضرورت ہے، وہ پڑھائی پہ دھیان دے۔

''میں پڑھائی بھی کروں گی خالہ! لیکن جاب بھی ضروری ہے۔ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ یہاں رہنا ہے تو کام کرنا ہوگا۔ آپ تینوں بھی تو کام کرتے ہیں۔ کوئی کب تک کسی کا خرچا اٹھا سکتا ہے۔ اتنا کافی ہے کہ آپ نے ہمیں رہائش دی۔ اب باقی کا کام میرا ہے۔ آپ پلیز کوئی جاب دیکھیں میرے لیے۔ میں اپنی سی کوشش کرتی ہوں۔ جاب جیسی بھی ہوئی میں کر لوں گی۔'' ثوبیہ جواباً خاموش ہو گئی تھیں۔ شاید اس نے ضرورت سے زیادہ عملی بات کر دی تھی یا مستقبل کا سوچ کر ثوبیہ کو لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

اس دن، وہ صبح سے شام اردگرد کی تمام مارکیٹس میں جاب ڈھونڈتی رہی تھی لیکن کہیں، کسی سیلز گرل کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اگلی صبح وہ اپنے علاقے سے نکل کر ذرا دور آئی تھی جہاں گھر تھوڑے بڑے بنے ہوئے تھے۔ یہ انگلینڈ تھا جہاں آپ دوسروں کے گھروں پہ ہیلپر بننے کے لیے بھی خوشی خوشی تیار ہو جاتے ہیں بھلے آپ پڑھے لکھے ہی کیوں نا ہوں۔

''سامنے والے گھر میں ایک ٹک کی ضرورت ہے۔'' ایک گھر کے باہر، مالی کا کام کرتا انگریز اس گھر کا مالک ہی تھا۔

''وہاں ایک بڈھا رہتا ہے جو کسی کو ٹکنے نہیں دیتا حالانکہ اسے کھانا نہیں بنانا آتا لیکن کسی کے ہاتھ کا کھانا بھی کم ہی پسند آتا ہے۔'' بوڑھا انگریز اپنی بات کے اختتام پہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

اس کے ہاتھ کے اشارے پر وہ اس گھر کی جانب چل دی تھی۔ گھر کی بیل بجانے پہ سامنے ایک خرانٹ سے بڈھا نکلا تھا۔ جس کی شکل ہی ایسی مکروہ تھی کہ اس نے بار۔ کرنے کے بجائے معذرت کی اور سر پہ پیر رکھ کر وہاں سے بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے سوچ لیا کہ اسے جاب، کسی شاپ میں ہی ڈھونڈنی چاہیے نا کہ کسی کے گھر میں۔

اس سے اگلے دن وہ صبح نکلی ہی تھی کہ مین روڈ پہ اسے اریب مل گیا۔ اسے دیکھتے ہی حرم کا کام نہ ملنے کی وجہ سے بگڑا موڈ اچھا ہو گیا۔

''آپ تو غائب ہی ہو گئیں اس دن کے بعد سے۔'' سلام دعا کے بعد وہ دونوں ساتھ چلنے لگے تھے۔ یہ سچ تھا کہ اس دن کے بعد سے وہ واک کے لیے صبح اٹھ ہی نہیں سکی تھی۔ آج بھی واک کے لیے نہیں اٹھی تھی بلکہ کام کے لیے نکلی تھی کہ ذرا جلدی جایا جائے۔ یہاں صبح فجر کے ساتھ اور رات مغرب کے ساتھ ہو جایا کرتی تھی۔ ہائے رے مسلمان! سچ کے کاموں میں برکت والی عادت جو ہم میں ہونا چاہیے

تھی، گوروں نے چڑھائی اور ہم زوال کے بعد کام کرنے کے عادی ہو گئے۔ اسی لیے ہم بھی زوال کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

"میں جاب ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی جاب ہو تو بتایئے گا۔" اس کی بات پہ وہ چونکا اور سوچ میں پڑ گیا۔

"ایک جاب ہے تو لیکن سیلری بہت نہیں ہوگی۔"

"چلے گی۔ جب تک کوئی بہتر نہیں مل جاتی وہ بھی چلے گی۔" وہ جھٹ مان گئی تھی۔ اریب کو یہ بات اچھی لگی تھی کہ اس نے روایتی پاکستانیوں جیسے نخرے نہیں دکھائے۔ ورنہ اسے جو بھی پاکستانی ٹکراتا شروع میں ایسے نخرے دکھاتا کہ جیسے وہاں، پرائم منسٹر کی سیٹ پہ بیٹھنے آیا ہو۔

"چلیں پھر چلتے ہیں۔" وہ اسی طرح ٹریک سوٹ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں سے پندرہ منٹ کی واک پہ رہائشی علاقے سے نکل کر، ایک ویئر ہاؤس تھا جہاں کپڑوں کی پیکنگ کا کام کیا جاتا تھا۔ اریب اسے باہر کھڑا کر کے اندر گیا تھا۔ تمام معاملات طے کر کے وہ پانچ منٹ تک باہر آیا اور مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ سے حرم کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی جاب پکی ہو گئی تھی۔

"ابھی سے جوائن کر لیں۔" خوشی سے اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"تھینک یو سو مچ اریب۔ آپ ہمیشہ جب ملے ہیں، مجھے مشکل وقت سے نکالا ہی ہے۔" اریب نے جواباً یور شکریہ کے انداز میں سر خم کیا۔

"مسٹر کیری تھوڑے سخت اور اصول پسند انسان ہیں۔ انہیں کام وقت سے ملتا رہے تو کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ دھیان رکھنا اس بات کا۔"

حرم نے سمجھ کر سر ہلایا۔

"بیسٹ آف لک۔" اس کی ہمت بندھانے کے لیے اس نے وش کیا۔

"کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتاؤ۔ اریب نے تمہاری سفارش کی ہے تو یقیناً تم اچھی ہو گی۔ مجھے صرف اچھا کام چاہیے۔ محنتی اور ایمان دار لوگ مجھے پسند ہیں اور کام چوروں کو میں یہاں ٹکنے نہیں دیتا۔" وہ بوڑھا مسٹر کیری وہاں کا سپروائزر تھا اور حرام تھا کہ پانچ منٹ کہیں ٹک کر بیٹھ جاتا۔ مسلسل ورکرز کے سر پہ گھومتا رہتا اور اپنی لال لال آنکھوں سے انہیں گھورتا رہتا۔ وہ خود بھی اپنا کام دیانت داری سے کرتا تھا اور لنچ بریک کے سوا مجال ہے جو کہیں بیٹھ جاتا اور اسی طرح کا کام سب سے بھی چاہتا تھا۔

پہلا دن تو اس کا ایک لڑکی ٹینا سے کام سیکھنے میں ہی گزر گیا۔ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔ بس اس کا دورانیہ دس گھنٹے کا تھا جو کہ اسے زیادہ لگ رہا تھا۔

پہلے دن ہی یک دم اتنا کام کر کے وہ اس قدر تھک گئی کہ پندرہ منٹ کی، پیدل مسافت طے کرتے ہوئے ہی اسے موت آنے لگی لیکن اب گھر تو جانا ہی تھا وہ بھی پیدل۔ یہاں اسے کوئی سواری نہیں ملنا تھی اور نہ ہی اتنے پیسے تھے کہ پرائیویٹ کیب کا خرچا اٹھا سکتی۔

"پاکستان میں ہوتی تو ایسی جاب کا سن کر میں کبھی اسے گھاس بھی نہ ڈالتی۔ اتنے گھنٹے کی جاب اور پھر پیدل آنا جانا۔" اسے پاکستان میں ایسی جاب اور حالات کا سوچ کر جھرجھری سی آ گئی لیکن یہاں وہی سب وہ اپنی مرضی سے کر رہی تھی۔

واپسی میں اس نے خود کو سرزنش کی تھی کہ وہ خود ترسی کا شکار نہیں ہوگی۔ یہاں ہر انسان محنت کا عادی تھا اور اسے بھی اپنی سستی سے پیچھا چھڑانا تھا وہ جو کچھ سوچ کر آئی تھی، وہ محنت کیے بنا تو ملنا نہیں تھا اسی لیے بہتر تھا کہ وہ چپ چاپ، محنتی بچی بن جاتی اور خود کو فولاد بنا لیتی۔

☆☆☆

صبح وہ فجر کی نماز کے بعد سونے کے بجائے اٹھ کر جلدی جلدی اپنا کمرہ سمیٹنے لگی۔ خالہ کو ہمیشہ سے صفائی پسند تھی اور چیزوں کی بے ترتیبی سے وہ بہت چڑتی تھیں۔ ان کی فطرت میں چیزوں کو میچ کر کے رکھنا تھا۔ اس سلسلے میں تو ممی تک خالہ سے

بہت ڈرتی تھیں، کیونکہ خالہ انہیں بھی لگے ہاتھوں سنا دیا کرتیں۔

''اتنی جلدی چلی جاؤ گی کام پہ۔'' ممی نے پوچھا حالاں کہ یہاں صبح جلدی ہو جایا کرتی تھی۔

''ابھی ناشتہ کرنے، تیار ہونے میں بہت وقت لگنا ہے مجھے ممی۔'' وہ ممی سے پہلے کچن میں پہنچ گئی۔ خالہ تک اس کے بعد آئیں تو انہیں ایک خوش گوار حیرت کا احساس ہوا۔ ایک نوکری ملنے سے وہ یک دم ایک ہی دن میں کتنی ذمہ دار ہو گئی تھی۔

''اچھا لگ رہا ہے تمہیں یوں پھرتی سے کام کرتا دیکھ کر۔'' حرم جانتی تھی کہ ثوبیہ خالہ کو ذمہ دار لوگ پسند ہیں اسی لیے وہ یہ بات کر رہی تھیں۔ وہ مسکرا دی۔

ثوبیہ اپنا اور انکل فرمان کا ناشتہ بنانے لگیں۔ ابتسام تھوڑا دیر سے جاتا تھا تو وہ اپنے لیے ناشتہ خود بنا لیتا تھا۔ ناشتے کے دوران، انکل اس سے اس کے کام کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ شاید وہ مطمئن ہونا چاہتے تھے کہ وہ کہاں اور کیا کام کر رہی ہے۔

وہ ناشتہ کر کے نکلی ہی تھی کہ مین روڈ پہ کچھ دور جا کر اسے اریب مل گیا۔ اس دن وہ پہلے سے وہاں موجود تھا جیسے اس کا منتظر ہو۔

''تو کیسا رہا کل کا دن؟'' اس کے پوچھنے کی دیر تھی کہ وہ الف سے یے تک اسے ساری تفصیل سنانے لگی جو وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے سن رہا تھا۔ مسکرا بھی رہا تھا۔ کہیں کہیں ہولے سے ہنس دیتا۔ وہ مسٹر کیری سے بہت تنگ آئی ہوئی تھی۔

''مسٹر کیری اچھے انسان ہیں۔ بس کام لینے کے معاملے میں ذرا سخت ہیں۔ لیکن جو انسان اس پوسٹ پہ ہو، سختی دکھانا اس کی مجبوری ہوتی ہے۔'' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ جو بھی کہہ دیتا مسٹر کیری اسے اچھے نہیں لگ سکتے تھے۔

''کبھی کوئی مشکل ہو تو اردگرد دوسروں سے پوچھنے سے بہتر ہے کہ تم مسٹر کیری سے پوچھ لو۔ وہ بہتر بتا بھی دیں گے اور اس سے انہیں اندازہ بھی ہو جائے گا کہ آپ وہاں کام کرنے میں سنجیدہ ہیں۔ کام سیکھنا چاہتی ہیں۔ وقت گزاری کے لیے نہیں آئیں۔'' حرم نے سر ہلایا۔

''آپ مسٹر کیری کو اتنا کیسے جانتے ہیں؟'' اس کا ویئر ہاؤس آ چکا تھا۔

''کیونکہ میں نے ان کے ساتھ دس سال کام کیا ہے۔'' اس کی بات پہ حرم کے منہ سے اوہ نکلا تھا۔

☆☆☆

پھر یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ جب گھر سے نکلتی وہ اس کا منتظر ہوتا۔ اس کے ساتھ پندرہ منٹ پیدل مسافت طے کر کے ویئر ہاؤس جاتا اور اسے وہیں چھوڑ کر لوٹ جاتا۔ کبھی کبھار حرم اپنے ناشتے کے ساتھ اس کا ناشتہ بھی بنا لایا کرتی۔ گھر کا بنا ہوا روایتی ناشتہ کھا کر اریب کو بہت خوشی ہوتی۔ ایسا پاکستانی ناشتہ اس سے نہیں بن سکتا تھا جیسا حرم بنا کر لاتی تھی۔

حرم نے یہ بات ممی کو بتائی تھی کہ اریب نے ہی اسے جاب دلوائی ہے اور وہ روزانہ اس کے ساتھ دیئر ہاؤس تک جاتا ہے۔ ممی کو پہلے تو یہ سب ٹھیک نہیں لگا لیکن وہ اریب کی اتنی تعریف کرتی تو انہیں بھی وہ لڑکا بے ضرر لگنے لگا تھا لیکن وہ اپنی تسلی کرنا چاہتی تھیں۔

پاکستان میں رہتے، حرم بھی اپنے کسی کزن سے بھی ایسے بے تکلفی سے بات نہیں کرتی تھی، جتنی بے تکلف وہ اریب سے ہو گئی تھی اسی لیے ممی کی بے چینی اپنی جگہ درست تھی۔ اپنی تسلی کے لیے چاہتی تھیں کہ وہ اس سے ایک آدھ بار مل لیں۔

''تم اسے کسی دن گھر پہ انوائٹ کرو۔ سب سے ملواؤ۔'' اسے ممی کی بات پسند آئی تھی۔ اگلے دن ہی اس نے اریب کو کھانے کی دعوت پہ آنے کا کہا تھا۔

''میں سارا دن بزی ہوتا ہوں۔'' اس کی بات پہ وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ویک اینڈ پہ تو آ سکتے ہیں۔''

''ویک اینڈ پہ کچھ اور کمٹمنٹس ہوتی ہیں۔'' اس کے انداز سے حرم کو لگا کہ وہ صاف ٹال رہا ہے۔ اسی لیے وہ پھر خاموش ہو گئی۔ شاید اسے کسی سے ملنے

ملانے کی عادت نہیں تھی اور وہ تنہا رہنا پسند کرتا تھا۔ اس نے دوبارہ اس موضوع پہ بات نہیں کی۔

اس کی جاب کو ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ تب ہی ایک دن اریب صبح وہاں نہیں آیا تھا، جہاں روز اسے ملتا تھا۔ حرم کو کچھ تعجب ہوا لیکن یہی سوچا کہ اسے کوئی کام ہوگا۔

اگلے دن بھی وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ دوسرے دن اسے وہاں نہ پا کر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا اور اسے کچھ تشویش ہوئی تھی کہ کہیں وہ کسی مشکل میں نہ ہو۔ اپنی بے وقوفی پہ غصہ بھی آیا تھا کہ نہ تو اس نے اس کا پتا لیا تھا اور نہ ہی فون نمبر مانگا تھا۔ کوئی سرا تو ہوتا تا کہ وہ اس کی خیریت معلوم کر سکتی لیکن اس کی ہمیشہ کی لاپرواہ فطرت بھی نہیں جاتی تھی، چاہے وہ کتنا ہی محتاط ہو جاتی۔

اس طرح پورا ہفتہ گزر گیا کہ اریب سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کتنی بار وہ مسز کیری سے بے دھیانی کی وجہ سے ڈانٹ بھی کھا چکی تھی۔ گھر میں بھی اس کی عجیب سی حالت تھی اور اس کی بیزاریت کو سب ہی محسوس کر رہے تھے۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری...؟" کھانے کی میز پہ ثوبیہ خالہ نے اسے کھویا کھویا دیکھ کر پوچھا تو وہ جبراً مسکرا دی اور سر ہلا دیا۔ اس کے بعد سے اس نے خود کو سب کے درمیان نارمل رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور شاید وہ اس اداکاری میں کامیاب بھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ طیبہ سے نہیں چھپا سکتی تھی کہ وہ اس کی ماں تھیں اور کسی بھی دوسرے انسان سے زیادہ اسے جانتی تھیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے کہ ایک دم ہر چیز سے تمہاری دلچسپی کم ہو گئی ہے حرم؟" رات کمرے میں لیٹتے ہوئے انہوں نے بغور اسے دیکھا اور وہ پھوٹ پھوٹ رو دی۔

ان کے لیے یہ صورت حال نئی تھی۔ آخر ایسا بھی کیا ہو گیا تھا اور یہ بات تو حرم بھی سمجھنے سے قاصر تھی کہ بھلا ایسا بھی کیا ہو گیا تھا۔

"سب ٹھیک ہے نا حرم...؟ کیا کہیں کچھ ہوا ہے...؟" اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اریب ہفتے سے لاپتا ہے ممی۔ اسی لیے میں پریشان ہوں۔" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا تو ممی بھی کچھ پریشان ہو گئیں۔

"کہاں لاپتا ہو سکتا ہے؟"

"ایک ہفتے سے وہ نہیں آ رہا۔ پتا نہیں وہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں۔ اور میں اتنی بے وقوف ہوں کہ اس سے نہ پتہ لیا نہ نمبر۔"

"ہو سکتا ہے اسے کوئی کام ہو یا وہ اپنے فادر سے ملنے گیا ہو۔ یوں بچوں کی طرح پریشان ہونا بند کرو حرم۔ ویسے ضروری تو نہیں کہ تمہیں بتا کر جاتا اور یوں کسی اجنبی کے لیے پریشان ہونا کہاں کی عقلمندی ہے۔" ممی اسے سمجھا رہی تھیں لیکن ان کا لہجہ کچھ سخت تھا جیسے انہیں اس کا اریب کے لیے فکرمند ہونا اچھا نہ لگا ہو۔

بعد میں حرم نے خود کو سرزنش کی کہ اسے ممی کے سامنے محتاط رہنا چاہئے تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں کہ اسے اچانک کسی کام سے جانا بھی تو پڑ سکتا تھا۔ وہ خواہ مخواہ یوں بچوں کی طرح رو دی تھی۔ لیکن وہ اپنی ہی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھی اور جب تنہائی میں رات کے کسی پہر بھی اس کے ذہن نے اریب کو ہی سوچا تو اسے یہ ماننا پڑا کہ اسے اس شخص کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اس کی غیر موجودگی اسے کھٹک رہی ہے۔ یہ اس کا خود سے پہلا اعتراف تھا، جس نے خود اسے بھی چونکا دیا تھا۔

☆☆☆

ٹھیک ڈیڑھ ہفتے کی غیر موجودگی کے بعد، جب وہ کھوئی کھوئی سی چلتی ہوئی ویئر ہاؤس جا رہی تھی تو وہ کسی جن کی طرح نمودار ہو کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ہیلو سیڈ لیڈی۔" حرم سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی وہی تھا یا اسے اب اس کا بھوت بھی نظر آنے لگا تھا۔

"کیا ہوا؟ اتنی شاکڈ سی کیوں ہو...؟ یہ میں ہوں اریب۔" اس کے سامنے اپنا ہاتھ لہراتے وہ اس پہ طاری سکتے کو توڑنے کی کوشش میں تھا۔

pklibrary.com

حرم جیسے ہوش میں آئی اور یک دم اس کو دھکا دے کر پرے کیا۔

"کہاں تھے تم؟" اریب کے لیے اس کا ری ایکشن شاکنگ تھا۔

"اتنے دنوں سے کہاں تھے میں پوچھ رہی ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر اسے پھر سے اتنی زور کا دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔

"میں کتنا پریشان ہوئی کچھ پتا ہے۔" موٹے موٹے آنسو حرم کی آنکھوں میں تھے۔ اریب حیران پریشان دیکھ رہا تھا۔

"حرم۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ وہ اس کے کندھے پہ اپنے ہاتھ سے ضربیں لگاتے ہوئے اسے پیچھے دھکیل رہی تھی۔

"کیسے کیسے خیال نہیں آرہے تھے مجھے کہ کہاں چلے گئے ہو۔ اتنے دن صرف اور صرف پریشانی میں گزرے۔ سمجھ میں نہیں آتی تھی کیا کروں، کس سے کہوں۔" اب آنسو اس کے گالوں پہ تھے اور وہ انہیں چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔

"حرم۔ پلیز۔ لسن۔" وہ وضاحت دینا چاہتا تھا لیکن وہ سن کہاں رہی تھی۔

وہ ایک طرف فٹ پاتھ پہ بیٹھ کر، گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ اریب کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ ہی آکر بیٹھ گیا۔

"حرم! مجھے جلدی میں آؤٹ آف سٹی جانا پڑ گیا ورنہ میں بتا کر جاتا۔ آئی ایم سوری۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنی پریشان ہوگی ورنہ میں رات کے دو بجے بھی تمہارے گھر کے باہر ہوتا اور تمہیں انفارم کر دیتا۔ آئی ایم رئیلی سوری۔" حرم اسی طرح روتی رہی۔

"پلیز حرم۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ کمپنی کا ارجنٹ کام تھا تو مجھے جانا پڑا۔" اس نے بے بسی سے کہا تو حرم نے سر اٹھا کر قمیص کی آستینوں سے اپنے آنسو رگڑے۔

"میں نے سوچا کہ میں تمہیں ڈھونڈوں لیکن کہاں ڈھونڈوں مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ میں تمہارا گھر جانتی تھی، نہ گلی، نہ تمہارے آفس کا اتا پتا تھا، نہ یونی ورسٹی کا۔ میرے پاس تو تمہارا فون نمبر تک نہیں تھا اریب۔" اریب خاموشی سے اسے روتے ہوئے کہتے دیکھ رہا تھا۔

"اور تب میں نے پہلی بار سوچا کہ میں کتنی بے وقوف ہوں کہ ایک اجنبی انسان، جو روز میرے ساتھ چلتا تھا، جس کے بارے میں اس کے نام سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی تھی، کا میں نے خود سے بھی زیادہ اعتبار کر لیا۔ میں اس کے لیے پریشان ہوں، آنسو بہا رہی ہوں۔ اور ایک وہ ہے، مجھے بتا بھی نہ سکا کہ کہاں گیا۔ تم ہی میرے لیے اہم تھے، اتنے اہم کہ تمہارے چلے جانے سے جیسے سب ختم ہو گیا اور میں اتنی غیر اہم تھی کہ تمہیں پرواہ نہیں تھی کہ مجھ پہ کیا گزرے گی۔" اریب نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو حرم نے اس کی بات سے پہلے ہی تیزی سے کہا۔

"لوگ ٹھیک کہتے ہیں اریب۔ ساتھ تو اجنبی بھی چلتے ہیں۔ ہم واقعی اجنبی ہی ہیں۔" وہ تیزی سے اٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے رستے پہ چلی گئی۔ اریب خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

جب وہ شام کو چھٹی ہونے کے بعد، آفس سے نکلی تو وہ اس کا باہر ہی ایک بینچ پہ بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ حرم نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ سیدھی اپنے رستے پہ بڑھ گئی۔

اریب اسے آگے بڑھتا دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔

"میں کب سے یہاں باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تم مجھے اگنور کر کے آگے بڑھ رہی ہو۔"

"میں نے تمہیں نہیں کہا انتظار کرنے کو۔ تم جا سکتے ہو۔" اس کا روکھا پھیکا لہجہ ایک لمحے کے لیے اریب کو گنگ کر گیا لیکن وہ وہاں خاموش رہنے نہیں آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

"آج میں نے یونی ورسٹی سے آف کیا ہے تاکہ تم سے اس وقت مل سکوں۔ اس لیے واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے لہجے کو

بشاش بنایا۔

"بہت شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہیں اپنے ضروری کاموں کو اہمیت دینا چاہیے تھی جیسے تم ہمیشہ کرتے ہو۔"

اریب چلتے ہوئے اس کے سامنے آ گیا تو حرم کو رکنا پڑا۔

"مانتا ہوں کہ غلطی ہوئی ہے مجھ سے، جو تمہیں بتائے بغیر غائب ہو گیا۔ تو اب کیا کروں یار۔؟ رات واپس آیا تھا اور صبح تمہارے سامنے تھا۔ ابھی بھی تمہیں منانے کے لیے یورنی ورسٹی نہیں گیا۔ اب مان جاؤ۔ میری بات سن لو پلیز۔" حرم ایک طرف رخ کیے کھڑی رہی اور پھر ایک طرف سے نکل گئی۔ اریب اس کے پیچھے لپکا۔

"حرم۔ اب یہ لاسٹ ٹائم ہے۔ اگر تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ نہیں ملنا چاہتی تو بتا دو۔ میں چلا جاتا ہوں اور آئندہ بھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔" حرم رکی۔ اسے گھورا اور ہاتھ میں تھاما بیگ اسے گھما کر دے مارا جو اس کے کندھے پہ لگا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔؟" اپنے کندھے کو رگڑتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔

"یہ اس بدتمیزی اور بے حسی کا جواب ہے جو تم نے دکھائی تھی یہاں سے جاتے۔" اریب نے منہ بگاڑ کر پوچھا۔

"اب حساب برابر ہوا یا ابھی بھی رہتا ہے؟" حرم نے سر ہلایا۔

"ہوا تو نہیں ہے لیکن باقی کا حساب معاف کیا۔"

"مطلب اتنے دھکے دے کر بھی کہہ رہی ہو معاف کیا۔ کندھا توڑ کر بھی کہہ رہی ہو معاف کیا۔" وہ چیخ پڑا۔

"شکر کرو سر نہیں توڑا اور اس سے پہلے ہی معاف کیا۔" حرم نے اس بار ادا سے گردن اکڑائی تو اریب کی ہنسی نکل گئی۔

"وہ صبح کیا کہہ رہی تھیں تم ہم اجنبی ہیں۔"

"تو کیا غلط کہا۔؟" وہ ابھی بھی نروٹھے پن سے ہی بول رہی تھی۔

"اجنبی ہیں تو اچانک ہم 'آپ سے تم' کیسے ہو گئے ایک دوسرے کے لیے؟" اور یہ تو حرم نے اب نوٹ کیا تھا کہ وہ صبح سے اسے تم کہہ کر بلا رہی تھی اور وہ بھی اسے تم ہی کہہ رہا تھا۔ بے تکلفی کی دیوار چنج گئی تھی۔ فاصلے کم ہوئے تھے۔

دونوں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر یک دم ہنس پڑے۔

"چلو اس سے یہ تو پتا چلا کہ میں کتنا اہم انسان ہوں۔ اگر میں غائب نہ ہوتا تو مجھے پتا کیسے چلتا کہ کسی لڑکی کے لیے میں اتنا اہم ہو چکا ہوں۔" وہ اب کالر اکڑانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"بالکل بے کار ہو۔" حرم مسکراتے ہوئے اب چلتی جا رہی تھی۔ سڑک ڈھلوانی تھی تو اس کی چلنے کی رفتار خود بخود تیز تھی۔

"جی جی۔ تب ہی تم اتنا پریشان رہیں میرے جانے سے۔ میرے آتے ہی غصہ ہونے لگیں۔ مجھے مارنے لگیں۔ جھگڑنے لگیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یقیناً میرے پیچھے بھی روتی رہی ہو گی۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اب مان جاؤ کہ میں اتنا اہم ہوں۔"

"لیکن میں تو نہیں ہوں نا۔ تب ہی تم اتنی آسانی سے مجھے چھوڑ گئے تھے۔" اریب ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

وہ اس کے سامنے رستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی انٹریٹ آ چکی تھی۔ وہ اس کے جانے سے پہلے اپنی بات کہنا چاہتا تھا۔

"تم اتنی اہم ہو حرم، کہ اب میں تمہیں زندگی سے بھی جانے نہیں دے سکتا، چھوڑ کر جانا تو دور کی بات ہے۔" حرم نے بے یقینی سے اسے دیکھا جو اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ گیا تھا۔

اس کی بات پہ حرم کا رنگ سرخ ہوا تھا۔ وہ

جلدی سے اسے اللہ حافظ کہہ کر چلی گئی۔ اریب اس کے تاثرات سے محظوظ ہو کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

اس دن گھر لوٹ کر وہ بے حد خوش تھی۔ اس کی کھلی کھلی رنگت دیکھ کر طیبہ اس سے پوچھے بنا نہیں رہ سکیں۔

"اریب واپس آ گیا ہے کیا؟" اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے تو ممی سے کچھ کہا بھی نہیں تھا پھر انہیں کیسے پتا چل گیا۔

"آپ کو کس نے بتایا۔؟"

"تمہاری شکل نے، جو سو واٹ کا بلب بنی ہوئی ہے۔"

ممی کی بات پہ وہ جھینپ گئی تھی۔ طیبہ نے اسے بغور دیکھا۔

"پہلی بار تم کسی لڑکے کا نام میرے سامنے لے رہی ہو اور پہلی بار ہی تمہارا چہرہ کسی کے نام پہ ایسے کھل جاتا ہے۔" ممی کی بات نے اسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ممی اتنا زبردست تجزیہ کر رہی تھیں کہ اس سے کچھ بولنا محال تھا۔

"آئی تھنک یو لائک ہم۔" اس سے ماں سے نظریں ملانا مشکل ہو گیا تھا۔ طیبہ اس کا چہرہ بغور دیکھتی رہیں۔ ان کا اندازہ ٹھیک تھا۔

"اگر وہ بھی سیریس ہے تو اسے گھر بلواؤ۔ اور اگر وہ سیریس نہیں ہے تو بھول جاؤ۔"

"وہ سیریس ہے۔" اس نے جھٹ سے کہا۔

"سیریسلی۔؟" ممی نے اسے ابرو اچکا کر جتاتی نظروں سے دیکھا تو وہ پھر سے نظریں جھکا گئی۔ اسے بے حد شرم آ رہی تھی۔

"اتنی جلدی تمہیں پتا بھی چل گیا کہ وہ سیریس ہے۔"

طیبہ کچھ دیر اس کے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد مسکرا دیں۔ ان کی بیٹی اب بھی ان کے سامنے مشرقی لڑکیوں کی طرح شرما رہی تھی۔ انہیں اچھا لگا تھا۔

"کل تم مجھے اس کا نمبر لا کر دو۔ میں اسے خود انوائٹ کروں گی۔" اس نے سر ہلا دیا۔ ممی کو دیکھا تو ان کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ وہ جلدی سے ماں سے لپٹ گئی۔

"تھینک یو سو مچ ممی۔ آپ نے ہمیشہ میری خوشی کو ہی سامنے رکھا ہے۔" طیبہ اس کی پشت تھپکنے لگیں۔

"کیونکہ میری ایک ہی تو خوشی ہے، اور وہ ہے میری بیٹی۔"

☆☆☆

طیبہ نے اگلے دن ناشتے پہ حرم کے جانے کے بعد ثوبیہ سے یہ بات ڈسکس کی تھی۔ پہلے جب وہ پاکستان میں تھیں تب بھی فون پہ ثوبیہ سے ڈسکس کیا کرتیں اور اب یہاں وہ ان کے ساتھ تھیں۔ وہ عقل و سمجھ داری میں ثوبیہ کو کچھ زیادہ سمجھتی تھیں کہ وہ ان کی نسبت زیادہ چیزوں کو سمجھتی ہیں۔ شادی سے پہلے بھی وہ ہر موقع پہ آگے آگے ہو کر سب سنبھال لیا کرتی تھیں۔ بکھرے کاموں اور کنفیوزڈ لوگوں کو ایک لائن میں لگانا انہیں بخوبی آتا تھا۔

ثوبیہ طیبہ کے منہ سے یہ بات سن کر بالکل شاکڈ سی دیکھنے لگیں۔

"تم یہ بات حرم کو کہنے سے پہلے مجھے نہیں بتا سکتی تھیں۔" طیبہ نے کچھ ناسمجھی سے بہن کو دیکھا۔

"جب سے ابتسام پیدا ہوا ہے میں نے سوچا تھا کہ حرم ہی میری بہو بنے گی اور تم نے کتنی آسانی سے ایک انجان لڑکے کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔" طیبہ کچھ پریشان ہو گئیں۔ یہ کیا نیا ماجرا تھا۔ حرم اور ابتسام۔ ابتسام حرم سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ بھلا وہ اس بارے میں کیسے سوچ سکتی تھیں۔

"لیکن ثوبیہ! حرم اور ابتسام کی عمروں میں بہت فرق ہے۔ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔" انھوں نے بہن کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ غصے میں تھیں تو کہاں سمجھتیں۔

"جب مجھے کوئی اعتراض نہیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"حرم نہیں مانے گی اپنے سے چھوٹے لڑکے

سے شادی کے لیے تو یہ۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"تم سمجھاتیں وہ کیوں نا سمجھتی۔" فی الوقت وہ خود کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھیں۔

"میں حرم پہ کبھی زبردستی نہیں کرتی تم جانتی ہو۔"

"زبردستی اور طریقے سے سمجھانے میں فرق ہوتا ہے۔ میں خود اس سے بات کروں گی۔ ایک انجان لڑکے کی نسبت ابتسام زیادہ قابل اعتبار ہے یا نہیں۔ پھر دونوں بچے آنکھوں کے سامنے ہوں گے تو ہمیں بھی کتنا اطمینان ہوگا۔ ایسے کسی بھی راہ چلتے لڑکے کو کیسے اپنی بچی تھما دیں جس کا آگے پیچھے کا کچھ پتا ہی نہیں ہے۔" طیبہ پریشان ہو کر خاموش ہو گئیں۔ بہن کی بات بھی ٹھیک تھی لیکن انہیں حرم کی خوشی عزیز تھی۔ عجیب کشمکش میں پھنس گئی تھیں۔

☆☆☆

حرم جب اریب سے ملی تو ملتے ہی موبائل نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اس پہ اپنا نمبر سیو کر دو۔" اریب نے موبائل لے کر اپنا نمبر سیو کر دیا۔

"آج ممی تمہیں کال کریں گی۔" موبائل واپس لے کر اس نے بیگ میں ڈالا تو وہ ٹھٹکا۔

"وہ کیوں۔؟"

"تمہیں گھر پہ انوائٹ کرنے کے لیے اور کیوں۔ تم سے ملنا چاہتی ہیں وہ۔" اریب چپ ہو گیا تھا۔

"اب مت کہنا کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ جس لڑکی کو زندگی میں شامل کرنے کی بات تم کر چکے ہو۔ اس کے والدین کو مطمئن کرنے کے لیے ملنا تو ہوگا نا۔" وہ اب بھی خاموش رہا۔

"کوئی مسئلہ ہے کیا۔؟" اس کی خاموشی حرم کو کھٹک رہی تھی۔

"شاید وہ مجھ سے مل کر زیادہ خوش نہ ہوں۔"

"کیوں خوش نہیں ہوں گی۔ تم ہر لحاظ سے اچھے ہو۔" اس سے پہلے اس نے اریب کو اپنے بارے میں یوں کہتے نہیں سنا تھا۔ وہ کہیں سے بھی کمتری کا شکار نہیں لگتا تھا حالانکہ وہ سمجھتی تھی کہ اپنے باپ کی شادی کی وجہ سے وہ مشکلات کا شکار رہا ہوگا۔

"ہو سکتا ہے کہ میں انہیں اچھا نہ لگوں۔" حرم الجھ گئی۔

"کیوں اریب؟ تم اچھے ہو اور میرے خیال سے تم ہر کسی کو اچھے ہی لگتے ہو گے۔"

وہ اور خاموش رہا۔

"اگر میں انہیں اچھا نہ لگا تمہارے لیے تو تم کیا کرو گی۔؟" حرم اسے ٹھہر کر دیکھنے لگی۔ اس حد تک تو اس نے سوچا نہ تھا۔

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔" وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند ہی رکھنا چاہتی تھی۔

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے فادر کو پسند نہ آؤں۔" وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ایسا کوئی چانس نہیں ہے۔ تم انہیں کسی بھی طرح بری نہیں لگ سکتیں۔ شاید اسی لیے مجھے تم اپنے لیے پسند آئی ہو۔"

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں آگے بڑھنے لگے۔

☆☆☆

شام میں حرم خوشی خوشی گھر واپس لوٹی تھی۔ یہ وچ کر کہ وہ ممی کو نمبر دے گی اور وہ اریب سے کال پہ بات کریں گی لیکن ممی کا موڈ دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ مارے باندھے انہوں نے اس سے موبائل تھام تو لیا لیکن ہاتھ میں تھام کر بس اسے دیکھتی رہیں۔

حرم کی مسکراہٹ یک دم سمٹ گئی۔ اسے کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"کیا ہوا ممی۔؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔؟"

"اگر تمہیں اریب اور فیملی میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو تم کسے چنو گی۔؟" حرم پلکیں جھپکے بغیر انہیں دیکھنے لگی۔ یقیناً کچھ ہوا تھا جو وہ ایسے بات کر رہی تھیں ورنہ رات تک تو سب ٹھیک تھا۔

"ممی۔"

''اریب کو ہم نہیں جانتے حرم، لیکن ابتسام کو ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' ابتسام کے نام پہ وہ ٹھٹکی۔

''یہ ابتسام کا یہاں کیا ذکر؟ اور آپ کو اسے اریب سے کیوں کمپیئر کر رہی ہیں۔؟'' اس نے الجھ کر ماں کو دیکھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس اندر اتاری اور اگلی بات کے لیے خود کو تیار کیا۔

''کیونکہ تمہاری خالہ یہ چاہتی ہیں۔'' ممی کے منہ سے صاف بات سن کر بھی اسے یقین نہیں آیا کہ خالہ کیا چاہتی ہیں۔

''واٹ؟''

''انہوں نے ابتسام کا پروپوزل میرے سامنے رکھا ہے۔'' حرم اپنے بیڈ پہ ڈھے گئی۔ منہ بے یقینی سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تم اور ابتسام ایک رشتے میں بندھ جاؤ تو دونوں ہماری نظروں کے سامنے رہو گے۔'' ممی کسی روبوٹ کی طرح بولے جا رہی تھیں۔ وہ الفاظ ان کے نہیں، خالہ کے تھے وہ جانتی تھی۔

''ان بلیو ایبل۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے ممی۔ بلکہ ساڑھے پانچ سال۔ وہ اتنا انمیچور ہے کہ ابھی تو خالہ کو اگلے دس سال اس کی شادی کا نہیں سوچنا چاہیے۔'' کچھ الجھ کر، کچھ غصے سے، کچھ تپ کر اس نے کہا۔

''اریب ایک انجان انسان ہے اور ابتسام اپنا ہے۔ خون ہے ہمارا۔ گھر کا بچہ ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہے حرم۔'' ممی اسے دلائل ایسے دے رہی تھیں کہ بس خالہ کی سب ہی باتیں دہرانے بیٹھی ہوں اور ان سب باتوں سے متفق ہو کر بھی متفق نہ ہوں۔

''اگر آپ مجھے منانے کا کام کر رہی ہیں۔ کنوینس کرنا چاہتی ہیں تو پلیز یہ کام رہنے دیں۔ کیونکہ میں بالکل بھی کنوینس نہیں ہوں گی۔ جہاں تک خالہ کی بات ہے تو ان سے میں خود بات کروں گی۔ کیونکہ آپ ان سے دبتی ہوں گی، میں نہیں۔'' وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے نکلی تو طیبہ اسے روکتے ہوئے اس کے پیچھے گئیں۔ اتنا سا ماچس کی ڈبی جتنا تو گھر تھا۔ ایک کمرے سے نکل کر دوسرے میں پہنچ جاؤ۔ اس سے پہلے کہ طیبہ اسے روکتیں۔ حرم ثوبیہ کے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے خالہ۔'' وہ جس تیز لہجے میں تیزی سے دروازے میں کھڑے ہو کر کہہ رہی تھی، ثوبیہ نے اسے دیکھا اور پیچھے بے بسی سے لب کچلتی طیبہ کو دیکھا۔

''تمہارے انداز سے لگتا ہے کہ تمہاری ماں تم سے بات کر چکی ہے۔'' اپنی عینک اتار کر ہاتھ میں لیتے انہوں نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔

''جو آپ چاہتی ہیں وہ نہیں ہو سکتا خالہ۔''

''کیوں کیا مسئلہ ہے اس بات میں۔؟'' اس نے تلملا کر خالہ کو دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ کسی کو پسند کرتی ہے پھر بھی یہ سوال کر رہی تھیں۔

''میں کسی اور کو لائیک کرتی ہوں آپ یہ بات جانتی بھی ہیں پھر بھی آپ نے ممی سے یہ کہا۔''

''اس عمر میں ایسی لائکنگ ہو جایا کرتی ہے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن بڑے جو فیصلہ کرتے ہیں بہتری اسی میں ہوتی ہے۔'' وہ تحمل سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''ابتسام مجھ سے چھوٹا ہے، نان سیریس سا ہے۔ اس کی اور میری کیمسٹری کبھی نہیں مل سکتی تو ہم کیسے اکٹھے ساری زندگی گزار سکتے ہیں خالہ۔''

''شادی سے پہلے سب ہی لڑکے ایسے ہی نان سیریس ہوتے ہیں۔ بیویاں آ کر سب ٹھیک کر دیتی ہیں۔ جہاں تک بات عمر کی ہے تو اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہارے انکل سے بارہ سال چھوٹی ہوں تو کیا ہم نے ایک اچھی زندگی نہیں گزاری۔؟'' خالہ اس کی ایک ایک بات کو رد کر رہی تھیں۔

''خالہ! یہ ممکن نہیں ہو گا پلیز۔ مجھے جیسا پارٹنر چاہیے، اریب ویسا ہی ہے۔ میں ابتسام کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔ آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے۔'' وہ تیکھے لہجے میں کہہ رہی تھی لیکن سامنے بیٹھی اس کی

خالدہ پہ کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''آپ تو ہمیشہ میری دوست رہی ہیں۔ میری ساری باتیں سمجھتی رہی ہیں۔ تو اب کیا ہوا۔؟ زندگی کے اتنے اہم فیصلے میں آپ میرے ساتھ یہ کر رہی ہیں۔'' صرف رونے کی کسر رہ گئی تھی۔

ثوبیہ اس کی روہانسی صورت دیکھتی رہیں اور پھر طیبہ کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے اس لڑکے کو بلواؤ۔ اگر وہ ہر طرح سے ابتسام سے بہتر ہوا تو فیصلہ اس کے حق میں ہو سکتا ہے ورنہ تمہیں ہماری بات ہی ماننا ہوگی۔''

حرم جیسے کھل اٹھی تھی۔

''تھینک یو خالہ۔'' اس نے خالہ کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

اسے یقین تھا کہ اریب ہر لحاظ سے ابتسام سے بہتر ہے اسی لیے فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔

کمرے میں جا کر اس نے اپنے موبائل سے ہی کال ملا دی تھی۔ دوسری طرف کال جاتی رہی لیکن اریب نے اٹھایا نہیں۔

رات تک وقفے وقفے سے وہ کالز کرتی رہی۔ اس نے میسجز بھی چھوڑے لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اب پریشانی واجب تھی۔ آخر وہ کہاں تھا۔ وہ اسے بتا کر بھی آئی تھی کہ ممی اس سے بات کرنا چاہتی ہیں تو کال کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔

طیبہ کچن کے کام سمیٹ کر کمرے میں آئیں تو اسے یہاں سے وہاں بے چینی سے چکر کاٹتے دیکھا۔

''کیا ٹینشن ہے اب۔؟''

''اریب کال نہیں اٹھا رہا۔ نہ کسی میسج کا جواب دے رہا ہے۔''

''وہ سیریس تو ہے نا حرم۔؟'' حرم نے تڑپ کر ممی کو دیکھا۔

''پہلے وہ اچانک غائب ہو گیا۔ پھر اب کال نہیں اٹھا رہا۔ مجھے تو اس بندے کی سمجھ نہیں آ رہی۔'' اس کا اپنا دل برا ہو رہا تھا۔ ممی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔

وہ خود بھی اس وقت اریب کو نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔

☆☆☆

اگلے دن وہ جیسے ہی اس سے ملا تو وہ منہ موڑ کر چلی گئی۔

''آئی ایم سوری حرم۔ میں کل جلدی سو گیا تھا اور سیل سائلنٹ تھا۔ میں نے صبح اٹھ کر تمہارے میسجز دیکھے۔'' حرم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں آج تمہاری ممی سے خود بات کروں گا۔ بلکہ تم ابھی مجھے کال ملا دو۔ میں ابھی بات کرتا ہوں۔'' حرم وہیں رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''جانتے ہو کہ کل خالہ نے کیا ہنگامہ ڈال رکھا تھا جب میں گھر پہنچی۔'' اس کی بات وہ چونکا۔

''کیسا ہنگامہ۔؟''

''وہ اپنے بیٹے سے میری شادی کروانا چاہتی ہیں۔ ممی کو ٹھیک ٹھاک کنوینس کر لیا تھا۔ بلکہ ایموشنل بلیک میل کہنا چاہیے۔ اتنی مشکل سے سارا معاملہ ہینڈل کیا ہے میں نے۔ اوپر سے معاملہ ہینڈل کر کے جب تمہیں کال کی تو تم غائب تھے۔ ممی مجھ سے پوچھتی ہیں کہ اریب سیریس تو ہے۔ اور میں ان کی شکل دیکھتی ہوں اور خود سے پوچھتی ہوں کہ واقعی وہ سیریس ہے۔؟ اور اب میں تم سے پوچھتی ہوں کہ کیا تم سیریس ہو۔؟'' وہ ناراض تھی۔ جتا بھی رہی تھی۔ غصہ بھی اتار رہی تھی۔

اریب نے گہری سانس لی۔

''کیا میں تمہیں سیریس نہیں لگتا؟''

''تم مجھے اب مسٹیریس زیادہ لگنے لگے ہو۔''

اریب نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیا۔

''ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ مزید تپ گئی۔ اس کی جان پہ بنی تھی اور اسے ہنسی سوجھ رہی تھی۔

''اوکے۔ آئی ایم سوری۔ تم ابھی ممی سے بات کرواؤ میری تاکہ تم دونوں ماں بیٹی کو یقین آ جائے کہ میں سیریس ہوں یا مسٹیریس۔؟''

حرم نے اسے فون ملا دیا۔
اس نے سلام دعا کے بعد اپنا تعارف کروایا اور پوچھا۔
"آپ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھیں آنٹی۔ لیکن اس سے پہلے یہ جان لیں کہ میں آپ کی بیٹی کے لیے بہت سیریس ہوں۔"
ممی کو یہ بات سن کر اطمینان حاصل ہو گیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔
"میں نے آپ کو کل رات ڈنر پہ انوائٹ کرنے کے لیے کال کرنا تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ کل رات آپ ڈنر پہ آئیں تا کہ ہم سب آپ سے مل سکیں۔" اریب پہلے کچھ دیر خاموش رہا پھر گلا کھنکارا۔
"میں آ جاؤں گا۔ مجھے آنا تو تھا ہی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ آپ مجھ سے اور میری فیملی سے مل لیں لیکن چلیں یوں ہی سہی۔"
"کل رات ملاقات ہوتی ہے ان شاء اللہ۔" طیبہ نے کال کاٹ دی۔
حرم کے کندھوں سے سارا بوجھ اتر گیا اور ایک سکون کا سانس لیا۔
"خالہ نے شرط رکھی ہے ۔ ۔رے سامنے۔" اب جبکہ وہ ممی کی دعوت قبول کر چکا تھا اور وہ اس سے مزید خفا نہیں تھی تو اس نے بتانا شروع کیا۔
"کیسی شرط۔؟"
"یہی کہ اگر تم ہر لحاظ سے انہیں ابتسام سے بہتر لگے تو وہ تمہارے حق میں فیصلہ دے دیں گی۔"
اس کی بات پہ اریب طنزیہ مسکرایا تھا۔
"کسی ماں کو اپنے بیٹے کے مقابلے میں کیا کوئی دوسرا پسند آ سکتا ہے؟ ان کا فیصلہ کبھی میرے حق میں نہیں ہو سکتا۔" پھر سر جھٹک کر بولا۔
"تمہارے انکل کیا کہتے ہیں۔ ان کی کوئی رائے نہیں ہے؟" حرم نے شانے اچکائے۔
"پتا نہیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ سے دیکھا ہے کہ خالہ انکل پہ اپنے فیصلے صادر کر دیتی ہیں اور انکل اتنے سادہ اور شریف انسان ہیں کہ چپ چاپ خالہ کی مان لیتے ہیں۔ حالانکہ میں نے اپنے گھر میں ایسا نہیں دیکھا تھا۔ ممی ہمیشہ بابا سے ڈرتی تھیں۔ ان کی عزت کرتی تھیں۔ ان کے فیصلوں پہ چلنے کی عادی تھیں۔ خالہ کو ایسی کوئی عادت نہیں ہے۔ اس لیے انکل کی رائے کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔"
تب تک اس کا ویئر ہاؤس آ چکا تھا۔
"چلو پھر کل رات ڈنر پہ ملتے ہیں۔" اگلے دن سنڈے تھا اور کل صبح اس کا آف تھا۔ اسی لیے اگلے دن ہی رات کے کھانے پہ ملاقات ہونا تھی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ صبح سے شام تک ممی کے ساتھ کچن میں ہیلپ کرواتی رہی۔ شام تک ممی نے اسے کچن سے باہر کر دیا تا کہ وہ خود پہ بھی کچھ محنت کر لے۔ تھوڑا ڈھنگ سے تیار ہو جائے۔
اس نے کاسنی رنگ کا انگرکھا نکال کر پہنا تھا جس کی آستینوں پہ سفید رنگ کی کڑھائی ہوئی تھی ساتھ بڑا سا نشو کا دوپٹہ۔ ہلکا سا گلوز، کاجل لگا کر اس نے کانوں میں بس ہم رنگ ٹاپس پہن لیے۔ اتنی سی تیاری نے بھی اسے فریش کر دیا تھا۔
طیبہ کمرے میں آئیں تو اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔ اسے ہلکا پھلکا سا تیار ہونے کی ہی عادت تھی۔ لیکن اس تیاری میں بھی وہ پیاری لگتی تھی۔
"اس کے ساتھ فادر آ رہے ہیں۔؟" انہیں یکدم دھیان آیا۔
"آپ نے اس کے فادر کو تو انوائٹ نہیں کیا تھا نا؟" طیبہ کو غلطی کا احساس ہوا۔ جب لڑکا آ ہی رہا تھا تو اس کے باپ کو بھی بلوا ہی لیتیں۔ لیکن چلو کوئی بات نہیں تھی۔ پہلے لڑکے سے تو مل لیں، باپ سے بھی ملاقات ہو ہی جانا تھی۔
"اچھی لگ رہی ہو۔ جب وہ آئے تو میرے ساتھ اسے ریسیو کرنے آ جانا۔" وہ اس کا گال تھپک کر باہر چلی گئیں۔ اس نے سات بجے کا کہا تھا اور جیسے ہی سات بجے تو ڈور بیل بھی بج اٹھی۔

pklibrary.com

طیبہ نے گھبرا کر باہر کے دروازے کو دیکھا اور پھر وال کلاک کو۔ اتنا پابند لڑکا۔ وہ مرعوب ہو گئیں۔ حرم ممی کے ساتھ ہی داخلی دروازے تک آئی۔

طیبہ نے دروازہ کھولا تو اریب نے سلام کر کے پھولوں کا ایک گلدستہ ان کی جانب بڑھا دیا۔ طیبہ کو ہنستا مسکراتا لڑکا تو پسند آیا لیکن اسے دیکھ کر عجیب سی الجھن ہوئی۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم پہلے ملے ہیں۔'' حرم طیبہ کو دیکھ کر چونکی۔ اریب سے پہلی ملاقات میں اسے بھی یہی لگا تھا۔

اریب کی مسکراہٹ کچھ کمی اور اس نے بہت نرمی سے کہا۔

''ہم پہلے نہیں ملے آنٹی۔''

طیبہ نے سر ہلکے سے ہلا کر اسے راستہ دیا تو وہ اندر بڑھا۔

حرم اسے اپنے ساتھ درمیانی ہال میں لے آئی جہاں صوفے رکھے تھے۔ طیبہ اور حرم ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ تب ہی اندر سے تیار سی ثوبیہ باہر نکلیں۔

''اریب! یہ حرم کی خالہ ہیں۔'' اریب کی ثوبیہ کی طرف پشت تھی۔ وہ مڑا تو ثوبیہ کی مسکراہٹ بھک سے اڑ گئی۔

''السلام علیکم۔'' اریب کے چہرے پہ سنجیدگی کے ساتھ بھی کچھ عجیب سا تاثر بھی تھا۔

ثوبیہ کے پیچھے ہی انکل نکلے تھے اور اریب کو دیکھ کر وہ بھی ہکا بکا رہ گئے۔

''اسمی۔'' ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

طیبہ چونک کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

حرم نا سمجھی سے سب دیکھ رہی تھی۔

''آپ سب جانتے ہیں ایک دوسرے کو؟'' حرم کی حیرانی تو بنتی تھی۔

سب خاموش تھے۔ اریب کو بولنا پڑا۔

''تم پوچھ رہی تھیں نا کہ میرے فادر اور فیملی کہاں ہیں اور میں ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتا تو ان سے ملو حرم۔ یہ میرے فادر ہیں سلیمان اور یہ ان کی سیکنڈ وائف ہیں ثوبیہ۔'' حرم شاکڈ رہ گئی۔

''تم کہہ رہی تھیں نا کہ شاید تم میرے فادر کو پسند نہ آؤ تو تم تو انہیں پسند ہو لیکن میں انہیں تمہارے لیے پسند نہیں آؤں گا۔'' وہ سلیمان اور ثوبیہ کو دیکھتے ہوئے، جتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ثوبیہ کے چہرے پہ تناؤ تھا۔ غصہ تھا۔ دانت بھینچے ہوئے تھے۔ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑے لڑکے کو دھکے مار کر باہر نکال دیں۔

سب اپنی جگہ شاکڈ تھے۔ حرم اس لیے کہ جس لڑکے کو اس نے پسند کیا وہ ثوبیہ خالہ کا سوتیلا بیٹا تھا۔ طیبہ اس لیے کہ جس اریب کا بنی ذکر کرتی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ، سلیمان بھائی کا بیٹا اسمی ہوگا۔ سلیمان یک دم بیٹے کو سامنے اس انسان کے روپ میں کھڑے دیکھ کر حیران تھے جو ان کی بیوی کی لاڈلی بھانجی کی پسند تھا اور ثوبیہ تو کبھی سوچ ہی نہیں سکتی تھیں کہ اریب اس طرح حرم کی پسند بن کر بھی کبھی ان کے مدمقابل ہو سکتا ہے۔ ابتسام کے مقابلے میں اریب۔ دونوں ہی سلیمان کے بیٹے۔ اب وہ کیا کہہ کر اریب کو مسترد اور ابتسام کو آگے کر سکتی ہیں۔ سلیمان سے وہ کیا کہیں گی۔

واحد ان میں کھڑا اریب تھا، جو بالکل نارمل تھا کیونکہ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ وہ، کہاں کس سے ملنے جا رہا ہے۔ وہ جس لڑکی کو پسند کرتا ہے وہ کون ہے۔ اسے تو پہلے دن سے ہی سب پتا تھا، جب حرم نے اسے اپنی اسٹریٹ کے سامنے پہنچ کر بتایا تھا کہ وہ اس اسٹریٹ کے سیکنڈ لاسٹ گھر میں رہتی ہے۔ وہ ٹھٹکا تھا لیکن اس نے بھنک بھی نہ پڑنے دی کہ وہ گھر اس کے سگے باپ کا ہے جہاں اس کی سوتیلی ماں اور بھائی رہتے ہیں۔

''پلیز بیٹھو اسمی۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' سلیمان نے نرمی سے بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ثوبیہ نے کچھ تلملا کر شوہر کو دیکھا جو ان کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

pklibrary.com

اریب وہیں بیٹھ گیا۔ طیبہ تو بالکل شاکڈ تھیں کیونکہ وہ بہن کے جذبات سے واقف تھیں۔ نجانے اب کیا ہوگا لیکن اتنا تو طے تھا کہ دو بھائی ہی، ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ فیصلہ کس کے حق میں ہونا تھا یہ بات اب ثوبیہ طے نہیں کر سکتی تھیں۔ معاملہ ان کے بس سے باہر تھا۔

"آپ میرے بڑے ہیں تو اس وقت آپ کو ہی میری طرف سے پروپوزل حرم کی ممی کے سامنے رکھنا چاہیے۔" اس نے بال سلیمان کی کورٹ میں ڈال دیا تھا۔ ثوبیہ کافی پی شوٹ کر رہا تھا۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم حرم کے ساتھ سنیئر ہو۔ تم سب جانتے تھے کہ وہ کون ہے اسی لیے تم نے میری ضد میں، مجھ سے بدلہ لینے کے لیے یہ سب کیا ہے۔" ثوبیہ سے اب خاموش بیٹھنا ناممکن تھا۔

"اتنی بدگمانی۔" اریب عجیب طریقے سے مسکرایا۔ اس کا دل چاہا وہ قہقہے لگائے۔ سامنے کھڑی اس کی سوتیلی ماں کتنا تلملا رہی تھی۔

"آپ نے ایسا کیا کیا ہے کہ میں آپ سے ضد باندھوں یا بدلہ لوں۔؟" اس کی جتاتی نظروں پر ثوبیہ کا خون کھول رہا تھا۔ جی میں آیا کہ کرتین چار تھپڑ اس لڑکے کے لگا دیں لیکن اب وہ کوئی سات، آٹھ سال کا لڑکا تھوڑا ہی تھا جو ان سے مار کھا لیتا۔

"پلیز ثوبیہ۔ اسے اپنی بات کہنے دو۔" سلیمان بیچ میں بولے کہ کہیں معاملہ زیادہ پیچیدہ نہ ہو جائے۔

"تم کہو اسی۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔" وہ اب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ثوبیہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"آپ ہی تو کہتے تھے نا ڈیڈ، کہ کوئی اچھی لڑکی ڈھونڈو اور شادی کر لو۔ کب تک اکیلے رہو گے۔ تو یہ ہے وہ اچھی لڑکی جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ کتنی اچھی ہے وہ آپ بخوبی جانتے ہیں، بلکہ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" سلیمان خاموشی سے اس کی بات سننے کے بعد اب حرم کو دیکھنے لگے جو خود حیران پریشان کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔

"تم کیا کہتی ہو حرم۔؟ تمہیں اریب پسند ہے؟"

"اس سے کیا پوچھتے ہیں آپ۔؟ یہ تو ٹریپ ہو گئی ہے اس لڑکے کی باتوں میں۔ اسے تو پتا ہی نہیں کہ یہ کتنا بڑا دھوکا کھا چکی ہے۔" جھٹ سے ثوبیہ بولیں۔ سلیمان نے اب ثوبیہ کو گھورا۔

"وہ بچی نہیں ہے ثوبیہ، کہ ٹریپ ہو جائے۔ اگر اسے اریب پسند ہے تو ہم میں سے کوئی بھی انٹر فیئر نہیں کرے گا۔ بولو حرم، کیا چاہتی ہو تم؟"

ثوبیہ جلدی سے حرم کے قریب آئیں۔ ان ہر انداز سے اضطراب جھلک رہا تھا جسے اریب محسوس کر رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔

"بتاؤ حرم۔ یہ ہی تم سے ٹکرایا تھا نا پہلی بار جان بوجھ کر۔ اس نے ہی کہا ہوگا نا کہ یہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ بتاؤ حرم۔؟" حرم اپنی خالہ کو گنگ سی دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سر ہلایا لیکن نفی میں۔

"میں پہلی بار خود اس کے پاس گئی تھی بات کرنے۔ اس نے تو مجھے دیکھا تک نہیں تھا۔ پھر جب یہ کچھ دن غائب رہا تو میں نے ہی کال کر نہ کی لیکن اظہار کیا تھا کہ وہ میرے لیے اہم ہے۔" ثوبیہ جیسے بے بسی سے دانت پیس کر رہ گئیں اریب نے سوچا ایک قہقہہ تو بنتا ہے۔

"تم نہیں جانتی ہو یہ کتنا بڑا ڈرامہ ہے۔ یہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے تمہیں یوز کر رہا ہے۔ پاگل بنا رہا ہے تمہیں۔ یہ کوئی تمہیں پسند وسند نہیں کرتا۔" ثوبیہ اس کے قریب جا کر ذرا دھیمی آواز میں کہہ رہی تھیں تاکہ سلیمان تک ان کی آواز نہ پہنچے لیکن اریب نے سن لیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

"آپ نے ایسا کیا کیا کہ وہ آپ سے بدلہ لے گا؟" حرم نے اس بار معصومیت سے پوچھا تو ثوبیہ، مزید تلملا اٹھیں۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسے مزہ آتا ہے مجھے ستانے میں۔ یہ بچپن سے ایسا ہے کیونکہ میں نے اس کے باپ سے دوسری شادی جو کی تھی۔ یہ کوئی موقع نہیں جانے دیتا مجھے ستانے کا۔ تم نہیں جانتیں کہ میں نے کتنے اذیت ناک دن گزارے ہیں جب یہ لڑکا یہاں رہتا تھا۔ تم اسے نہیں جانتیں۔ یہ انسان کے روپ میں شیطان ہے۔" حرم نے کچھ بے یقینی سے خالہ کو دیکھا اور پھر اسی بے یقینی سے اریب کو دیکھا جو بالکل سنجیدہ صورت لیے بیٹھا تھا۔

ایک طرف خالہ کیا کہہ رہی تھیں اریب کے بارے میں اور ایک طرف اریب تھا جس نے ہمیشہ اس کی مدد کی تھی، اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس کی باتوں سے کہیں نہیں لگتا تھا کہ وہ کوئی شیطانی صفت کا مالک ہوگا۔ لیکن خالہ کو وہ کیسے جھٹلاتی۔ وہ اس کی سب سے پیاری خالہ تھیں۔ اس پہ جان دینے والی۔ ممی کے بعد اس سے سب سے زیادہ پیار کرنے والی۔ وہ بھلا کیوں اس کا برا چاہ سکتی تھیں۔ وہ سچ ہی کہہ رہی ہوں گی لیکن یہ تو ان کی طرف کا سچ تھا۔ اریب تو کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ اس نے تو ایک لفظ بھی اپنی سوتیلی ماں کے بارے میں نہیں کہا کہ وہ جھوٹی ہیں یا غلط کہہ رہی ہیں۔ اسے اس کی طرف کا سچ بھی تو جاننا تھا جو خاموش بیٹھا تھا۔

"انکل! میں اریب کو پسند کرتی ہوں لیکن اس وقت جو سچویشن بن گئی ہے وہ میرے لیے بالکل نئی ہے۔ میں کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔" بالآخر اسے کہنا پڑا۔ اس کی بات پہ ثوبیہ مسکرا دیں جیسے انہیں ایک بڑی فتح ہاتھ آئی ہو اور اریب چونکا تھا۔ اس نے بے یقینی سے حرم کو دیکھا۔ کیا اسے اس پہ یقین نہیں تھا جو وہ سوچنے کے لیے وقت مانگ رہی تھی۔ اس کی نظریں حرم پہ ٹکی تھیں اور حرم کی اس پہ۔ دونوں کی نظروں میں محبت کی جگہ بے یقینی صاف دکھائی دیتی تھی۔

اریب یک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑا ہو گیا۔

"مجھے چلنا چاہیے۔"

"کھانا کھا کر جانا بیٹا۔ سب تیار ہے۔" طیبہ پہلی بار اس ساری صورت حال میں بولی تھیں۔

"نو تھینکس آنٹی۔ پھر کبھی۔" تیزی سے ڈگ بھرتا وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھا۔ سلیمان بے بسی سے بیٹے کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

ثوبیہ اسی وقت کمرے میں چلی گئیں اور حرم اپنے کمرے میں۔ طیبہ نے کچن کا رخ کیا کہ سب کے لیے کھانا میز پہ لگائیں لیکن اس رات، کسی نے کھانا نہیں کھایا۔

"تمہیں نہیں پتا تھا کہ وہ سلیمان کا بیٹا ہے؟"

رات ممی کمرے میں گئیں تو اپنے بیڈ پہ لیٹی، چھت کو گھورتی، سوچتی حرم کو مخاطب کیا۔

"میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو الجھی تھی کہ وہ کہیں دیکھا دیکھا لگ رہا ہے۔ اب سمجھ میں آیا وہ سلیمان انکل جیسا ہے۔ بالکل ان کی جوانی جو میں نے تصویروں میں دیکھی تھی۔ مگر میں نہیں جانتی تھی کہ وہ۔" اس نے ماں کو یقین دلانا چاہا جو جانتی تھیں کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔

"ممی! ایک بات بتائیں کیا خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ وہ ان سے ماضی کا بدلہ لینا چاہتا ہے اسی لیے اس نے میرا انتخاب کیا۔"

طیبہ نے لاعلمی سے شانے اچکائے۔

"کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں وہاں پاکستان میں تھی اور ثوبیہ شادی کے فوراً بعد یہاں آ گئی تھی۔ اسی اس وقت تین سال کا تھا جب سلیمان اور ثوبیہ کی شادی ہوئی تھی۔ وہ سال بھر کا تھا جب اس کی ماں فوت ہوئی تھی ایک کار ایکسیڈنٹ میں۔ اس کی وجہ سے ہی سلیمان نے ثوبیہ سے دوسری شادی کی تھی لیکن معلوم نہیں، بچہ ہی ایسا تھا جو ثوبیہ کے قابو نہ آ سکا یا ثوبیہ نے ہی دل بڑا نہیں کیا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اسی کی شرارتوں کا وہ ذکر کیا کرتی تھی۔ یہ بھی بتاتی کہ وہ بدتمیز ہے۔ اس سے کئی بار بدتمیزی کر جاتا ہے لیکن مجھے یاد ہے وہ بتاتی تھی کہ وہ اسے سزا بھی

دیتی تھی۔ میں نے بہت بار اسے سمجھایا تھا کہ وہ بچہ ہے، ماں کو تر سا ہوا ہے، وہ طریقے سے ڈیل کرے گی تو اسے ہی ماں سمجھے گا لیکن ثوبیہ کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ کسی کا بچہ کیوں پالے حالانکہ وہ جانتی تھی کہ سلیمان نے اس سے شادی ہی اسی کی وجہ سے کی تھی۔ سلیمان اس وقت بے حد پریشان تھا کہ کیسے حالات بہتر کیے جائیں۔ اس کے کہنے پہ ہی میں نے ثوبیہ کو سمجھایا بھی تھا لیکن وہ مجھے بے وقوف اور خود کو سمجھ دار مانتی تھی۔

وہ جو کر رہی تھی وہی بہتر تھا۔ پھر ابتسام بھی دنیا میں آ گیا تھا۔ اپنے بچے کے سامنے تو وہ اسی کو ویسے ہی کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا حالات بدتر ہوتے گئے۔ ایک بار اس نے پولیس بھی بلالی تھی کہ اس کی اسٹیپ مام اسے مارتی ہیں۔ سلیمان نے نجانے کیسے معاملہ رفع دفع کیا تھا۔ اسی جب دس سال کا ہوا تو وہ گھر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد کبھی کبھار وہ گھر ملنے آیا کرتا تھا۔ تب سے حالات ایسے ہی رہے کہ کبھی وہ آتا تھا ملنے کبھی نہیں۔ اس سارے میں، میں کیا بتا سکتی ہوں کہ ثوبیہ غلط تھی یا اسی؟"

حرم نے طے کر لیا کہ وہ صبح ویسے ہاؤس جانے کی بجائے اریب سے ملے گی۔

☆☆☆

صبح اریب اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ باہر روڈ پہ کہیں نہیں تھا اس نے بہت ڈھونڈا اور پھر اپنی عقل پہ ماتم کیا کہ اس نے ابھی تک اس کا ایڈریس نہیں لیا تھا۔ لیکن حرم کو اس سے ہر صورت بات کرنی تھی۔ اس نے سلیمان انکل کو کال ملائی۔

"مجھے اریب کا ایڈریس چاہیے۔" انہوں نے اسے لوکیشن بھیج دی تھی۔ وہ اس کی اسٹریٹ سے دس اسٹریٹ آگے کی لوکیشن تھی۔ کمال تھا کہ وہ اس کے گھر سے اتنے قریب رہتا تھا اور کبھی گھر میں اس کا تذکرہ تک نہ ہوا۔ اس نے سنا تھا کہ انکل سلیمان کا ایک بیٹا ہے جو الگ رہتا ہے لیکن اس سے زیادہ اس نے کبھی نہ پوچھا نہ ہی کسی نے ذکر کیا۔ اسے انکل پہ حیرت تھی کہ وہ بیٹے سے کتنے انجان تھے۔

کچھ دیر میں ہی وہ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ کے سامنے کھڑی تھی جس کا دروازہ کسی اجنبی نے کھولا تھا۔ سامنے کھڑا شخص مقامی لگتا تھا۔

"اریب یہیں رہتا ہے؟" اس نے انگریزی میں پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

لڑکے نے اندر منہ کر کے آواز لگائی کہ تم سے ملنے کوئی آیا ہے اور اسے کچھ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ شاید یہ پہلی بار تھا کہ اریب سے ملنے کوئی لڑکی آئی تھی تب ہی وہ شخص ایسے دیکھ رہا تھا۔

چند سیکنڈز کے بعد ہی اریب دروازے پہ تھا۔ اس نے ٹریک سوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ شاید وہ اس دن جاگنگ پہ نہیں گیا۔ اسے دروازے پہ کھڑا دیکھ کر حیران تھا۔ اس نے جلدی سے باہر نکل کر حرم کو ایک طرف کیا کہ اس کے اپارٹمنٹ کا ساتھی دونوں کو بری طرح گھور کر دیکھ رہا تھا۔

وہ حرم کو لے کر دور جا رہا تھا جب اس نے آواز کسی۔

"صبح صبح ڈیٹ۔ تم تو بہت اونچی چیز نکلے۔" اریب نے پیچھے منہ کر کے غصے سے اسے مکا دکھایا تو وہ دروازے سے اندر غائب ہو گیا۔

"تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے خفگی سے حرم کو دیکھا۔

"مجھے تم سے بات کرنا تھی۔ تم نہیں آئے تو مجھے آنا پڑا۔"

"کیوں رات فیصلہ ہو نہیں گیا تھا کہ تمہیں سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔ تو تمہیں وہ وقت دے دیا گیا ہے۔ اب کیا کرنے آئی ہو۔ گھر بیٹھو اور سکون سے سوچو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ کس کا یقین کرنا ہے اور کسے چھوڑ دینا ہے۔" اس کے بازو پہ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ حرم کو درد ہونے لگا۔

"مجھے وقت چاہیے لیکن اس فیصلے سے پہلے میں تم سے تمہارے حصے کا سچ جاننا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنا بازو چھڑا لیا۔

وہ غصے سے سڑک کے کنارے پڑے چند کنکروں کو ٹھوکروں کی زد میں ادھر سے ادھر کرنے لگا۔

''میرا کوئی بچ نہیں ہے۔ بس یہ سچ ہے کہ میں پہلے دن ہی جان گیا تھا کہ تم کون ہو۔ اس کے بعد جب تم سے ملا، تو ملا بھی شاید اسی ارادے سے تھا کہ تمہاری خالہ کو تمہارے ذریعے ٹیز کر سکوں لیکن اس کے بعد جو بھی ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں نے ایک غلط ارادہ کیا تھا لیکن اس پہ عمل نہیں کیا۔ جانتی ہو کیوں؟'' حرم اسے بس دیکھ رہی تھی۔

''کیونکہ میں کسی کی غلطی کی سزا تمہیں نہیں دینا چاہتا تھا۔ تم معصوم تھیں اور میری حقیقت سے انجان تھیں۔ تم تو خود حالات کی ماری ہوئی تھیں پھر میں تمہارے ساتھ کیوں برا کرتا حرم۔ اب اتنا جان لو کہ میری پسندیدگی کسی بدلے کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے۔ تمہیں یقین ہے تو ٹھیک ہے اگر نہیں ہے تو میں یقین نہیں دلاؤں گا۔'' اس کی آنکھوں کی سچائی وہ پڑھ سکتی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

''خالہ نے تمہارے ساتھ ایسا کیا کیا تھا جس — کا انہیں ڈر ہے؟'' وہ طنزیہ مسکرایا۔

''یہ تم ان سے پوچھو۔'' وہ مڑنے لگا تو حرم سامنے آ گئی۔

''مجھے تم سے جاننا ہے اریب۔ کیا غلطی تمہاری تھی۔؟ تم نے ایسا کیا کیا تھا۔؟''

''ایک چار سال کا بچہ جس کی ماں تب فوت ہو گئی ہو جب وہ سال بھر کا تھا، اسی عورت کو ماں سمجھ لیتا ہے جو اسے پیار دے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ پیار دے تو۔ انسان تو سمجھے۔ بچہ تو سمجھے۔ تمہاری خالہ نے تو مجھے سوتن کا بچہ سمجھا جسے وہ نہ پالنا چاہتی تھیں نہ اسے رکھنا چاہتی تھیں۔ بچے شریر ہوتے ہی ہیں، میں بھی تھا، ابتسام بھی تھا لیکن میری شرارت پہ مجھے ڈنڈوں سے مارا جاتا اور ابتسام کی شرارت پہ مسکرا دیا جاتا کیونکہ میں سوتن کا بچہ تھا اور وہ اپنا بچہ۔

بچے محبت کی زبان سمجھتے ہیں اور محبت سے مان بھی جاتے ہیں، اپنائے جاتے ہیں۔ پھر سامنے موجود کوئی شخص بھی ہو بچے اس کے ہو جاتے ہیں بس شرط محبت ہے۔ لیکن ان ہی بچوں کو مارا جائے، پیٹا جائے، ٹوکا روکا جائے، تو وہ اپنے سگے رشتوں سے بھی متنفر ہو جاتے ہیں۔ قصور پھر بچے کا ہوا، یا بڑے کا۔ غلطی میری تھی یا تمہاری خالہ کی۔ یہ فیصلہ تم خود کر لو۔'' وہ تیزی سے واپس چلا گیا تھا۔ حرم تب تک اسے جاتے دیکھتی رہی جب تک وہ اپنے گھر کے دروازے سے اندر نہیں چلا گیا۔ اس نے مڑے بغیر، اسے دیکھے بغیر دروازہ بند کر دیا۔

بڑے برے دل سے وہ ویئر ہاؤس پہنچی تھی۔ ایک سچ خالہ کا تھا اور ایک سچ اریب کا تھا۔ اسے کیوں لگ رہا تھا کہ خالہ زیادہ غلط ہیں۔ یہ سوچنا بھی بہت تکلیف دہ تھا کہ وہ ممی کو، جس خالہ کے حوالے دیتی تھی، جنہیں آئیڈیلائز کرتی تھی، ان کا مجسمہ کیسے پاش پاش ہوا تھا۔

ممی اسے اکثر سمجھایا کرتی تھیں کہ انسان کا ایک ایسا پہلو ضرور ہوتا ہے جسے وہ کسی پہ عیاں نہیں کرنا چاہتا خاص طور پہ ان کے سامنے جن کے لیے وہ بہت اچھا ہے۔ ممی ٹھیک کہتی تھیں۔

وہ ویئر ہاؤس سے اندر داخل ہوئی تو مسز کیری سامنے کھڑے تھے۔ اسے دیکھتے ہی رخ اس کی طرف کیا۔

''تم آج لیٹ کیوں آئی ہو لڑکی۔؟'' مسز کیری اسے دیکھتے ہی غضب ناک ہوئے۔ ساتھ میں گھڑی دکھائی۔ گھڑی اس نے کیا دیکھنا تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ دیر سے پہنچی ہے۔

اس نے کوئی وضاحت نہیں دی۔ سوری کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اس کی شکل پہ ایسی ہوائیاں تھیں کہ مسز کیری دوسری بات نہیں کر سکے۔ اس کا بجھا بجھا چہرہ ہی انہیں بہت کچھ بتا گیا تھا۔

لنچ بریک میں وہ خود مسز کیری سے بات کرنے ان کے آفس گئی تھی۔

''سر، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔''

انہوں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"آپ اریب کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آپ کے پاس دس سال کام کرتا رہا ہے۔ کیا آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔" مسٹر گیری اس کی بات پہ چونکے۔

"اس نے میرے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ میرے پاس کام کرتا تھا؟"

حرم نے سر ہلایا تو وہ مسکرا دیے۔ وہ کبھی کبھار مسکراتے تھے۔

"بہت شرارتی لڑکا ہے۔"

حرم نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔ وہ اس کی کس شرارت کی بات کر رہے تھے۔

"اس اسٹوپڈ کو میں نے دس سال کی عمر سے پالا ہے جب وہ اپنے پیرنٹس کا گھر چھوڑ کر نکل گیا تھا۔" حرم کے لیے یہ بات کسی شاکنگ نیوز سے کم نہ تھی۔ تو گھر چھوڑنے کے بعد وہ مسٹر گیری کے پاس رہا تھا۔

"گھر کے دو چار کام اس اسٹوپڈ نے کیا کر دیے، مجھے مالک اور خود کو نوکر بنا دیا۔" دو تین گالیاں اور دے ڈالیں لیکن ان کا انداز غصے والا نہیں تھا۔

"وہ جب مجھے ملا تو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ماتھے پہ ایک زخم تھا جیسے کسی نے اسے کچھ اٹھا کر مارا ہو۔ وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا اسی لیے میں نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ میرے ساتھ ہی وہ پولیس لے کر بھی گھر گیا تھا۔ پولیس نے اس کی سوتیلی ماں کو حراست میں بھی لیا تھا۔ وہ ریاست کی تحویل میں جانے کے بجائے میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میری اور نینی کی ایک بیٹی تھی جو فوت ہو چکی تھی اور پھر ہماری اولاد نہیں ہو سکی۔ ہم بخوشی اسے ایڈاپٹ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ یوں وہ ہمارے ساتھ رہا۔ میں نے اسے پالا ہے۔ وہ مجھے ڈیڈی بولتا ہے۔ نینی کو مام کہتا ہے۔ لیکن جاب ملنے کے بعد وہ علیحدہ ہو گیا۔ اور اب کہتا ہے کہ وہ میرے پاس کام کرتا رہا ہے۔ نالائق۔" سب کچھ جان لینے کے بعد وہ کیا پوچھتی۔ پوچھنے کو کیا بچا تھا۔

"تم کیا پوچھنا چاہتی تھیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ زبردستی مسکرا کر اٹھ گئی۔

"سنو لڑکی۔ میرا بیٹا کبھی کسی لڑکی کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ بہت محنتی اور سنجیدہ مزاج ہے۔ اس نے زندگی میں بس کام سے محبت کی ہے۔ پہلی بار اس نے کسی لڑکی کا ذکر کیا تو وہ تم تھیں۔ میں وہیں سمجھ گیا کہ تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔" مسٹر گیری کے منہ سے یہ بات سننا کسی انہونی سے کم نہیں تھا۔ اس کے پاس انہیں جواب دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ ہولے سے مسکرا کر باہر چلی گئی۔

اسے یاد آیا کہ اس کے ماتھے پہ ایک گہرا سا نشان تھا۔ ایک بار اس نے پوچھا تھا کہ یہ زخم کا نشان کیسا ہے تو اس نے بس یہ کہا تھا۔

"کسی نے بیگر کھینچ کر مارا تھا بچپن میں۔"

"ایسا ظالم کون تھا۔؟" وہ حیران تھی۔ وہ ہنس دیا تھا۔

"میری اسٹیپ مام۔" وہ بے ساختہ بول پڑا تھا۔

اس کے بعد حرم نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے کہا کہ وہ مذاق کر رہا تھا۔ زخم شاید بچپن میں گرنے کی وجہ سے آیا تھا لیکن اسے یاد نہیں۔ اس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ اپنی اسٹیپ مام کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اب وہ جان گئی تھی کہ سچ یہی تھا جو بے اختیار اس کے منہ سے پھسلا تھا۔ اسے نئے سرے سے افسوس ہوا۔

☆☆☆

شام وہ گھر پہنچی تو خالہ پرسکون سی کوئی ناول پڑھ رہی تھیں اور ممی کچن میں کام کر رہی تھیں۔ ابتسام گھر پہ نہیں تھا۔ وہ رات میں ہی لوٹتا تھا۔ کل کے ہنگامے میں بھی وہ موجود نہیں تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے کچھ دیر سکون سے سوچنا تھا۔ ابھی اسے کچھ جلدی نہیں تھی لیکن فیصلہ وہ کر چکی

تھی۔

دو دن تک اریب اس کے رستے میں نہیں آیا۔ وہ روز اس کی منتظر رہتی اور اکیلی چلتی ہوئی ویئر ہاؤس تک چلی جاتی۔

دو دن کے بعد جب وہ گھر پہنچی تو سامنے اریب، طیبہ، ثوبیہ اور سلیمان انکل موجود تھے۔ سب کو اکٹھے موجود دیکھ کر وہ کچھ الجھ گئی۔

"تم نے کچھ دن کا وقت مانگا تھا۔ کیا مزید وقت بھی چاہیے تمہیں فیصلہ کرنے میں؟" اریب وہاں اس کا فیصلہ سننے آیا تھا۔

حرم نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر بتا دو جو بھی فیصلہ ہے۔ اگر میرے خلاف ہوا تو واپس نہیں آؤں گا۔" حرم کچھ دیر اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے ثوبیہ کو دیکھا جو بے چین تھیں۔

"میرا جو بھی فیصلہ ہو وہ سب کو قبول ہونا چاہیے۔" اس کے فیصلے سے طیبہ تک انجان تھیں کہ وہ کیا کہے گی۔ ثوبیہ کے ماتھے کی لکیریں واضح تھیں۔ سلیمان نے ایک گہرا سانس لیا۔

"دونوں ہی میرے بیٹے ہیں حرم۔ تم جس کا بھی نام لو اور اگر کسی کا نام نہ بھی لو تو بھی یہ تمہاری زندگی ہے۔ کوئی تم پہ زبردستی نہیں کر سکتا۔" سلیمان نے اسے یقین دلایا۔

"دونوں آپ کے بیٹے ہیں انکل! لیکن اسی چھت تلے ایک کے ساتھ زیادتی ہونے دی اور ایک کو ہر طرح سے آرام دہ ماحول دیا گیا۔ آپ کو دونوں بیٹوں میں انصاف کرنا چاہیے تھا۔" سلیمان کی نظریں جھک گئیں اور ثوبیہ نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"مقصد کیا ہے تمہاری اس بات کا۔؟"

"آپ نے جو کچھ کیا آپ جانتی ہیں اور اسی لیے آپ خوف زدہ ہیں خالہ کیونکہ آپ کو یہ لگتا ہے کہ آپ کے کیے کی سزا اریب مجھے دے گا۔ آپ کو اپنا مکافات میری صورت میں دکھائی دے رہا ہے تو آپ غلط ہیں۔ اریب کسی دوسرے کے گناہوں کی سزا کسی تیسرے کو دینے کی فطرت نہیں رکھتا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میری خالہ جو مجھ پہ جان دیتی تھیں وہ ایک بچے کے لیے اپنا دل بڑا نہیں کر سکیں۔ آپ مجھے ممی سے بھی زیادہ پیار کرتی دیتی تھیں، میری خواہشات پوری کرتی تھیں، میرے ساتھ کھیلتی تھیں تو مجھے کبھی کبھار آپ ممی سے بھی زیادہ اچھی لگنے لگتیں۔

بچے تو اسی انسان کے ہو جاتے ہیں جو ان سے محبت کرے۔ آپ یہ کلیہ جانتی تھیں لیکن آپ نے پھر بھی اسے اریب پہ نہیں آزمایا۔ کیا ہو جاتا اگر آپ اس بن ماں کے بچے کو سینے سے لگا لیتیں اور اسے بھی اسی طرح رکھتیں جیسے اپنے بیٹے کو رکھا۔ یہ آپ کا حق آپ سے چھین تو نہ لیتا۔ آپ کا مقام کم تو نہ ہو جاتا۔ تھوڑا سا ظرف دکھا دیتیں اور اس کی اچھی تربیت کر دیتیں، ماں بن کر اسے پال لیتیں، سنبھال لیتیں تو کیا چلا جاتا آپ کا۔ اس کا باپ آپ کا ممنون ہی رہتا، اس کی نظروں میں آپ بلند ہو جاتیں لیکن آپ کیوں اپنا دل بڑا کرتیں۔

"مجھے ہمیشہ یہ لگتا تھا کہ آپ بہت اسٹرونگ ہیں اور ممی ویک۔ آپ کو چیزوں کو اتنا اچھا مینج کرنا، چلانا آتا ہے کہ کیا کسی کو آتا ہوگا۔ ممی کی شخصیت دبی ہوئی ہے اور وہ آگے نہیں بڑھ سکیں کیونکہ وہ بولنا نہیں جانتیں، حق کے لیے آواز نہیں اٹھانا جانتیں جبکہ آپ بولنا جانتی ہیں، لڑنا جانتی ہیں۔ مگر میں غلط تھی۔ ممی کم از کم دوسروں کو اپنے ماتحت کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں کہ جو وہ کہیں سب وہی کریں۔

آپ نے چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کو بھی مینج کرنا شروع کر دیا اور اتنا مینج کرنا شروع کر دیا کہ کوئی ایک بھی چیز آپ کی مرضی سے نہ ہوتی ہو تو آپ کا موڈ بگڑ جاتا تھا۔ تو یہاں آپ کیسے کسی دوسری عورت کے بچے کی شرارت کو اپنا سکتی تھیں، اس کی شرارتوں کو برداشت کر سکتی تھیں، اس کی غلطیوں کو نظر انداز کر سکتی تھیں۔ اس وقت وہ چھوٹا تھا

بدلہ نہیں لے سکتا تھا، بس رو دیتا ہوگا، مزید زچ کرتا ہوگا لیکن اب جبکہ وہ ایک مضبوط مرد بن کر آپ کے سامنے کھڑا ہے تو آپ ڈر گئی ہیں کہ وہ اب آپ سے بدلہ لے گا۔ میں آپ کی لاڈلی تھی تو آپ کو لگا کہ وہ میرے ذریعے آپ کو ستائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔" ثوبیہ بس خاموش تھیں۔ یہ سب سننا وہ بھی حرم کے منہ سے تکلیف دہ تھا لیکن یہ وہ آئینہ تھا جسے وہ توڑ نہیں سکتی تھیں۔

سلیمان ضبط کیے، لال چہرہ لیے سب سن رہے تھے۔ حرم کا کہا سب سچ تھا۔ یہ وہ شادی کے بعد سے دیکھ رہے تھے۔ ابتسام نہ ہوتا تو شاید وہ یہ سب برداشت نہ کرتے لیکن ایک بیٹا تو ماں نہ ہونے کی وجہ سے رل گیا تھا، وہ دوسرے سے ماں چھین کر اسے تڑپانا نہیں چاہتے تھے۔ بس اسی لیے خاموش ہو گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں بیٹے سے پیار نہیں تھا۔ وہ جہاں ممکن تھا اس کی ڈھال بننے کی کوشش کرتے۔ اس کے گھر سے جانے کے بعد بھی وہ اس کا خرچا مسز کیری کو خاموشی سے تھما آتے۔ اس سے ہر دو تین دن بعد ملنے جاتے۔ اس کے ساتھ وقت گزارتے۔ اس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں ابتسام کی خاطر اپنا گھر بسائے رکھنا تھا۔

"ایک درد سے فطرت سے ملا کہ اس کی ماں چلی گئی۔ اس سے بڑا درد آپ نے اسے دیا کہ اس کا باپ بھی اس سے چھین لیا۔"

سلیمان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے اٹھ کر حرم کے سر پہ ہاتھ دھرا اور اریب کو بڑھ کر گلے لگا لیا۔ اس معاملے میں باپ کی محبت کی شدت اور ماضی کے پچھتاوں کی ایسی حدت تھی کہ اریب کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں بہت مطمئن ہوں کہ تم نے میرے بیٹے کو چنا۔ بیوی سمجھ دار اور احساس کرنے والی ہو تو انسان کا گھر اور نسلیں سنوار دیتی ہے۔" ثوبیہ کو شوہر کے منہ سے یہ بات سننا جیسے چابک کی طرح لگا تھا۔ دل میں اریب کی وجہ سے ندامت تو نہ تھی لیکن شوہر کی نظروں میں وہ مٹی سرخرو ہوئیں، ساری حقیقت کھل گئی تھی۔

خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"آج تو کھانا کھا کر جاؤ گے نا۔" طیبہ نے اریب کو اٹھتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں آنٹی۔ پھر کسی دن۔"

حرم اسے باہر تک چھوڑنے اس کے ساتھ گئی تھی۔ طیبہ وہیں سلیمان کے ساتھ بیٹھی رہ گئیں۔

"میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہارے دو انتخاب تھے اس میں سے تم نے مجھے چنا۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ اسٹریٹ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

"اگر میری مخلصی پہ تمہیں کوئی شک ہے تو اسے دور کر لو۔ میں پوری طرح تمہارے ساتھ مخلص ہوں۔ ابھی تو شاید تمہیں اس بات کا یقین نہیں آئے گا لیکن آنے والے وقت میں تم خود اس بات کو تسلیم کرو گی۔" حرم خاموش تھی۔ اریب کے منہ سے اسے یہ سب سننا اچھا لگ رہا تھا۔

"لیکن تم میرے ساتھ کتنا مخلص ہو وہ تم نے ثابت کر دیا۔" حرم مسکرا دی۔

"میرے ساتھ زندگی آسان ہوگی یا مشکل میں نہیں جانتا لیکن تمہیں محنت کرنا پڑے گی کیونکہ مجھے محنتی لوگ پسند ہیں۔" حرم نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"تب ہی مسٹر کیری کو تم اور تمہیں مسٹر کیری پسند ہیں۔" اریب ہنس دیا۔

"تو تم نے کیا سوچ رکھا ہے۔ تم بعد میں بھی اسی عجوبے کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کرو گے یا اپنے ڈیڈی کیری کے پاس لوٹ جاؤ گے۔؟" اس کی بات پہ وہ چونکا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ کیری میرے ڈیڈی ہیں؟"

"میں اپنے دونوں سسر کی فیورٹ ہوں تو مجھے کیسے نہ پتا چلتا۔" وہ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"تم بس باہر سے ہی معصوم دکھائی دیتی ہو، اندر سے پوری ہو۔" حرم اس کی بات پہ کھلکھلا کر ہنس دی اور اریب نے دل میں اس کے ان قہقہوں اور خوشیوں کی دعا کی۔

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔

ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/150 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکائنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/1800 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام ''عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030''، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ افریقہ، یورپ -/22000 روپے، ایشیا، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/25000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

ایجنٹ حضرات اس واٹس اپ نمبر 03312266944 پر رابطہ کریں

pklibrary.com

سحرش مصطفیٰ

لٹل اولڈ ہاؤس

مکمل ناول

زونیا گھر میں داخل ہوئی تو خاصے سناٹے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ایسا عموماً تب ہوتا تھا جب تینوں سو رہی ہوتی تھیں۔ اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں ڈالنے لگی۔ امی، چاچی اور بڑی خالہ تینوں گھر پر نہیں تھیں یا پھر شاید اسٹور روم میں تھیں۔ وہ اسٹور روم کی جانب بڑھی تھی اور اندر جھانک کر دیکھا اسٹور روم اس وقت انیس سو ستر کی دہائی کے فیشن اسٹوڈیو کا منظر پیش کر رہا تھا۔

اکبری اپنے سامنے ایک دھاتی ٹرنک کے کھلے پٹ تھامے بیٹھی تھیں۔ سیاہ رنگ کا وہ ٹرنک بہت پرانا اور خستہ حال تھا مگر زنگ آلود نہیں تھا۔ تینوں کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائی تھیں۔

"ہائے کتنے دن ہو گئے شادی والے کپڑوں کو ہاتھ نہیں لگایا، بہت دنوں سے کوئی نیوتا ہی نہیں ملا۔ ارے صغریٰ ہمیں کوئی شادی پر کیوں نہیں بلاتا۔"

صغریٰ نے پلٹ کر اکبری کو دیکھا ان کے جھریوں زدہ چہرے پہ جھریاں بڑھ گئی تھیں۔ وہ ہنس پڑی تھیں۔ اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ عجیب دل جلانے، مذاق اڑانے والی ہنسی تھی۔

"کیا بچپنے والی بات کر دی تم نے آپا۔"

لفظ آپا پر اکبری بیگم نے گھور کر صغریٰ کو دیکھا مگر وہ بولنے میں اتنی مصروف تھیں کہ اس گھوری کو دیکھ نہیں پائیں۔

pklibrary.com

pklibrary.com

''اب اس عمر میں یہ کپڑے سینے اچھی لگو گی۔ میں تو کہتی ہوں یہ گلی کے نکڑ پر ریڑھی لگانے والے کباڑیے کو بیچ ڈالو۔ اس سے جو چند روپے ملیں گے ان سے ایک دو سوتی جوڑے بنالینا۔ اس پر پھول کاڑھ دوں گی۔'' وہ تینوں انیس سو ستر کی دہائی کی حسین دوشیزائیں تھیں اور روحانی طور پر ستر کی دہائی میں بستی تھیں یا پھر ستر کی دہائی، ان کی روح میں گھسی ہوئی تھیں۔ ان پر آسیب کا سایہ نہیں تھا ان خوب صورت دنوں کا سایہ تھا۔

اسٹور کے دروازے کے پاس کھڑی زونیا کے چہرے پر مسکراہٹ رینگی تھی۔ وہ پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس نے ان تینوں کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی بغیر کسی آہٹ کے پلٹ جایا کرتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ تینوں ایک حال شان ماضی سے جست لگا کر، اپنے روکھے پھیکے حال اور دھندلے مستقبل میں واپس آجاتی تھیں۔ وہ اس گھر میں اپنی ماں اور ان دو بوڑھی عورتوں کے ساتھ رہتی تھی، جن سے نہ جانے اس کا کیا رشتہ تھا۔ وہ ایک کو خالہ اور دوسری کو چچی کہتی تھی۔

انہیں اس گھر میں ابو لے کر آئے تھے۔ وہ تینوں اس کے لیے الگ الگ حیثیت اور رشتہ رکھتی تھیں لیکن ان تینوں کے لیے وہ ایک ہی حیثیت رکھتی تھی۔ سہارے کا تعلق۔ ہاں! عرصہ ہوا کہ وہ تینوں جیسے بھول ہی چکی تھیں کہ اس کی اپنی بھی کوئی زندگی ہے۔ اس کی بہترین دوست اکثر اسے کہا کرتی تھی۔

''ان کی دیکھ بھال تمہارا فرض نہیں ہے۔''

''فرض نہیں ہے ذمہ داری ہے۔ ذمہ داری بعض اوقات فرض سے زیادہ بڑی ہوتی ہے۔''

زونیا کا دوٹوک جواب تھا۔ وہ دس سال کی تھی تو اس کے والد ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ بعض رشتے اور تعلق قسمت بناتی ہے اور قسمت ہی ان سے محروم کرتی ہے۔ یہ قسمت ہی تھی جس نے اسے باپ سے محروم کیا تھا اور یہ قسمت ہی تھی جس نے اسے ایک کے بجائے تین ماؤں کی اکلوتی بیٹی بنایا تھا۔ اماں گھر میں رہنے والی ایک سادہ خاتون تھیں، انہیں باہر کی دنیا کا اندازہ نہیں تھا۔

ابا کے انتقال کے بعد ان کا گھر جیسے یتیم خانہ بن گیا تھا جہاں آئے روز نت نئے لوگ انہیں اڈاپٹ کرنے آتے تھے۔ کوئی ان کی تنہائی کو اڈاپٹ کرنا چاہتا تھا اور کوئی ان کی بچی کھچی عزت اور اس گھر کے چکر میں ٹپک پڑتا تھا۔ ان کی سوچ بس اتنی ہی تھی کہ جس نے بہن کہہ دیا وہ بھائی بن گیا۔ وہ فوراً راضی ہو جاتی تھیں۔ لوگوں نے اس بھول پن کا خوب فائدہ اٹھایا۔ دس سالہ زونیا باپ کے مرنے کے بعد ایک مخصوص روئین دیکھ رہی تھی۔ لوگ سہارے کے بہانے، ان کے گھر آتے اور آخر میں امی کو بہت سے آنسو دے کر واپس چلے جاتے۔ اس ناانصافی اور مفاد پرستی نے اس کے اندر غصہ پیدا کر دیا تھا۔

وہ دس کی عمر میں نہ جانے کیا کیا اپنے اندر پالتی رہی۔ غصہ، تلخی اور کڑواہٹ، پہلے پہل یہ غصہ تلخی اور کڑواہٹ سسکیوں، چیخوں اور غصے کے ذریعے نکلتا تھا لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں ہر وقت ایک سنجیدگی سی نمایاں رہتی تھی۔ اکبری اور صغریٰ کی وجہ سے انہیں تھوڑا بہت سہارا ملا تھا۔

زندگی نے بہت سی خوش فہمیوں کو ختم کر دیا تھا۔ باقی کو لوگوں کے رویوں نے نیست و نابود کر دیا تھا۔ ان سارے حالات نے اس کے اندر عجیب سی عادات پیدا کر دی تھیں۔ وہ اپنے سارے کام خود کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ہی کلاس کے کمزور بچوں کو پڑھانے لگی اور اس کے پیسے لیتی۔ ایک طرح سے انہیں ٹیوشن دینے لگی۔ پہلے صرف اسکول میں پھر وہ اس کے گھر آنے لگے۔ امی حیران ہوتی تھیں۔

وہ دونوں بچیاں زونیا کی ہم عمر تھیں۔ پھر بھی کتنا بچپنا تھا ان میں اور زونیا، قبل از وقت کتنی میچور ہو گئی تھی۔ اپنی کتابیں، کاپیاں خود خریدتی تھی۔ اپنے

سارے کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ اسے محتاجی سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ اس کے نازک کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ سیکھنا سکھانا اور آگے بڑھنا۔ وہ محنت اور لگن پر یقین رکھتی تھی۔ محنت کی تھکن نے اسے کبھی تھکایا اور نہ ہی بھٹکایا اور نہ ہی کبھی شارٹ کٹ اور چور دروازوں کی دوسری جانب جھانکا۔ اسے اللہ پر یقین تھا۔ جسے اللہ پر یقین ہو وہ کبھی چور دروازوں کی طرف نہیں جاتا۔ ایسے میں زین کی آمد نے اس کی زندگی میں پہلی بار خواب اور خواہش کی روشنی پیدا کی تھی۔

☆☆☆

ہال نمبر تین میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے اسٹال تک پہنچی اور زین احمد پر نظریں جمائیں۔ ایکسپو سینٹر میں اس وقت جاب فیئر زور و شور سے جاری تھا۔ ہال میں خاصا رش تھا۔ بہت سی آوازیں اور شور، جا بجا پھیلے ہوئے لوگ۔

"ہیلو۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے خوش دلی سے بولا تھا۔ وہ سنجیدہ ہی رہی۔

"تم نے مجھے رات بارہ بجے واٹس ایپ پر وائس نوٹ کیوں بھیجا؟" وہ ہیلو ہائے کے بغیر بولی۔

وہ حیرت سے اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کو دیکھتا رہا۔ درمیانہ قد، صاف رنگت، گول چہرے پر موجود بڑے سائز کا نظر کا چشمہ اور اس میں سے گھورتی، غصیلی آنکھیں، غصیلی؟ نہیں! تفتیشی آنکھیں کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ زین کے چہرے پر حیرت امڈ آئی۔ حیرت سے دیکھنے کے معاملے پر وہ حق بجانب بھی تھا۔

"نہ حال نہ احوال، سیدھا سیدھا سوال۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"سیدھا سیدھا نہیں، سیدھا سادہ سوال؟" زونیا نے جواب دیا۔

"اگر تم وائس نوٹ سن لیتیں تو یہ سوال نہ کرتیں۔" وہ اپنے خیالات جھٹکتے ہوئے لاپرواہی سے کہنے لگا۔

"میں بارہ بجے کے بعد واٹس ایپ چیک نہیں کرتی نہ کوئی ریپلائی کرتی ہوں آئندہ میسج مت کرنا۔" اس نے جتاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اس جواب پر زین کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات ابھرے۔ اس جملے نے اسے احساس دلایا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ایک عدد جھڑپ متوقع ہے۔

"کیوں تم سینڈریلا ہو کیا؟" وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"سینڈریلا ہوتی تو شیشے کا جوتا چھوڑ جاتی اور پھر شہزادے کے انتظار میں دن گنتی۔ میں سنڈریلا نہیں ہوں بالکل ایسے، جیسے تم شہزادے نہیں ہو اس ملک میں رہنے والے ایک عام انسان ہو اس سوسائٹی کا حصہ ہو تو تمہیں یہاں کے اصول بھی اپنانے چاہئیں۔"

چشمے کے پیچھے چھپی آنکھوں میں جتنا غصہ تھا لہجے میں اتنا ہی طنز تھا۔ زین احمد کو غصے کے بجائے مزا آیا۔ وہ اچھی خاصی چڑ گئی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

"سوسائٹی کے اصولوں میں خوش اخلاقی اور مینرز بھی شامل ہیں مگر شاید آپ کے اصولوں میں یہ شامل نہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا سلمان اسٹال پر پہنچا تھا۔

"بھئی سب لوگ اپنی کل کی رپورٹ مجھے دے دو باس کو دینی ہے۔" وہ عجلت میں کہہ رہا تھا۔

"رپورٹ؟" زونیا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

"زین نے رات کو میسج کیا تھا؟" سلمان نے اس سے پوچھا۔

"لیکن رپورٹ تو آخری دن جمع کرانی تھی۔" وہ حیرت کے جھٹکے سے نکلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ہاں۔ لیکن باس پروگریس دیکھنا چاہ رہے ہیں۔ زین نے آپ کو میسج نہیں کیا تھا کیا؟" وہ ہونقوں کی طرح کھڑی رہی۔ تو وہ پیغام کام کے متعلق تھا۔

"اوہ! شاید میں انہیں میسج کرنا بھول گیا۔"

بلاشبہ ایک معجزاتی مدد تھی۔ اس وقت زین کے جملے نے اسے، اندر ہی اندر مزید شرمندہ کیا تھا اور سب کے سامنے شرمندگی سے بچا بھی لیا تھا۔ اف توبہ اس شخص کا احسان کرنا ضروری تھا کیا؟

سلمان اب زین کو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔

سلمان کے جانے کے بعد زین نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"مجھے آدھی رات کو اپنی کزنز، کولیگز، کلاس فیلوز، دوست اور اجنبی لڑکیوں سے گپیں ہانکنے کی عادت نہیں۔ وہ ایک آفیشل میسج تھا۔" وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر خاصی سنجیدگی تھی۔

"سوری مجھے لگا کہ....." وہ مضبوط مگر دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں لائن بار رہا ہوں۔" زین نے تلخ لہجے میں اس کی بات کاٹی تھی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"گھر ڈراپ کرنے کی آفر آپ کو اغوا کی کوشش لگتی ہے۔ کوئی بات کرے تو فلرٹ کا بہانہ۔"

وہ بولے جا رہا تھا۔ چند دن پہلے شہر کے حالات بہت خراب تھے تب زین نے اسے گھر ڈراپ کرنے کی آفر کی تھی جسے اس نے سرد مہری سے ٹھکرا دیا تھا۔

"اب آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔" وہ منمناتی ہوئی آواز میں غرائی تھی۔ وہ سارے حساب برابر کر رہا تھا۔

"میں حد سے نہیں بڑھ رہا آپ کی حد جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کی بدگمانی اور خوش فہمی کی حد، خیر دنیا میں آپ جیسی خواتین بھی پائی جاتی ہیں۔ جیسے کہ میری امی۔ آپ غصے میں بالکل میری مام پر گئی ہیں۔" اس دن پہلی بار زونیا نے اس عورت کا نام سنا تھا جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا پچھتاوا بن کر آئی تھی۔

نہ جانے اس نے کیا چیز زیادہ شدت سے محسوس کی تھی شرمندگی یا ہزیمت، وہ جسے غدار سمجھ کر سزا دینے آئی تھی وہ پیغام رساں نکلا۔ اسے یاد آیا کہ وہ ایک فارورڈڈ میسج تھا اور اسے لگا تھا کہ شاید کوئی لطیفہ یا پھر اقوال زرین ٹائپ کی چیز، اسے تفریحاً بھیجی گئی ہے۔ رابطہ بڑھانے کے لیے۔ دراز قد اور پرکشش نقوش رکھنے والا زین احمد خان، اس ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی میں حال ہی میں شامل ہوا تھا اسی لیے زونیا کے مزاج کا اندازہ نہیں تھا۔ ورنہ یہاں کام کرنے والے کسی اسٹاف کی ہمت نہ تھی زونیا سے اس طرح بات کرنے کی۔ وہ یہاں سرچڑھی اور نک چڑھی کے لقب سے پہچانی جاتی تھی۔ اپنی تمام تر ریزرویشن، خشک مزاجی کے باوجود اپنے سینئرز کی موسٹ فیورٹ کی لسٹ میں زونیا سرفہرست تھی۔ اسے چھیڑنے کی ہمت کم لوگ ہی کرتے تھے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے اسے واٹس ایپ پر زین کا میسج ملا تھا۔ اسے کچھ عجیب لگا، کوئی تمیز ہوتی ہے اتنی رات گئے میسج کرنا۔ اپنے موبائل اسکرین کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ کشمکش کا شکار تھی کہ میسج پڑھے یا نہ پڑھے۔ اسے تھوڑا غصہ بھی آیا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر میسج چیک نہیں کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ زین اس بات کو محسوس کرے لیکن اب صورت حاصل کچھ ڈرامائی رخ اختیار کر چکی تھی۔

وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہوا اسٹال پر آنے والے ایک وزیٹر کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس نے یقیناً زونیا کے انداز، الفاظ اور خیالات کا برا مانا تھا۔ زونیا کو خود پر غصہ آیا۔ کیا ضرورت تھی بلاوجہ اپنی ٹیوڈ دکھانے کی۔ آخر کیا حرج تھا کہ وہ اس پیغام کو سن لیتی۔ رات میں نہ سہی صبح میں ہی سہی تو، خاصی بچت ہو جاتی۔ پھر سارا دن اتنا رش رہا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کر سکے تھے۔ کیا سوچے گا وہ؟ خوش فہمی کی بھی حد ہوتی ہے۔

وہ گھر پہنچ کر بھی اس کے حواسوں پر سوار رہا تھا۔ وہ عجیب لڑکا تھا۔ دوسروں کے سامنے بلیک

بورڈ اور اس کے سامنے ڈیجیٹل سائن بورڈ۔ آخر مسئلہ کیا تھا اس کا۔ اسے آہستہ آہستہ زین کے بارے میں بہت کچھ پتا چلتا گیا۔ وہ آتے ہی یہاں اپنی دھاک بٹھا چکا تھا۔ ان دونوں کی دوبارہ بحث نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں ویسے بھی الگ الگ ڈپارٹمنٹس میں کام کرتے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس طرح کا انداز گفتگو صرف اس کے ساتھ اپنایا تھا۔ باقی سارے کولیگز کے لیے وہ ایک شرمیلا اور شریف انسان تھا۔ لیے دیے رہنے والا۔ آفس میں جب بھی اس سے سامنا ہوتا تھا۔ وہ ایک دو جملے ایسے ضرور کہتا تھا جو اس کی اپنی ذات سے متعلق ہوں۔ کبھی اپنی ماں کے حوالے سے اور کبھی اپنے بچپن کے حوالے سے۔ اگر زونیا کسی سے اس بارے میں کہہ دیتی تو شاید کوئی یقین ہی نہ کرتا کہ وہ اس طرح کی گفتگو کر بھی سکتا ہے۔

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک نئی آواز سنی۔

ان تینوں کے ساتھ ساتھ آج ایک چوتھی آواز شامل تھی۔ وہ آواز راحیلہ خالہ کی تھی جسے سن کر اس کا منہ بن گیا تھا۔ سامنے راحیلہ آنٹی بیٹھی تھیں۔ ان کو آنٹی کہنا آنٹی لفظ کی توہین لگتی تھی لیکن پھر بھی ان کی عمر کی وجہ سے ان کے لیے زونیا کو یہ لفظ استعمال کرنا پڑتا تھا۔ انہیں سلام کر کے وہ سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی جسے اکثر وہ پیار سے اپنا گھونسلہ بھی کہتی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت اسی کمرے میں گزرتا تھا۔ ایگزیبیشن میں زین احمد کے ساتھ ہونے والی ٹینشن کے بعد راحیلہ آنٹی کو دیکھ لینے سے اس کی تھکن تلخی میں بدل گئی۔ وہ منہ دھو کر نیچے آئی تو وہ جا چکی تھیں۔

امی اسے بتانے لگیں کہ آج آنٹی اس کے لیے کون سا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ اسے اندازہ تھا۔ ہر دفعہ راحیلہ آنٹی کوئی بھی رشتہ لے کر آتیں تو وہ رشتہ اپنے ساتھ بہت سے خواب لے کر آتا۔ وہ تینوں بارات کی پلاننگ تک کر لیتیں۔ ان کی خوشی دیدنی ہوتی۔ پرانے ٹرنک بھی تب ہی کھلتے تھے۔ انہیں لگتا تھا جیسے اس کے لیے آنے والا رشتہ فائنل ہے۔ بس اب نہ ہو ہی نہیں سکتی اور ہر دفعہ جب کسی وجہ سے رشتہ طے نہ ہو پاتا تو وہ کئی دن تک اس بچی کی طرح رونی صورت گھومتیں۔ جس کی گڑیا کی بارات واپس چلی گئی ہو۔ وہ ان کی گڑیا تھی اور انہیں ہر صورت اسے کسی گڈے کے ساتھ رخصت کرنا تھا۔ وہ تینوں اس حقیقت سے منہ موڑ رہی تھیں۔ تین اکیلی عورتیں، پرانے انداز کا تعمیر شدہ گھر اور ایک ذمہ داریوں میں گھری لڑکی کسی کی بھی خواہش نہیں بن سکتی تھی۔ وہ یہ حقیقت اچھی طرح جانتی تھی۔ بہت عرصہ پہلے اپنے آپ کو ان خوابوں سے دور لے گئی تھی۔ زونیا نے اس تلخ حقیقت کو بھی راہ کا کانٹا نہیں بننے دیا تھا بلکہ لاٹھی بنا لیا تھا۔

وہ کھانا کھاتے ہوئے چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے اندر کے انتشار کو بڑھا رہی تھیں لیکن بہت عرصہ ہوا تھا اس نے گھر میں موجود، ان تینوں خواتین کے سامنے اپنا دل کھولنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تینوں پریشان ہو جاتی تھیں۔ اس کی باتیں سمجھ نہیں پاتی تھیں۔ پچھلے کئی سال سے زونیا کے دل کا حال بس اپنی تک محدود تھا۔ وہ رشتہ نہ آنے سے پریشان نہیں ہوتی تھی بلکہ آنے والے رشتے اسے پریشان کرتے تھے۔ وہ لوگ بدلحاظ اور بے لاگ انداز میں اس گھر اور اس میں رہنے والی تین بوڑھی عورتوں کو رشتہ ختم کرنے کی وجہ قرار دیتے تھے۔ کھانا ختم کر کے وہ اندر آ گئی۔

ان سب کو لگتا ہے کہ میں اپنے بارے میں نہیں سوچتی۔ مجھے اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہیں۔ وہ بہت ناراض تھی لیکن کس سے تھی، یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کے سارے کولیگ، دوست اور جاننے والے یہی مشورہ دیتے تھے کہ اپنے بارے میں سوچو۔ انہیں لگتا تھا کہ زونیا سلیم دراصل ایک قابل ترس لڑکی ہے۔

زونیا اس بات پر جی بھر کر حیران ہوتی تھی۔ باپ کے نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور اب ایک اچھی جگہ جاب کر رہی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ گھر کی اور گھر میں موجود تین خواتین کی ذمہ داری اٹھا رہی تھی۔ یہ بات لوگوں کی نظروں میں اسے قابل ستائش کے بجائے قابل رحم کیوں بنا رہی تھی۔

یتیم، بے چاری، اکیلی اور بے سہارا۔ یہ وہ سارے الفاظ تھے جو وہ ہمیشہ سے اپنے لیے دوسروں کی زبان سے سنتی آئی تھی۔ اسے ان لفظوں سے نہیں بلکہ خود سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی بھی انہیں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ گڑیا نہیں تھی۔ کانچ کی گڑیا اب لوہے کی دیوار بن چکی ہے۔ وہ نوکری کرتی تھی۔ صبح اپنی نیند قربان کرتی تھی۔ شام تک واپس آتے ہوئے چہرہ اس تھکن کی کہانی سناتا تھا۔ آنکھوں کے حلقے اور روکھے بال کی وجہ تھے۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس بات سے بے خبر تھی کہ لوہے کی دیوار کو، زین نام کا سورج حدت سے پگھلانے والا تھا۔

☆☆☆

بالآخر ایک دن بلی تھیلے سے باہر آ گئی، جب اس کی کولیگ زوہا اس کے پاس زین کا پیغام لے کر آئی تھیں۔ زوہا ان کی سینئر اور بڑی عمر کی خاتون تھیں۔ اس دن وہ اسے بریک ٹائم میں اپنے ساتھ لنچ پر لے گئی تھیں اور پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے زونیا سے سوال کیا تھا۔

''تم کہیں انگیجڈ ہو؟'' ان کے سوال نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

''کوئی کمٹمنٹ یا پھر کوئی پسند......'' انہوں نے جان بوجھ کر سوال ادھورا چھوڑا تھا۔

''نہیں لیکن آپ نے یہ سوال کیوں پوچھا۔'' اسے اب حیرت ہو رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی سینڈوچ ٹھونستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اگر میں تم سے کہوں کہ کوئی تمہیں پسند کرتا ہے تو؟'' زوہا اس پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔

''زین احمد۔'' اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ تو اس کے سارے انداز ٹھیک نکلے تھے۔ نہ جانے اسے کیوں غصہ آیا تھا۔

''آپ......'' حیرت کے مارے منہ سے کوئی دوسرا لفظ نکل ہی نہیں پایا تھا۔

''پلیز مجھے غلط مت سمجھو اور نہ ہی زین کو۔ وہ تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے تفصیل سے وضاحت دی تھی۔

''مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ مجھے اچھی طرح جاننے کے باوجود آپ نے اس طرح کی بات کی۔ یہ لڑکے تو ہوتے ہی ایسے ہیں۔ انہیں شوق ہوتا ہے آفس میں کسی لڑکی کے نام کا دم چھلہ ساتھ میں لگا کر گھومنے کا۔ بعد میں گھر والوں سے ڈر کر پیچھے ہٹ جانے کا، تنخواہ کم کا بہانہ کر کے بھاگ جانے کا، بہن کی شادی کے انتظار کا کہہ کر جان چھڑانے کا اور آپ اس کی باتوں میں آ گئیں نہ صرف خود اس کی باتوں میں آئیں بلکہ مجھے راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' اسے دکھ ہوا۔

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو زونیا، اتنی بدگمانی وہ بھی مجھ سے، کیا میں کبھی تمہارا برا چاہوں گی۔'' وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی۔ اس دن وہ گھر پہنچ کر بھی خاصے غصے میں رہی تھی۔

اچھا تو میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ واٹس ایپ میسجز، بات بے بات مخاطب کرنا، دیکھنا سارے اندازے ٹھیک نکلے'

اس نے جیسے کسی گہری سازش کا سراغ لگایا تھا۔

اسے یقین تھا کہ وہ اسے کوئی وضاحت دینے ضرور آئے گا۔ اگلا دن یقیناً بہت ہنگامہ خیز ہونے والا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے سوچتی رہی۔ ہاتھ بڑھا کر سیل فون پر نظر ڈالی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے میسج یا کال ضرور کرے گا۔ لیکن کوئی کال نہیں آئی وہ کچھ حیران ہوئی۔

pklibrary.com

اگلے دن آفس پہنچنے پر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ آفس میں داخل ہوئی تو زین پہلے ہی وہاں بیٹھا تھا۔ فائل کھولے سر جھکائے۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھی۔ ہال کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب دوسری سیٹ زین کی تھی۔ ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اسے نہ دیکھ پایا ہو۔

اس نے شاید مجھے دیکھا نہیں۔ وہ سوچتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر زین نے اسے دیکھ لیا۔ لیکن اس نے زونیا سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ وہ حیران رہ گئی۔

''لگتا ہے زوہا نے اسے کچھ بتایا ہی نہیں۔'' اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا تھا۔ وہ تو اپنی جنگ شروع کرنے والی تھی اور یہاں امن ہی امن تھا۔

پھر سارا دن ایسے ہی گزر گیا۔ اگلا دن اور پھر اس سے اگلا دن۔ وہ جو تھوڑی بہت اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تھا اس نے وہ بھی کرنی چھوڑ دی تھی۔ زونیا کو اپنے بارے میں ایک عجیب پریشانی لاحق ہوئی تھی، کہیں وہ مجھ سے بدلہ لینے کا تو نہیں سوچ رہا۔ اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ پچھلے تین دن سے اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اس نے اپنی پوری توجہ کام پر لگا دی تھی۔ پھر دو ماہ بعد زین نے ریزائن دے دیا تھا ایسے کسی اور کمپنی سے آفر آگئی تھی۔ وہ کمپنی بھی بڑی تھی اور پیکیج بھی بہت اچھا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا تھا۔ اس رشتے والے واقعے کے بعد ڈیجیٹل سائن بورڈ کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے لگا تھا۔

آخری دن اس نے زین کو اپنے پاس آتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت ہاف ڈے لے کے آفس سے نکلی تھی اور پارکنگ میں اپنی کار کے پاس زین نظر آیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ مسکرا بھی نہیں پائی تھی اسے اگنور کرنا واقعی ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔ اس کی آنکھوں پر چڑھے سن گلاسز کی وجہ سے وہ زین کی آنکھوں کے تاثرات نہیں دیکھ پائی۔ اسے کچھ گھبراہٹ ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیا کہنے آیا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک الوداعی ملاقات کرنے آیا ہو۔ اس کے دوسرے کولیگز کی طرح۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟ بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا۔'' وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کی شرٹ پسینے میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی اور چہرہ بھی پسینے سے تر تھا۔ اسے حیرت ہوئی دل چاہا پوچھے کہ تمہیں کیسے پتا کہ میں یہاں آنے والی ہوں مگر وہ چپ رہی۔ آج اس کا آفس میں آخری دن تھا وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔

''جی بولیں۔'' اس نے اپنے آپ کو کمپوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ آج میرا آخری دن ہے آفس میں، تو آپ کے نام کا دم چھلہ لگا کر تو میں گھوم نہیں سکتا۔ گھر والوں کے انکار کا ڈر بھی نہیں کیوں کہ میں اپنی ماں کو آپ کے بارے میں سب بتا چکا ہوں اور بہن میری کوئی ہے نہیں جس کی شادی کا جواز بنا کر بھاگ جاؤں۔ تو کیا مس زونیا، اب میری زندگی میں شامل ہونا چاہیں گی؟''

اس کے لہجے میں اتنی خوش گوار بہت تھی جیسے دو بہترین دوست، بہت عرصے بعد ایک دوسرے سے مل کر خوش ہو رہے ہوں۔ وہ ہونق بنی اسے دیکھتی رہی۔ اسے زوہا سے اس طرح کی امید بالکل نہیں تھی کہ وہ حرف بہ حرف ساری کہانی جا کر اسے بتا دیں گی اور وہ دل لگا کر یہ جواب جھٹ سے یاد کرلے گا۔

''اور یہ سارے کام وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں صرف دل بہلانا ہوتا ہے۔ مجھے زندگی گزارنی ہے آپ کے ساتھ۔'' اس کے لہجے کی سچائی نے زونیا کے دل کو قائل کیا تھا۔

زین آگے آیا تھا اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی اب وہاں سنجیدگی تھی۔ اس نے اپنے گلاسز اتارے تھے۔ تب زونیا کو ان آنکھوں میں بس اپنا عکس نظر آیا تھا۔ وہ خاموش تھی۔ اس صورت حال

کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ زین کی پیشانی پر چند بل ابھرے تھے۔ صاف ظاہر تھا وہ متفکر تھا۔

''تم مجھے آزمائے بغیر فیل کر رہی ہو؟ آگے بڑھنے سے پہلے ہی پیچھے ہٹ رہی ہو؟''

اس نے شکوہ کیا تھا۔

''جہاں پیچھے ہٹنے کا خدشہ ہو وہاں آگے بڑھنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔'' اس نے سر جھکائے جواب دیا تھا۔ زونیا کو اس کی سنجیدگی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ بہرحال اسے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلا کر تسلی لینے والی محبت سے بہت آگے کا سوچ رہا تھا۔

''تم خوف زدہ ہو؟'' زونیا نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں کہنے لگی۔

وہ مزید کچھ کہے بنا، وہاں سے چلی آئی تھی۔

اس رات اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا وہ خود بھی یہی چاہتی تھی اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ اسے اپنے بارے میں کہی جانے والے لوگوں کی ساری باتیں یاد آئی تھیں۔ گروسری، گھر پڑھائی، نوکری پچھلے کئی سال سے وہ ایک عملی زندگی گزار رہی تھی۔ ایک ایسی عملی زندگی جس میں خواب دیکھنے پر پابندی تھی۔ مگر اب کوئی خواب دکھانے والا آچکا تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے اس نے آنکھیں بند کرنی چاہیں تو ایک چہرہ اس کے سامنے آگیا تھا۔ وہ انکار جھجک دراصل خوف تھا اور آج اس کے مضبوط لہجے نے اس کے سارے خوف ختم کر دیے تھے۔ اسے ایک عجیب سا اطمینان بھی تھا۔ صرف اپنے حوالے سے نہیں اس گھر کے حوالے سے بھی وہ خوش تھی۔ ان چار اکیلی عورتوں کی زندگی میں ایک مرد شامل ہونے جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ جس تعلق کے حوالے سے خوف زدہ رہی تھی، وہ نہایت اچھے طریقے سے جڑ رہا تھا۔

اس نے امی سے بات کی تھی وہ نہ ناراض ہوئیں نہ خوش بلکہ وہ کچھ فکر مند ہوئی تھیں۔ اگلے ہفتے زین کی امی اس کے گھر باقاعدہ رشتہ لے کر آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ ان کا نام نور جہاں تھا۔ صرف نام ہی نہیں انداز بھی خاصے شاہانہ تھے۔ زونیا کے گھر والے تو ان کی رعایا تھے۔ بے حد حسین صورت، صاف ترو تازہ جلد، صراحی دار گردن، ڈائی کیے لائٹ گولڈن براؤن بال، ڈیزائنر ساڑھی، نفیس جیولری اور نہایت ہی اسٹائلش شولڈر بیگ زونیا حیران ہوئی۔ زین نے اسے بتایا تھا کہ اس کی ماں بیوہ ہے اور انہوں نے ساری عمر محنت مشقت کر کے اسے پالا ہے۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری اور امی کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے گی۔ وہ بھی تمہاری طرح محنتی ہیں۔''

اس نے ایک مرتبہ فون پر کہا تھا اور اب انہیں دیکھ کر زونیا کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ یقیناً زین کی نظریں تھیں جن کی وجہ سے اسے زونیا میں نور جہاں کا عکس دکھائی دیا تھا یا پھر شاید ہوں گی ایک دو خوبیاں وہ نور جہاں سے اتنا متاثر تھا کہ ہر عورت میں ان کی جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ نور جہاں اتنی خوب صورت اور طرح دار عورت تھی۔ زونیا بالکل الٹ تھی۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی اکبری، صغریٰ اور رضیہ کے پرتپاک سلام کا جواب سر ہلا کر دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہی گرمی کا راگ الاپا تھا۔

''بہت پیاس لگی ہے۔'' نور جہاں کی بڑبڑاہٹ بھری سرگوشی اکبری نے سنی اور بارہویں کھلاڑی کا کردار ادا کرتے ہوئے۔

''میں پانی لے کر آتی ہوں۔'' کہہ کر اندر کی جانب علامتی دوڑ لگائی مگر تب تک نور جہاں نے، بڑے آرام سے اپنے بیگ کی زپ کھولی اور منرل واٹر کی بوتل باہر نکالی۔

وہ تینوں ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھیں۔

''بہت گرمی ہے آج کل ایسے میں انسان کا

موڈ بھی ہر وقت خراب رہتا ہے۔'' اکبریٰ اور صغریٰ کی جانب منہ کر کے رضیہ نے گویا انہیں عندیہ دیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے انہیں زین کی ماں کے سامنے تمیز سے رہنا ہے۔

وہ زین سے مل چکی تھیں وہ لڑکا اپنی بیٹی کے لیے بہت پسند آیا تھا۔ یا پھر شاید انہوں نے بیٹی کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی دیکھ لی تھی۔ نور جہاں نے اسے غور سے دیکھنے تک کی زحمت نہیں کی تھی۔ انگوٹھی پہنا کر گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں بہت دیر تک ایک خاموشی چھائی رہی تھی۔ سب سوچ رہے تھے کہ خوش ہونا ہے یا نہیں' بس ایک زونیا تھی جو خوش تھی۔ پہلی بار ان تینوں کو اس کے ہونٹوں پر بھرپور جان دار مسکراہٹ نظر آئی۔ حالانکہ صغریٰ کو یاد تھا کہ نور جہاں کے انداز و اطوار نے اسے بھی ہکا بکا کیا تھا۔

''اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ زین کو بہت چاہتی ہے بس اب سب چپ ہو جاؤ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے جس سے بدمزگی ہو۔''

''مگر یہ بڑھیا کوئی چاند نہ چڑھا لے۔ ہماری زونیا نے تو آج تک دنیا کے رنگ نہیں دیکھے۔'' اکبریٰ کو فکر لاحق ہوئی۔

''ارے رہنے دو آپا! بڑھیا تو تم بھی ہو مگر دیکھ لو تمہاری بہو نے کیسے تمہارے بیٹے کو قابو کیا اور یاد ہے شروع دنوں میں وہ کیسے بکری بنی تمہارے آگے پیچھے گھومتی تھی۔''

اکبریٰ نے جواباً صغریٰ کو اس کے سسرالی کارنامے یاد دلانا شروع کر دیے، ان دونوں کی نوک جھونک سے بے نیاز رضیہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

وہ تھوڑی دیر پہلے گھر میں داخل ہوئی تھی اور اس وقت بیڈ پر لیٹنے والے انداز میں نیم دراز تھی اور زین کو میسج بھیج رہی تھی۔

''ایٹ ہوم'' میسج سینڈ کرتے ہی فوراً پیغام آیا تھا۔

''اوکے۔''

وہ مسکرائی۔ وہ جیسے انتظار میں ہوتا تھا اس پیغام کا ——— زین نے

اسے کہا تھا گھر پہنچتے ہی اپنی خیریت کا پیغام دے دیا کرو۔ یہ جیسے ایک سیفٹی الارم تھا۔ موبائل میں نظر آنے والے اس تھریڈ میں زیادہ تر بس یہی دو پیغام نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ گڈ نائٹ اور گڈ مارننگ کے میسجز۔

منگنی کے اگلے دن صبح اسے گڈ مارننگ کا ایک میسج ملا تھا۔ اس نے جوابی گڈ مارننگ میسج اسے بھیجا تھا۔

رات آٹھ بجے اسے گڈ نائٹ کا میسج ملا تھا۔ اس نے حیرت سے وقت دیکھا۔

''تم اتنی جلدی سو جاتے ہو؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''نہیں میں تو دیر سے سوتا ہوں لیکن تم بارہ بجے کے بعد میسج نہیں دیکھتیں تو اس لیے ایڈوانس میں گڈ نائٹ کہہ دیا۔'' وہ ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے سمجھ چکے ہو، گڈ۔''

''اب ایسی کوئی بات نہیں۔ سمجھ میں آ جاتیں تو تمہارے پیچھے نہ آتا۔'' دل سے نکلنے والے لفظ دل میں اترے تھے۔

وہ اس کی دنیا میں روشنی بن کر آیا تھا۔ ان دونوں کی بات چیت ہونے لگی تھی۔ زین اب ایک دوسری کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔ ان کے درمیان کبھی بھی روایتی لفاظی نے جگہ نہیں بنائی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں سب جاننے لگے تھے وہ باتیں جو ان دونوں نے کبھی کسی دوسرے دوست کے ساتھ شیئر نہیں کی تھیں۔ کبھی کبھار وہ اسے بہت آسان انسان لگتا اور کبھی بے حد مشکل۔ اس نے کبھی بھی زونیا سے روایتی، عشق و محبت کی باتیں نہیں کی تھیں حالانکہ وہ ہر دوسرے دن فون پر اس سے بات کرتا تھا۔ کبھی لیٹ نائٹ اور کبھی شام کے وقت۔ ان کی

باتوں کا محور بہت سی چیزیں ہوتی تھیں۔ آفس میں گزرا ہوا دن، بچپن کی باتیں، کبھی کسی کرنٹ افیئر کے بارے میں تبادلہ خیال۔ اسے جیسے کوئی ساتھی کوئی ہمدم چاہیے تھا جس سے وہ دن رات اپنے دل کا احوال کہہ سکے۔

زونیا کو بعض اوقات حیرت ہوتی تھی کیوں کہ آفس میں کبھی اس نے، اسے کبھی بھی کسی دوست یا کولیگ کے ساتھ یوں بے تکلفانہ انداز میں بولتے نہیں دیکھا۔ وہ بدمزاج نہیں تھا لیکن اپنی ذاتی زندگی کو ٹاک آف دی ٹاؤن بنانے سے گریز کرتا تھا۔ نہ جانے وہ کیا بات تھی جس نے انہیں ایک دوسرے سے اتنا قریب کیا تھا۔ شاید ان دونوں کی شخصیت کی سنجیدگی تھی جو انہیں پاس لے آئی تھی۔ کبھی کبھار زونیا کو محسوس ہوتا کہ زین کی فیملی بھی ویسے ہی ادھوری ہے جیسے کہ ان کا خاندان۔ دونوں غیر متوازن اور کہیں نہ کہیں کسی کمی کا شکار خاندان تھے۔

نور جہاں نے زین کے والد کے انتقال کے بعد زین کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ اپنے خاندان سے وہ پہلے ہی کٹ آف کر چکی تھیں۔ وجہ کیا تھی یہ زین نے کبھی نہیں بتائی اور نہ ہی زونیا نے کبھی پوچھی لیکن وہ بہت بددل رہتا تھا اپنے ان نام نہاد رشتے داروں سے۔ ان کا کبھی ذکر آتا بھی تھا تو نہایت مایوس کن انداز میں۔ وہ اس کی فیلنگز سمجھ سکتی تھی۔ ایسے ہی حالات سے زونیا کو اپنے ابا کے انتقال کے بعد گزرنا پڑا تھا۔ اس لیے اسے زین اور اور اپنی فیملی ایک جیسی لگتی تھی۔ نامکمل اور ادھوری۔ اس کی، بے ساختہ اور پرخلوص محبت میں اگر مگر اور لیکن جیسے الفاظ صرف ایک عورت کے نام پر آتے تھے اور وہ تھی۔ ''نور جہاں۔''

☆☆☆

''تم میں اور امی میں کوئی فرق نہیں ہے زونیا۔''

وہ فریش جوس کا گلاس ہاتھ میں تھامے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے اور نہ جانے کس بات پر اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی۔

''ہاں میں جانتی ہوں۔''

دل ہی دل میں مایوس ہوتے ہوئے بظاہر اس نے نارمل انداز میں کہا تھا۔

''وہ میری طاقت ہیں، تم میری کمزوری ہو۔ وہ مجھے سکون دیتی ہیں اور تم خوشی، خوشی اور سکون دونوں ہیں میرے پاس۔'' وہ روانی سے کہہ رہا تھا۔ جیسے اس کی سوچ کو پڑھ چکا ہو۔ وہ ایک دریا تھا جو آخر میں ماں نام کے سمندر میں جا کر ضم ہو جاتا تھا۔

محبت کا جب بھی ذکر ہوتا تو اس میں صرف زونیا کا نام نہیں لیتا تھا بلکہ اپنی ماں کا نام بھی لیتا تھا۔ وہ جیسے اسے باور کرانا چاہتا تھا کہ اس کی ماں کوئی عام عورت نہیں ہے۔

''کیا یہ مجھ سے بھی ایسی ہی محبت کرے گا یا پھر اس سے تھوڑی کم۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا سوچنے لگتی۔

''ہو سکتا ہے کہ اس دل کے میں میری محبت اس محبت سے تھوڑی زیادہ ہو۔''

زین کی زندگی کا دائرہ اس کی ماں کے گرد گھومتا تھا۔ وہ اپنی ماں سے شدید محبت کرتا تھا کیوں کہ جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھنے کے بعد انہوں نے صرف زین کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ اس کی پرورش میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ وہ اس کا سب کچھ تھیں۔ ماں بھی اور باپ بھی۔ وہ ان کے بارے میں بہت حساس تھا۔ اس کی اکثر باتیں انہی کے گرد گھومتی تھیں۔ وہ ماں نہیں تھیں آئیڈیل تھیں اس کی۔

جتنا ذکر وہ اپنی ماں کا کرتا تھا کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو اب تک بیزار ہو چکی ہوتی۔ وہ بیزار نہیں تھی۔ وہ تو خود ذمہ داری کی ایک ڈوری سے بندھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار اسے حیرت بھی ہوتی۔ نہ جانے وہ محبت کی کون سی قسم تھی جس میں اس نے زین کو مبتلا دیکھا تھا۔ اپنی ماں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور قربانیوں کے راگ الاپتے ہوئے، اس کی آنکھیں کسی اور دنیا کا منظر دیکھتی تھیں۔ بہترین الفاظ اور جذبات سے گندھا لہجہ۔ مکمل اور جامع انداز اور کامل

محبت۔ وہ اس دوران ایک سامع بن جاتی، کبھی کبھی اسے اپنا آپ بے مصرف لگنے لگتا۔ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان دونوں ماں بیٹے کی محبت اسے کبھی رشک اور کبھی حسد میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ اس بیٹے کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کی ماں کا رویہ زونیا اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ہر ملاقات میں سرد اور تلخ رہا ہے۔ وہ محبت جیسے ایک سنگ میل تھی جو اسے سر کرنا تھا۔

☆☆☆

زونیا کے چہرے پر حیرت تھی۔ وہ تینوں اپنی دوائیں لے چکی تھیں۔ اس کی حیرت کو دیکھتے ہوئے ہنسنے لگیں۔

''بیٹا، یہ کون سی فارمی ہے۔ نیلی پیلی دوائیں ہی تو ہیں۔ بس ہم نے فیصلہ کر لیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی دوائیں کھلا دیں گے۔''

''بیٹا! ہم تینوں نے ذمہ داریاں بانٹ لی ہیں۔'' انہوں نے اس کی حیرت کو دیکھتے ہوئے لاپروا انداز میں کہا تھا۔

ان کی عینک کے نیچے پڑنے والی جھریاں مزید بڑھ چکی تھیں۔

''اس کی کیا ضرورت ہے امی۔'' وہ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ انہوں نے بلاوجہ اپنی عینک درست کی تھی۔

''ارے اپنے ہاتھوں سے اپنا کام بیٹا، اس میں کیا حیرانی اور کیسی ضرورت۔ سچ پوچھو تو بیٹھے بیٹھے دماغ شل ہو جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں۔ اب ان ہڈیوں کو بالکل فارغ چھوڑ دیا تو زنگ لگ جائے گا ان کو۔''

وہ تینوں جیسے اسے اپنی ذمہ داری سے آزاد کر رہی تھیں۔

زونیا کا دل بوجھل ہوا تھا۔ وہ زین کی مشکل کو سمجھتی تھی اور اپنے دل اور ان تینوں نفوس کو بھی جانتی تھی کہ سب کے احساسات سمجھنے والا انسان سب سے زیادہ تکلیف جھیلتا ہے۔ وہ سب کی خواہش، ضرورت اور ڈیمانڈز کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔

''اور یہ دوائیں لائے گا کون؟ وہ بھی اسٹور سے جا کر آپ خود لے کر آئیں گی۔'' اس نے ان تینوں کو جیسے جتایا۔ ان کے جواب سنے بغیر وہ وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلی آئی تھی۔

بیڈ پر لیٹ کر اپنا سر تھامتے ہوئے اس نے پہلی بار صورت حال کی سنگینی پر غور کیا تھا۔ زین اس گھر میں نہیں رہ سکتا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن وہ زین کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی یہ بات بھی وہ جانتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان بار بار اظہار کرنے والی محبت نہیں تھی۔ وہ بن کہے دل سے ایک دوسرے کا حال عیاں کر دینے والی محبت تھی۔

☆☆☆

''تمہیں ایک بات بتانی ہے۔'' وہ محتاط انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں اس دن لنچ پر ملے تھے۔

''ہاں بولو۔'' وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

''میرا ٹرانسفر دبئی ہو گیا ہے۔'' یہ خبر سنتے ہی زونیا کو شاک لگا۔

''مگر کیوں؟ اتنا اچانک تم نے بتایا بھی نہیں۔''

''مجھے خود اچانک بتایا گیا۔ ساتھ پروموشن بھی ملے گا۔ وہاں اس وقت محنتی لوگوں کی سخت ضرورت ہے۔''

وہ خاموش رہی اب ظاہر ہے وہ اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے جانے کی خبر نے اسے تھوڑا پریشان اور بہت زیادہ اداس بھی کر دیا تھا۔

نہ جانے کب وہ اس کے لیے اہم ہوا اس بات کا احساس اسے بہت دیر میں ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک سال ہو چکا تھا ان کی منگنی کو۔ زین نے ابھی حال ہی میں گھر خریدا تھا۔ زونیا نے سن کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اسے ابھی ایک سال مزید دبئی میں رہنا تھا۔

''میں بیچ میں پاکستان کا چکر لگاؤں گا۔ گھر سیٹ کرنا ہے ایک دو کام ہیں اور......'' اور نے وقفہ

pklibrary.com

لیا تھا۔ ”سب لوگ مجھے یاد بھی آرہے ہیں ملاقات بھی ہو جائے گی۔“

”سب لوگ۔“ اس مبہم انداز پر وہ کچھ ناخوش ہوئی تھی

”سب لوگ کون۔؟“

”سب لوگ بھئی مطلب میری امی، میری ایک تایازاد کزن، میرا بیسٹ فرینڈ رضا اور.....“

”اور؟“ وہ بے صبری سے پوچھنے لگی اس کی یہ بلاوجہ کی خاموشی اسے تنگ کر رہی تھی۔

”اور میرا خانساماں شرافت، اس کے ہاتھ کے بنائے کھانے بہت مس کرتا ہوں میں۔“

زونیا کو مایوسی ہوئی۔ غصہ آیا۔ انسان یہ سوچ لیتا ہے کہ ایک عدد اکلوتی ۔۔۔ منگیتر بھی موجود ہے، اس کائنات میں، محبت میں نہ لیتا نام مروت میں ہی لے لیتا۔ اب خود سے منہ پھاڑ کر تو کہنے سے رہی کہ مجھے بھی مس کرو۔

”کیا ہوا تم خاموش کیوں ہو گئیں کچھ برا لگا کیا؟“

”نہیں مجھے کیوں برا لگے گا۔ شرافت حسین ایک انتہائی نیک اور اچھا انسان ہے ایسے بھلے مانس لوگ آج کل کہاں پائے جاتے ہیں۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔ وہ ہنس پڑا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہو۔ سب کو مس کرتا ہوں سوائے تمہارے، تمہیں میں بالکل مس نہیں کرتا کیوں کہ تم لوگ نہیں ہو، ہر لمحہ مجھے اپنے آس پاس محسوس ہوتی ہو۔“ وہ خوش ہوئی۔

”اچھا خیر چھوڑو یہ ڈائیلاگ۔ یہ بتاؤ کب آرہے ہو پاکستان۔“ اس نے کچھ بے نیازی ”جھاڑتے“ ہوئے بات آگے بڑھائی۔ کچھ دنوں بعد وہ پاکستان واپس آیا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں، اس وقت ایک مال میں واقع مشہور معروف فرنیچر اور ڈیکوریشن برانڈ پر موجود تھے۔ زین کے ہاتھ میں ایک گولڈن لیمپ تھا جس پر سلور رنگ کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ وہ اس کی رائے طلب کر رہا تھا۔ زونیا نے بغیر کچھ کہے احمقوں کی طرح سر ہلا دیا۔

”لیمپ تو اچھا ہے لیکن مجھے پیلا رنگ زہر لگتا ہے۔“ اس نے رائے دے میں جا کر اپنی رائے اس تک پہنچائی۔

”کوئی بات نہیں ہم اس زہر کو کھانے کے لیے نہیں سجانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔“

اپنی رائے دینے سے پہلے وہ جانتی تھی کہ رائے صرف ایک فارمیلٹی ہے، ورنہ اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو پچھلی ساری شاپنگ کا ہوا ہے۔ وہ ہر چیز خریدنے سے پہلے اس کی رائے ایسے مانگتا جیسے وہ بہت اہم ہو اور پھر اس کی ہر آرا رد کر کے اپنی پسند کی چیز خرید لیتا۔

”تمہیں کیا ہوا اتنی چپ کیوں ہو؟“ واپسی میں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ڈنر کرتے ہوئے اس نے بے حد متفکر انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

”تمہیں اگر ساری چیزیں اپنی پسند سے لینی تھیں تو مجھے ساتھ کیوں لائے؟“ اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

وہ پلیٹ میں چمچہ ہلاتے ہوئے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم، میں نے تم سے رائے مانگی تو تھی؟“

”صرف رائے کے لیے لے کر آئے تھے مجھے اپنے ساتھ، رائے چاہیے تھی تو سیلز مین سے پوچھ لیتے؟“ وہ کچھ بھڑکی تھی۔

”گھر ہم دونوں کا ہے تو سیٹنگ بھی ہم دونوں کی مرضی سے ہونی چاہیے۔“ وہ کچھ ناراضی سے کہنے لگی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے ہنسا تھا۔

”گھر ہے نکاح نہیں ہے کہ جس میں دونوں کی مرضی شامل ہو۔ جس کی چوائس زیادہ اچھی ہوگی اسے ہی اہمیت ملے گی۔“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس کی چوائس تو واقعی لاجواب تھی۔

”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ تمہاری چوائس

بہترین ہے؟'' وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی تھی۔

''کیوں کہ..... میری چوائس..... بہترین ہے۔'' وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا نہ جانے یہ شرم تھی یا شرمندگی۔ وہ خاموش ہوگئی تھی۔ وہ اب دوبارہ کھانے میں مشغول ہوگیا تھا مزید کوئی ذومعنی جملہ بولے بغیر۔

وہ چند دن کے لیے پاکستان آیا تھا۔ وہ اپنے گھر کا انٹیریئر تبدیل کرنا چاہ رہا تھا۔ شروع شروع میں ''ہم اپنے گھر کو مل کر سجائیں گے۔'' کا راگ الاپ کر زین نے اس کے دل میں ایک نیا ساز بجایا لیکن وہ بہت جلد جان گئی کہ اس دھن کے سارے سروں کی تان زین پر آکر ٹوٹتی تھی۔ اس نے گھر کی نفاست اور سجاوٹ کے حوالے سے سگھڑ اور آرٹسٹک عورتیں ضرور دیکھی تھیں لیکن سگھڑ مرد، پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

زونیا کو اپنا آپ پھوہڑ لگنا شروع ہوگیا۔ وہ ہر چیز میں اس کی رائے ضروری لیتا تھا لیکن آخر میں اپنی ہی پسند کی چیز خریدتا تھا۔ اس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ فرنیچر کلر اسکیم، ڈیکوریشن، پردے کس اسٹائل کے ہوں گے، پینٹنگز..... ہر چیز کے بارے میں ذہن میں نقشہ بنا کر گئی تھی مگر..... ابتدائی ایک گھنٹے کے بعد اس کے سارے خواب بلی کو نظر آنے والے چھیچھڑے ثابت ہوئے۔ وہ پہلے بڑے اطمینان سے اس کی رائے سنتا اور اگلے لمحے کسی نہ کسی دلیل کے ساتھ بڑے مزے سے اسے رد کر دیتا۔

کبھی کبھار زونیا کو لگتا جیسے اس آدمی کو اس سے محبت ہے ہی نہیں۔ اس نے اس کے منہ سے روایتی قسم کا اظہار محبت نہیں سنا تھا۔ خیر دیکھ لوں گی شادی کے بعد۔ وہ روایتی انداز میں سوچ رہی تھی۔ دو لوگ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے دور، اپنی دنیا میں مگن ہوگئے تھے۔ زین کی زبان پر اب نور جہاں کا ذکر بھی کم کم آنے لگا تھا۔ گھر، دنیا، مستقبل اس حوالے سے باتوں اور ارادوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ زین جتنے دن بھی پاکستان میں رہا گھر اس کی توجہ کا مرکز رہا۔ اس کے جانے کے بعد زونیا کو نور جہاں کی کال آئی تھی۔

☆☆☆

''تم ممی کو بتائے بغیر ہی پارٹی چھوڑ کر واپس چلی گئیں؟'' حال احوال اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے فوراً بعد وہ اصل بات کی طرف آیا تھا۔ زونیا اس کی بات سن کر ٹھٹکی تھی۔

''ہاں امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے جلدی آنا پڑا۔ آنٹی مجھے نظر نہیں آئیں تو بس۔''

''اٹس اوکے یار، میں تم سے شکایت نہیں کر رہا نہ ہی ممی نے کوئی شکایت کی ہے۔ وہ بس تھوڑی اپ سیٹ تھیں۔ یہ پارٹی انہوں نے تمہارے اعزاز میں رکھی تھی۔'' اتنا جھوٹ۔

''بہت عزت دی مجھے تمہاری ممانے۔'' اس کا عجیب لہجہ زین محسوس نہیں کر پایا تھا۔ وہ بھی سچ نہیں بول پائی تھی۔

''میرے آگے پیچھے گھومتی رہیں۔ ہر ایک سے میرا انٹروڈکشن کروایا۔'' وہ جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی نہ جانے کیوں۔

''پھر کیسا لگا تمہیں اپنا فیوچر انٹروڈکشن مسز زین۔''

زونیا یہ سوچ کر مسکرائی تھی کہ پارٹی چھوڑ کر جانے والی بات زین کے ذہن سے نکل چکی تھی۔

''بہت اچھا لگا۔ تم انہیں میری طرف سے شکریہ کہنا۔ میں نے تو کہہ دیا تھا لیکن تم بھی کہو گے تو وہ اور خوش ہو جائیں گی۔''

نہ جانے کون سا پیغام دینا چاہتی تھی وہ نور جہاں کو شاید ان کے حربے کی ناکامی کا۔

''بہت بزی تھا دو دن سے۔ تمہیں کال ہی نہیں کر پایا۔'' اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ بس اسے ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

''تم پریشان ہو؟'' آخر کار اس نے سوال کیا تھا۔

''تھکی ہوئی ہوں۔''

وہ اس کی بات پر ایمان لے آیا تھا۔

نور جہاں نے فون کر کے اسے اپنے گھر پارٹی میں انوائٹ کیا تھا۔ وہ خوش گوار حیرت میں مبتلا ہوئی تھی۔ آخر کار برف ٹوٹ گئی تھی۔ اس پارٹی میں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہاں سب کچھ اس کے خلاف تھا۔ وہ پارٹی ایک چوہے دان تھی۔ وہ سارا وقت وہاں اجنبی کی طرح بیٹھی رہی۔ نور جہاں سارا وقت پارٹی میں ایک بے حد حسین لڑکی کو ساتھ لیے گھومتی رہیں۔ وہ بار بار جتاتی ہوئی نظروں سے اسے بھی دیکھتی رہیں۔

پارٹی سے واپس آنے کے بعد وہ کچھ اپ سیٹ تھی۔ سب سے زیادہ مشکل مرحلہ اپنے گھر والوں کا سامنا تھا۔ اسے ایک عجیب سی شرمندگی تھی۔ اس وقت کئی سوچیں اس کے گرد بھوت بن کر ناچ رہی تھیں۔ اگر آنٹی کو اس رشتے پر اعتراض تھا تو انہیں اپنے بیٹے کو یہ بات بتانی چاہیے تھی۔ اسے اپنی پسندیدگی سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہیں کر پائیں تو اب انہیں سمجھوتا کر لینا چاہیے تھا۔ یوں اپنی اور دوسروں کی زندگی برباد نہیں کرنی چاہیے تھی۔

اس نے اپنی جیولری اتارتے ہوئے سوچا تھا۔ بہت دنوں بعد اس نے یہ جیولری پہنی تھی۔ اگر ایسا ہی چلتا رہا تو زندگی کیسے گزرے گی۔ وہ سوتے ہوئے بھی ان سوچوں کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ اگر زین نے مجھے چھوڑ دیا تو؟ کروٹ بدلتے ہی سوچ نے ایک نیا رخ پکڑا تھا۔ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوا تھا۔ نہیں وہ ایسا کیوں کرے گا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا۔

دو دن بعد اس کے پاس زین کی کال آئی تھی۔ نور جہاں نے اس سے زونیا کی شکایت کی تھی۔ وہ بچی نہیں تھی کہ اس ساری حرکت کا مطلب نہ سمجھ پائے۔ وہ عورت ان دونوں کے درمیان فساد پیدا کرنا چاہ رہی تھی۔ زونیا نے عقل مندی سے اس عورت کا حربہ ناکام بنا دیا تھا۔ زین نے اس کی بات پر یقین کیا تھا۔

اب اسے نور جہاں کی کال کا انتظار تھا۔ وہ عورت اس کی دشمن تھی۔ وہ عورت اس کے اور زین کے درمیان ہمیشہ کی جدائی چاہتی تھی اور وہ عورت زیادہ دیر تک چپ بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھی۔

☆☆☆

''تم نے زین سے کہا کہ میں نے تمہارا خیال رکھا، تمہیں عزت دی۔'' ان کی تلملاہٹ نے اسے مزا دیا تھا۔

''آنٹی! اس میں جھوٹ کیا ہے۔ میں نے اس پارٹی کو بہت انجوائے کیا تھا۔'' وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔

''تمہاری جگہ کوئی خاندانی لڑکی ہوتی تو اتنی بے عزتی کے بعد منگنی توڑ دیتی۔ غیرت کے مارے اپنے منگیتر سے منہ پھیر لیتی فون تک نا اٹھاتی۔'' وہ غراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''اور آپ جیسی خاندانی عورتیں کیا کرتی ہیں؟ اپنے بیٹوں سے ان کی بیوی کی شکایتیں کرتی ہیں۔''

''بیوی نہیں ہو تم اس کی اور میں تمہیں اس کی بیوی بننے بھی نہیں دوں گی۔'' وہ دھاڑ رہی تھیں۔

''ہاں اسی لیے آپ یہ چاہتی تھیں کہ میں زین سے جھگڑا کروں، منگنی توڑ دوں! آپ تو یہی چاہتی تھیں لیکن میں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔'' زونیا نے کہا۔

''تم کل مجھ سے ملنے آؤ۔'' نور جہاں نے سرد لہجے میں کہا تھا۔

اس کی توقع کے عین مطابق اگلے دن ان کی کال آئی تھی۔ سیدھی سی بات تھی۔ ان کی پلاننگ ناکام ہوئی تھی۔ مرچ مسالا اور لیموں پانی چھڑک کر بیٹے کو شکایت لگانے کا مقصد اس کے اور زین کے درمیان فساد کا بیج بونا تھا لیکن زونیا نے نہایت چالاکی سے ان کے نمک مرچ لگائے الزامات کو شہد کی گھٹی پلا دی تھی۔ اب وہ ملغوبہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ انہوں نے اسے اکیلے بلایا تھا۔ وہ تھوڑی پریشان ہوئی لیکن اس نے انکار نہیں کیا۔

☆☆☆

اس نے پہلی بار زین کا گھر دیکھا تھا۔ وہ کوئی وسیع و عریض بنگلہ نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت مکان تھا۔ دروازہ ملازمہ نے کھولا اور اسے اندر لے آئی۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے اس نے وہاں موجود ہر چیز پر ایک نظر ڈالی اور اس کے اندر تک محبت اور سرشاری جاگ اٹھی تھی۔ فرنیچر، ڈیکوریشن پیسز، پینٹنگز، وہ ہر چیز کو سیٹ کرنے کے بعد اس کی تصویر زونیا کو واٹس اپ پر بھیج دیتا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ جب تم اس گھر میں آؤ تو کوئی اجنبیت نہ رہے۔“ وہ اکثر مسکراتے ہوئے اسے جتاتا تھا۔

اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہاں داخل ہوتے ہوئے اس کے دل میں ایک عجیب سی کھد بد تھی۔ اس وقت اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا کافی ساری چیزوں کی خریداری میں وہ بھی اس کے ساتھ رہی تھی۔ وہ نور جہاں سے ملاقات کا ڈر نہ جانے کہاں سویا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنے گھر میں کیسی گھبراہٹ اور کہاں کا ڈر۔

تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے دیوار پر لگی ایک پینٹنگ کی جانب دیکھا۔ یہ پینٹنگ اس کی اور زین کی سب سے پسندیدہ ترین پینٹنگ تھی۔ وہ ایک جھیل کا منظر تھا۔ جھیل کے اوپر آسمان کو فوکس نہیں کیا گیا تھا بلکہ ناریل کے درخت آسمان کی طرح اسے ڈھانپے ہوئے تھے۔ دور سے دیکھنے میں ایسا لگتا، جیسے ناریل کے درختوں کا فریم ہے جس میں وہ جھیل مقید ہے۔ اس منظر کی خاص بات سکون تھا وہ اس تصویر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

وہ بہت اچھی میزبان ثابت ہوئیں۔ شام کی چائے پینے کے دوران انہوں نے اسے ڈنر کے لیے روکا اور وہ انکار نہیں کر سکی تھی۔ ان کا نام نور جہاں تھا۔ تمکنت بھی نام والی ہی تھی۔ زین نے جب ان کا ذکر کیا وہ اسے ہمیشہ ایک مظلوم عورت لگی تھیں۔ لیکن وہ تو ...... ان کے بال ابھی بھی خاصے خوبصورت تھے اور ان

بالوں کو باقاعدگی سے ڈائی کیا جاتا تھا۔ چہرہ سرخ و سفید اور آنکھیں شہد رنگ، ہلکی پھلکی جیولری پہنے۔ ان کی نظریں مسلسل اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ کبھی چبھتی ہوئی اور کبھی جتاتی ہوئی۔ وہ ان کی شخصیت کے رعب میں آ گئی تھی۔ وہ واقعی نور جہاں تھیں۔

گندمی رنگت، سادہ سا ہیئر اسٹائل، اپنے مزاج کے برعکس شوخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے وہ لڑکی ایک کم مائیگی کے احساس میں مبتلا ہوئی تھی۔ اس کے برعکس وہ اس وقت خاصی پر سکون تھیں۔

”میں نے اور زین نے ایک بہت مشکل زندگی گزاری ہے۔ میرے شوہر کے انتقال کے بعد سب رشتے داروں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بچپن تو جیسے اس پر کبھی آیا ہی نہیں۔“

چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے انہوں نے اسے بتایا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کوئی دکھ تھا جو ہلکورے لے رہا تھا۔

”بہت مشکل زندگی گزاری ہے میرے بچے نے۔“ ان کی آواز میں نمی گھلی تھی اور وہی نمی زونیا نے اپنے دل میں گھلتی محسوس کی تھی۔ وہ اپنے دل میں زین کے لیے بے تحاشا ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔

”یہ گھر جو تم دیکھ رہی ہو اس کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک چیز میں میرے بیٹے کی محنت اور وقت شامل ہے۔“

ان کے لہجے میں فخر تھا زونیا کا دل چاہا کہے میں جانتی ہوں ایسی ہی باتیں زین بھی کرتا تھا۔ اتنی ہی آرزدگی اور جذب کے ساتھ۔ لیکن وہ مسلسل بولے جا رہی تھیں اسے بولنے کا موقع دیے بغیر وہ ایسے ہی سن رہی تھی جیسے زین کو سنتی تھی۔ مکمل خاموشی اور توجہ کے ساتھ۔

دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کا ذکر اتنی شدت اور جذب سے کرتے تھے کہ اس کے بولنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہتی۔ اس دوران وہ ہمیشہ سامع کا کردار نبھاتی تھی۔ انہوں نے جیسے اسے اپنا خطاب

pklibrary.com

سننے کے لیے بلایا تھا۔

"میں نے ہمیشہ زین کی پسند اور خوشی کو اہمیت دی ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کو اہمیت دیتا ہے اور چند لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ تم اس کی چوائس ہو۔" انہوں نے چائے کا خالی کپ سامنے رکھی میز پر رکھا۔

"زین نے اپنی لائف پارٹنر کے طور پر تمہیں منتخب کیا ہے اور میں حیران ہوں۔ تم ایک بہت اچھی، مہذب، تعلیم یافتہ اور سوبر لڑکی ہو زونیا۔ ایک اچھے انسان کی ساری کوالیٹیز تمہارے اندر موجود ہیں لیکن۔"

وہ رکی تھیں، زونیا کا دل ان کی لیکن سن کر ڈوب سا گیا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہارے ساتھ خوش رہے گا۔ وہ ایک زندہ دل، ہنس مکھ اور خوب صورت لڑکی ڈیزرو کرتا ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو ہر طرح کی ذمہ داریوں سے آزاد ہو، میں اپنے بچے کو اب مزید مشکل زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

وہ سن ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے کچھ بھی نہیں نکل پایا تھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑے تھے۔ اس خفیہ دن ٹو دن ملاقات کا مقصد اب اسے سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ خوش آمدید والی ملاقات نہیں تھی۔ یہ بیک ڈور ڈپلومیسی تھی۔ اس نے ہمت کی تھی۔

"کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"میں چاہتی ہوں تم اسے چھوڑ دو۔ میں جانتی ہوں بیٹا، یہ تمہارے لیے آسان نہیں ہے۔ کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ تم اس سے محبت کرتی ہو۔" وہ اب کچھ لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

"زین بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

ان کی بات کاٹ کر اس نے جیسے جتایا تھا۔ ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا۔ وہ مقابلہ کر رہی تھی اور اس بات نے انہیں غصہ دلایا تھا۔

"محبت اور زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جس سے محبت کی جائے وہ زندگی کا حصہ نہیں بن سکتا۔"

سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اپنے طرف رکھی، کارنر ٹیبل سے ایک لفافہ اٹھا کر کھولا تھا اور اس میں سے ایک تصویر نکالی۔

"یہ دیکھو، یہ ہے وہ لڑکی جسے میں نے اپنے بچے کے لیے منتخب کیا ہے۔ دیکھو اسے۔"

زونیا نے تصویر دیکھی وہ ایک بے حد خوب صورت اور شوخ لڑکی کی تصویر تھی۔ جس کے سرخ ہونٹ مسکرا رہے تھے وہ بمشکل تیس سال کی ہوگی۔ کھلے ہوئے بال اور روشن آنکھوں والی، سرخ و سفید رنگت کی لڑکی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو اس رات پارٹی میں نور جہاں کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

"اس کا نام روشنی ہے۔ بہت اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔ زیادہ روپیہ نہیں لیکن پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اس نے ابھی بی بی اے مکمل کیا ہے۔ اس کا چہرہ دیکھو تمہاری طرح متانت نہیں مگر خوشی ہے، نہ وہ تمہاری طرح کسی اولڈ ہاؤس میں رہتے رہتے خود بھی محسن زدہ ہو گئی ہے۔" وہ چونکی تھی۔ ان کا چہرہ بالکل نارمل تھا۔ نہ غصے کے آثار تھے اور نہ ہی تحقیر۔

"تم تو خود نامکمل ہو اس کی زندگی کیسے مکمل کر سکتی ہو۔"

ان کا لہجہ کتنی تضحیک لیے ہوئے تھا اور الفاظ کتنے سخت تھے۔ اس کا اندازہ انہیں نہیں ہوا تھا مگر زونیا کو ہوا تھا۔ ان کا جملہ اس کی آنکھوں میں نمی لانے کا سبب بنا۔ ساری گفتگو میں پہلی بار اس کی ہمت ٹوٹی تھی۔

"تم اس دنیا میں کسی کو خوشی دے ہی نہیں سکتیں۔ تم بس ذمہ داریاں نبھا سکتی ہو۔ خدمتیں کر سکتی ہو۔ تمہاری سوچ کے کئی حصے دار ہیں۔ سب جانتی ہوں میں تمہارے بارے میں، تمہاری زندگی کا ہر موڑ، ہر نیا دور، تم نے دکھ کو بہت قریب سے دیکھا ہے میری طرح۔" ان کی آواز کچھ دھیمی ہوئی۔

"جو دکھ کو قریب سے دیکھ لے وہ خوشی کا مفہوم بھول جاتا ہے۔ وہ تمہاری طرف اس لیے بڑھا کیوں کہ اسے تمہارے اندر میری جھلک نظر آتی ہے

اور میں اس کی زندگی میں اپنی طرح کی عورت نہیں چاہتی۔" وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی تھیں۔ ان کے لہجے میں خوف تھا۔

"شادی کے بعد وہ بھی تمہارے اولڈ ہاؤس کا حصہ بن جائے گا، جہاں دنیا سے کٹ کر رہنے والی تین بوڑھی عورتیں رہتی ہیں۔ اس کی ساری زندگی ان کی دواؤں کی خریداری اور دقیانوسی قصے سننے میں گزر جائے گی۔"

خشک ہوتے حلق کے ساتھ اس نے اپنے بارے میں ان کے خیالات سنے تھے۔

"تم برا مت ماننا لیکن یہی حقیقت ہے۔ میں چاہوں تو زین ابھی اور اسی وقت تمہیں اپنی زندگی سے نکال دے لیکن پھر وہ ساری عمر دکھ میں مبتلا رہے گا۔ کبھی بھی خوش نہیں رہ پائے گا۔ تم انکار کردوں گی تو اتنا فرق نہیں پڑے گا۔"

وہ خاموشی سے بیچ میں موجود میز پر رکھی اس لڑکی کی تصویر کو دیکھتی رہی۔

"وہ میرے بغیر بھی خوش نہیں رہے گا۔" اس نے اس تصویر کو گھورتے ہوئے اپنی جنگ جاری رکھی۔ نور جہاں کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

"میرے بیٹے کو حاصل کرنے کی اوقات نہیں تمہاری۔ اسے پانے کے لیے تمہیں اپنی اوقات بھولنی پڑے گی۔ اپنے خاندان اور اس گھر سے رابطہ توڑنا ہوگا اور ان بڈھی کھوسٹ روحوں سے بھی۔" ان کے لہجے میں تحقیر تھی۔

"اوقات کا کیا ہے آنٹی۔ وقت اپنا ہو تو اوقات بدلتے دیر نہیں لگتی۔" اس نے یہ جملہ کیسے ادا کیا وہ خود بھی بے خبر تھی۔

"میں جانتی تھی کہ تم جیسی لڑکیاں کبھی زین جیسے لڑکے کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں۔ تم جیسی لڑکیاں لوگوں کے خاص طور پر مردوں کے ذہن مسخر کرنا جانتی ہیں۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔"

"مجھ جیسی لڑکی....." وہ بڑبڑائی تھی۔ "اسے میرے اندر آپ کی جھلک نظر آتی ہے۔" زونیا نے کہا۔

"جانتی ہوں لیکن میں نہیں چاہتی کہ اس کی زندگی میں میری طرح کی لڑکی آئے۔" وہ تلخ لہجے میں کہنے لگیں۔

"میری ذمہ داریاں اس کا حق کھا گئیں۔ اسے وہ توجہ دے ہی نہیں پائی جس کا وہ حق دار تھا۔" ان کا لہجہ رندھ گیا انہوں نے اچانک ایک قابل رحم عورت کا روپ دھار لیا۔ وہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"آپ کا بیٹا میری خواہش نہیں، میں اس کی خواہش ہوں۔" کوئی شور تھا جو مسلسل اس کے دماغ سے ٹکرا رہا تھا۔

"میری ایک ناں اس خواہش کو خاک کر سکتی ہے۔"

اب کی دفعہ ان کے لہجے میں حقارت تھی۔ بے طرح، بہت زیادہ۔ ان کا چہرہ جیسے کسی ملکہ کا چہرہ تھا اور وہ جیسے کوئی کنیز تھی۔ شہزادے پر ڈورے ڈال کر سلطنت کے خواب دیکھنے والی کنیز۔

وقت نے اس سے ایک بڑا فیصلہ کروا ڈالا تھا۔ وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کا بیٹا میرے پاس میری وجہ سے نہیں بلکہ اپنی وجہ سے آتا ہے۔ وہ میرا ساتھ چاہتا ہے۔ میرے نقش کھوجنا چاہتا ہے۔ یقین نہیں آتا تو ٹھیک ہے ایک کام کرتے ہیں۔ میں ایک ماہ تک آپ کے بیٹے سے کوئی رابطہ نہیں رکھوں گی۔ نہ کوئی فون کال، نہ بات چیت، نہ میسج، اور نہ ہی ملاقات، اس دوران آپ اپنے بیٹے کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کریں۔ میری کردار کشی کریں۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی کوشش کیجیے گا۔ اس کے پیروں میں زنجیر ڈالنے کی کوشش کیجیے گا۔ لیکن یاد رکھیے گا صرف ایک ماہ۔"

"تم مجھے میرے بیٹے کی نظروں میں گرانا چاہتی ہوں۔" وہ جیسے بلک اٹھی تھیں۔ اس نے پہلی بار انہیں بے قرار ہوتے دیکھا تھا۔

pklibrary.com

''نہیں میں آپ کو اس محبت کا احساس دلانا چاہتی ہوں جو وہ مجھ سے کرتا ہے شدید اور سچی۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں اسے پھانس رہی ہوں تو ٹھیک ہے آپ کے پاس موقع ہے اس جال کو کاٹنے کا۔''

اس کی آواز واضح تھی مگر دھیمی تھی وہ جیسے تختہ دار پر تھی۔ گلے میں پھندا ڈالے۔

چہرے پر نقاب چڑھائے۔ اندھی بنی محبت، اپنے انجام سے بے خبر، نجات یا پاداش۔

''میں چلتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے اس سے منہ پھیرا تھا۔

''ٹھہرو تمہیں ڈرائیور گھر چھوڑ دے گا۔'' اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے انہوں نے حکم صادر کیا تھا۔

''میں خود چلی جاؤں گی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''تمہارا یوں اکیلے جانا مناسب نہیں ہم خاندانی لوگ ہیں اور ذاتی باتوں کی تشہیر نہیں کرتے۔'' یہ جتا کر انہوں نے ڈرائیور کو بلایا۔ وہ وہاں کھڑی حیرت سے اس عجیب وغریب عورت کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

سترہ دن گزر چکے تھے۔ اس نے زین کی کالز اٹینڈ کرنا بند کردی تھیں فون کی گھنٹی بجتی رہتی۔ وہ اس کی کالز کاٹتی نہیں تھی۔ اس کے میسجز پڑھ لیتی تھی وائس نوٹ سن لیتی تھی لیکن کسی بھی قسم کا جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ پریشان تھا حیران تھا۔ اس کے پاس ڈھیر سارے سوالات تھے۔ ناراضگی کی وجوہات جاننا چاہتا تھا۔ زونیا کو نہ جانے کیوں ایک ضد سی ہوگئی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار انا کو اہمیت دی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اپنی ضد کبھی نہیں توڑے گی۔ اس رات وہ گھر واپس آنے کے بعد بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی اس کے اندر، اپنی گزری ہوئی ساری زندگی ایک فلم کی طرح اس کی آنکھوں میں گھومتی رہی۔ ہر محرومی، ہر مشکل اور آزمائش، اس کی عمر کی لڑکیاں کتنی بے فکری کی زندگی گزار رہی تھیں اور وہ۔

کم از کم میری زندگی میں آنے والا شخص تو مکمل طور پر میرا ہو۔ ایک انوکھی ضد پکڑی تھی اس کے دل نے۔ اسے میرے اور اپنی ماں کے درمیان انتخاب کرنا ہوگا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے زین سے ہر رابطہ توڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھاگا بھاگا پاکستان آئے گا اور پھر آخری مرحلے میں وہ اس کی ماں کے حوالے سے چوائس دے گی۔

ہر دفعہ عورت قربانی دیتی ہے محبت کے لیے۔ اب کی دفعہ قربانی مرد دے گا۔ اس نے نخوت سے سوچا تھا۔

اسے اپنی ماں اور مجھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اسے شدت سے انتظار تھا اس کی واپسی کا۔ اب اس محبت کا انجام زین احمد طے کرے گا۔ وہ اس کی واپسی کے دن گننے لگی تھی۔ زین نے اسے کئی مشترکہ دوست کے ذریعے بھی کانٹیکٹ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پہلے پانچ دن وہ اسے وقفے وقفے سے کال کرتا تھا۔ شاید اسے لگا ہو کہ زونیا مصروف ہے اس لیے اس کی کال نہیں اٹینڈ کر رہی۔ زونیا کو اس کے وائس نوٹ اور تحریری پیغامات ملتے رہے۔ جن میں وہ اس کی خیریت پوچھتا رہا۔ زونیا نے مکمل طور پر ان پیغامات کو نظر انداز کیا۔

دو دن کے وقفے کے بعد وہ اس سے رابطہ نہ کرنے کا گلہ کرتا رہا۔ پھر اس نے زونیا سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اس سے ناراض ہے؟ رابطہ ختم ہونے کے سولہویں دن اس نے زونیا سے پوچھا تھا کہ وہ اس سے کیوں ناراض ہے؟ اس کا میسج پڑھتے ہوئے زونیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

وہ خود ہی یقین کر چکا تھا کہ زونیا اس سے ناراض ہے۔ سترہویں دن زونیا کو اس کی مس کال موصول ہوئی تھی۔ اٹھارویں دن اس نے نہ کوئی میسج کیا اور نہ کوئی فون کال۔

وہ رات سونے سے پہلے بہت حیران ہوئی۔ کال کیوں نہیں کی اس نے۔ کیا اس کی ماں نے سب

بتا دیا۔ وہ ساری رات فکر مند رہی۔ ساری رات بار بار فون کو دیکھتی رہی۔ جب سے ان کی بات طے ہوئی تھی یہ پہلی مرتبہ تھا کہ زین نے اسے نہ ہی کال کی تھی اور نہ ہی کوئی میسج بھیجا تھا۔ اس کی وجہ زونیا کو صبح معلوم ہوگئی تھی۔

وہ اس کی ناراضگی کو دل میں لیے اس دنیا سے جا چکا تھا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ بہت دیر تک بے یقین رہی۔ اس کے سارے سوالات دل میں رہ گئے تھے۔ زین احمد اس آزمائش سے بچ گیا تھا جس میں زونیا اسے ڈالنا چاہتی تھی۔

پورے اٹھارہ دن سے وہ اس سے رابطے میں نہیں تھی۔ اللہ نے اسے محبت جیسی نعمت سے نوازا تھا۔ سچی محبت کی نعمت سے جو اس دنیا میں بہت سی آنکھوں کا خواب ہوتی ہے جس کو حاصل کرنے کی چاہ انسان کو بلیک میل کرتی رہتی ہے۔ اسے کھائی تک لے جاتی ہے۔ وہ اسے بیٹھے بٹھائے مفت میں مل گئی تھی اور اس نے اس محبت کو ایک زوردار ٹھوکر ماری تھی انا و ضد کی جنگ میں اس نے محبت ہاری تھی۔ اس کی تدفین کے دوران زونیا نے ایک آنسو تک نہیں بہایا جب دل صحرا بن جائے تو آنسو ریت بن کر اڑتے ہیں۔ پانی بن کر نہیں بہتے۔ اس نے نور جہاں کو پرسہ بھی نہیں دیا۔ اسے ایک کونے میں بیٹھی روتی ہوئی اس عورت کی شکل سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔

وہ بس ان اٹھارہ دنوں کا حساب لگاتی رہی۔ کتنے گھنٹے، کتنے منٹ، کتنے سیکنڈز، پھر ان لمحوں کی گنتی کرتی رہی کب کب اس نے میسج کیا، کب کال کی۔ وہ اس کے لیے دعا تک نہیں کر پا رہی تھی۔ کس منہ سے دعا مانگتی وہ اس کے لیے۔ احساس جرم بوجھ بن کر اس کے دل پر دھرا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا رکاوٹ ہے جو اس کی روح کو جکڑے ہوئے تھی۔ وہ کون سا سوال تھا جو اسے ہلنے نہیں دے رہا تھا اپنی جگہ سے۔

☆☆☆

زونیا ان تینوں کے سامنے بیٹھی تھی۔ خاموش ایسے جیسے کوئی مجرم واردات کے بعد خاموش بیٹھا ہوتا ہے۔ سر جھکائے، شرمندہ، احساس گناہ سے چور اور سزا کے خوف سے کانپتا۔ اجڑی ہوئی حالت میں، سوجی آنکھیں لیے سسکیاں بھرتی ہوئی۔ بکھرے الجھے بال۔

وہ تینوں اس کے اردگرد بیٹھی تھیں۔ جیسے انتظار میں تھیں کہ زونی روئے گی تو اسے دلاسہ دیں گی لیکن وہ تو روہی نہیں رہی تھی۔ تینوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کر رہی تھیں۔ اسے تسلی دینے والا کون تھا۔ وہ ہمیشہ ان تینوں کو سنبھالتی ہوئی آئی تھی اور اب وہ تینوں اپنے اس مضبوط سہارے کو ڈھیر ہوا دیکھ رہی تھیں۔ زونی کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ تینوں کیا سوچ رہی ہیں ساتھ نبھانے کے سارے وعدوں اور قسموں کے باوجود وہ اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

وہ اس کے ساتھ مل کر زندگی کے سفر کو نیا موڑ دینا چاہتی تھی لیکن یہاں تو..... سفر ہی بدل گیا۔ ان کے درمیان فاصلہ آ گیا تھا۔ آسمان اور زمین کا فاصلہ، زندگی اور موت کا فاصلہ، وہ صرف دو دن گھر میں رہی۔ تیسرے دن آفس جانا شروع ہوگئی۔ تین عورتوں نے اپنی کمزور نظر والی عینک کے پیچھے کھوجتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ نہ روئی تھی نہ چلائی تھی۔ دو دن تک بس کمرے میں بند رہی تھی۔ وہ تینوں ساری رات باری باری اٹھ اٹھ کر اس کے کمرے میں جھانک کر واپس آ جاتیں۔ نہ جانے کون سا وہم تھا جو انہیں اس طرح کی حرکت کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ انہیں لگتا جیسے وہ خودکشی کر لے گی۔ جیسے کہ سنیما کی اسکرین پر نظر آتا ہے۔ ٹی وی ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے اور ناولوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔

وہ اپنا ہر کام بہت نارمل انداز میں انجام دے رہی تھی۔ روز دفتر جاتی۔ وقت پر واپس آ جاتی۔ بس اس کی سیاہ بادلوں والی آنکھیں اداسی کے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔ وہ ان آنکھوں کی اداسی سے خوف زدہ تھیں۔ اندر ہی اندر وہ تینوں لرز جاتیں۔ پرانے

خوابوں کے غم میں مبتلا آنکھوں میں نئے خواب نہیں بس سکتے۔

☆☆☆

کمرے میں اندھیرا تھا گھپ اندھیرا۔ روشنی کی کوئی کرن تھی نہ ہی کوئی دیا۔ ایک ہیولہ حرکت کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ہیولہ وہ خود تھی۔ پھر اچانک کہیں سے ۔ کوئی روشنی نمودار ہوئی میٹھی، ٹھنڈی، لطیف سی روشنی اور پھر اس کے سامنے ۔ وہ چہرہ آیا تھا۔ جسے وہ پچھلے کئی دن سے تلاش کررہی تھی۔ اس کا وجود تھم سا گیا تھا۔ وہ زین تھا۔ اپنے اسی انداز میں۔

"تم کہاں چلے گئے ہو زین؟" وہ بے بسی سے بولی تھی۔ وہ اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مگر اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ۔

"یہ تم نے کیا کیا زونی میرے اور اپنے درمیان اتنی دیواریں کیوں کھڑی کردیں۔" اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

"میں نے ......تو ...... میں وہ" اس کی دھیمی آواز مزید پست ہوئی تھی۔

"تم نے اپنے اور میرے تعلق کو داؤ پر لگایا زونی۔" وہ اس سے مدھم آواز میں کہتا جارہا تھا۔

"تم کیوں چلے گئے میری زندگی سے۔"

آنسو آنکھوں سے ٹوٹ کر گالوں پر آئے۔

"تم نے خود مجھے اپنی زندگی سے نکالا تھا۔ کیا بھول گئیں؟"

"سب یاد ہے مجھے۔ زندگی کی سب سے مہلک غلطی، بھیانک فیصلہ کوئی بھولتا ہے بھلا۔"

اس کی آنکھیں اس چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھونا چاہا مگر اس کا وجود ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ واپس آیا تھا کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا۔ وہ شاید کوئی شیشے کی دیوار تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ دیوار تم نے کھڑی کی ہے میرے اور اپنے درمیان۔" اس کے چہرے کی سفیدی میں ایک ہلکی سی سرخی جھلکی تھی۔

"تم نے مجھے داؤ پر لگایا۔"

"نہیں زین، میں نے تو اپنے آپ کو داؤ پر لگایا تھا۔"

"کس نے کس کو داؤ پر لگایا یہ فیصلہ لاحاصل ہے۔" وہ اس سے دور جارہا تھا۔ کسی دوسرے راستے۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلیں اور پھر اس نے زین کو آواز دینی چاہی تھی۔ اس کی آواز حلق میں ہی دب گئی تھی۔

اس کی آنکھ کھلی۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں تھی۔ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نقاہت کے مارے اسے چکر آگیا۔ آج کیا تاریخ ہے۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا تھا۔ تاریخ ٹھیک تھی۔ زین کو اس کی زندگی سے گئے ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔ نہ جانے کس آس پر اس نے تاریخ دیکھی تھی۔ کیا پتا وہ ایکسیڈنٹ وہ موت سب خواب ہو۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جیسے وہ وقت کے گزرنے سے ناراض تھی۔

کپکپاتے ہونٹ، آنکھوں کے گرد حلقے، سرخ ناک، پژمردہ انداز وہ کسی آواز کے ٹرانس میں تھی۔

وہ روز کی طرح تیار ہو کر آفس چلی گئی۔ روز کی روٹین کے دوران ایک خیال بار بار اس کے ذہن سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ بجھ گئی تھی۔ یہ موت کا سوگ نہیں تھا جو طاری تھا یہ تو اس جدائی کا سوگ تھا جو اس نے پہلے ہی اپنے اور اس کے درمیان پیدا کردی تھی۔ محبت میں خود ساختہ جلاوطنی بہت بڑی بے وقوفی ہوتی ہے۔ آزمائش کرنا پاگل پن ہوتا ہے۔ وہ سارا دن سوچتی رہی۔ اسے اپنے اوپر غصہ آتا رہا۔ وہ خود کو کوستی رہی۔

ہاں زونیا تمہاری سزا یہی ہے ہمیشہ کی جدائی۔ مگر وہ اکیلے کیوں بھگتے یہ سب، اس کی ذمہ دار تو وہ عورت بھی ہے جو اس جنگ میں برابر کی شریک تھی۔ وہ ایک فائل کا جائزہ لیتے لیتے تھکی تھی، اسے بہت

pklibrary.com

شدت سے نور جہاں کا خیال آیا تھا۔ اس کے وجود میں ایک غصے کی لہر سی اٹھی تھی۔

☆☆☆

اس نے حیرت سے عالیہ کو دیکھا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ زین کی والدہ گھر کا سارا سامان بیچ رہی ہیں۔ شاید وہ سب کچھ وائنڈ اپ کر کے ملک سے باہر جا رہی ہیں۔ انہوں نے گھر بیچنے لیے پراپرٹی ڈیلرز سے رابطہ شروع کر دیا ہے۔ وہ عورت اس گھر کو بیچنا چاہتی ہے جو زین نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ زونیا اس خبر سے لاتعلق نہ رہ سکی۔ اس مغرور اور گھمنڈی عورت کے پاس جا پہنچی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ وہاں استقبال گالیوں سے ہوگا۔ اسے منحوس قرار دے کر کوسے گی۔ وہ ہر بات کی پرواہ کیے بغیر وہاں پہنچی تھی۔

زین کے دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ پہلی مرتبہ اس گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ خاموش اور سپاٹ یہ سوچے بغیر کہ نور جہاں اسے دیکھ کر کس قدر نفرت کا اظہار کریں گی۔ کس طرح کی کڑواہٹ اور تلخی سے اسے پکاریں گی۔ کتنی بے عزتی، تضحیک اور تحقیر کے ساتھ اس کے وقار کو مجروح کریں گی۔ اسے تو بس زین کی چیزوں کو چھونا تھا، دیکھنا تھا۔ وہ ایک مرتبہ اس گھر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جسے زین نے اپنی زونیا کے لیے سجایا تھا۔ اس نے بیل بجائی۔ دروازہ نور جہاں یا اس کی خاص ملازمہ کے بجائے ایک عورت نے کھولا تھا۔ میک اپ میں لتھڑے چہرے کے ساتھ اچھی تراش خراش والے کپڑے پہنی عورت نے۔ شاید ان کی کوئی رشتے دار تھی جو رہنے کے لیے آئی تھی۔

"ہاں جی کام کیا ہے؟" وہ عورت تنقیدی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ شاید اسے اونچا بولنے کی عادت تھی۔ وہ اپنے ساتھ عالیہ کو لے کر گئی تھی۔

"ہمیں نور جہاں آنٹی سے ملنا ہے۔" عالیہ نے کہا۔

"آجاؤ اندر۔"

"ویسے وہ جو تمہاری آنٹی ہیں کسی سے بات وات نہیں کرتیں۔"

وہ عورت کہہ رہی تھی۔ زونیا سر جھکائے چل رہی تھی۔

"مجھ سے ضرور کریں گی بات۔" زونیا نے جواب دیا۔ وہ اس عورت کے انداز پر زیادہ غور نہیں کر پائی۔

"تم میں ایسا کیا ہے کہ اس کی زبان سے پھول جھڑنے لگیں گے۔"

"پھول نہیں جھڑیں گے، گالیاں دیں گی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

وہ عورت جس نے اپنا نام رامین بتایا تھا زونیا کو نچلی منزل پر واقع ایک کمرے کے دروازے پر چھوڑ گئی۔ اس نے عالیہ کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور خود اندر داخل ہوئی۔ زونیا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ خالی آنکھوں میں اب وحشت نظر آ رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر اس کی پہلی نظر بیڈ پر پڑی جو خالی تھا۔ کمرے کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے ایک عورت بیٹھی تھی۔ ایک جانی پہچانی اجنبی عورت۔ زونیا اسے چہرے سے پہچان گئی تھی لیکن اس کے انداز بالکل الگ تھے۔ وہ اپنا غصہ بھول گئی۔ حیرانی نے غصے کی جگہ لے لی۔

وہ زمین پر بیٹھی تھیں اتنی سردی میں۔ ان کے ننگے پاؤں فرش پر دھرے ہوئے تھے۔ وہ پشت کے بل ایک دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھیں۔ ان کی آنکھیں سرخ — اور بالکل خالی تھیں۔ ان کی پتلیوں میں سیاہ رنگ ہی نہیں تھا، بخت کا سیاہ رنگ بھی شامل تھا۔ جسمیں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ وہ کروفر اور سخت انداز سب غائب تھا

اس نے زمین پر دیوار سے ٹیک لگائی عورت کو دیکھا تھا۔ الجھے ہوئے بال، بڑھے ہوئے ناخن جن میں میل مٹی جم گئی تھی۔ پھٹی ہوئی ایڑیاں، سوجی ہوئی آنکھیں اور خشک ہوتے ہونٹ۔ اسے اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ سارے لفظ کہیں گم ہو گئے تھے۔

زونی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے قریب آئی تھی۔
"کیسی ہیں آپ؟"
وہ کیسی تھیں زونیا دیکھ سکتی تھی۔ وہ اپنے لہجے کو سپاٹ ہونے سے نہ بچا پائی تھی۔ اس جملے پر انہوں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
"میں...... میں وہ۔" ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہونے والے الفاظ رک گئے۔ وہ متاسفانہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں پھر کچھ ابھر آیا تھا۔ اسی عورت کی وجہ سے اس کے خواب راکھ ہوئے تھے۔ اتنی کالی آنکھیں تھیں اس عورت کی اچانک اس کی نظر ان کے پاؤں پر پڑی۔ وہ بے اختیار خوفزدہ ہوئی تھی۔ ان کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن، سبزی مائل ہو رہا تھا۔ ناخن اوپر کی جانب اکھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا کہ کسی وقت بھی اکھڑ سکتا تھا۔ کیا تھا یہ؟ شاید کوئی فنگل انفیکشن۔ اسے دیکھتے ہوئے زونیا کو کچھ تشویش لاحق ہوئی تھی۔ انہیں فوری طور پر ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔
"تم آگئیں...... تم ...... اپنے گھر...... آگئیں۔" انہوں نے اٹک اٹک کر ایک جملہ ادا کیا۔ زونیا کا دل چاہا زور زور سے ہنسے مگر وہ بھی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔
"امی بہت خوش مزاج اور خوش لباس ہیں زونیا۔ گندگی اور مٹی تو انہیں بالکل برداشت نہیں، اس لیے تم تھوڑی سگھڑ بن جاؤ۔"
ایک دفعہ زین نے اس سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا تھا۔
"تم مجھے ڈرا رہے ہو۔" وہ کچھ خفا ہوئی۔
"نہیں ڈرا نہیں رہا دھمکا رہا ہوں۔" وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔
اس کی سوچ ٹوٹی۔
"اب یہ گھر میرا نہیں اور نہ ہی میرے زین کا ہے یہ صرف آپ کا گھر ہے۔"
وہ خود کو طنز کرنے سے روک نہیں پائی تھی۔ وہ غور سے ان کی حالت دیکھ رہی تھی۔ انہیں چوبیس گھنٹے نگہداشت کی سخت ضرورت تھی۔ اچانک اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ وہ رامین تھی۔ ایک ہاتھ میں دوپٹے کا پلو تھامے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بے حد بھول پن سے بولی۔
"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔" زونیا کا دل چاہا کہہ دے تنہائی کی ضرورت ہے مگر وہ چپ رہی۔ پتا نہیں یہ عورت کیا چاہتی تھی۔ پورے گھر پر قبضہ کرنے کے بعد اسے نہ جانے مزید کیا کچھ چاہیے تھا۔ وہ کون سا خزانہ تھا جس کی وہ متلاشی تھی۔ اس کی بے وقت آمد نے زونیا کو کوفت میں مبتلا کیا تھا۔
"ان کی یہ حالت کب سے ہے؟" اس نے رامین سے پوچھا۔ اس نے منہ بنایا۔
"بہن! ہم تو جب سوئم والے دن آئے تو پڑوسیوں نے ہمیں اسی حالت میں چچی جینداوور کی تھیں۔ بھئی دیکھو سچ بتاؤں تو چچی کی ذہنی حالت شروع سے ہی خراب ہے۔ پہلے بھی یہ ہمیں منہ نہیں لگاتی تھیں اور اب بھی ہمیں منہ نہیں لگاتیں۔ بس فرق یہ ہے کہ پہلے تکبر کی وجہ سے ایسا کرتی تھیں اور اب......" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔
"پتا نہیں کون کون سے گناہ سامنے آرہے ہیں ان کے۔ بس اللہ ہم سب اپنا رحم کرے۔" آخری جملے پر آتے آتے اس کی آواز رقت آمیز ہوگئی۔
"انسانوں کو بھی ایک دوسرے پر رحم کرنا چاہیے۔" کھوئی ہوئی آواز میں بولتے ہوئے اس کی نظر نور جہاں کے ننگے پیروں، الجھے بالوں اور پاؤں کے انفیکشن زدہ ناخن سے ہٹ ہی نہیں پا رہی تھی۔ زونیا نے آج تک ایسی ویران آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ جھیل جیسی آنکھیں اب ریگستان تھیں۔ وہ محبت جو زین کے لفظوں میں نظر آتی تھی اب اس کی ماں کی حالت میں نظر آرہی تھی۔
رامین اب نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ زونیا کو اس کی کچھ باتیں سمجھ میں آرہی تھیں اور کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اسے بار بار زین یاد آرہا تھا۔ وہ باتیں یاد آرہی تھیں جو وہ اپنی ماں کے بارے میں کرتا تھا۔

کیا ہے کون سی شکایت کرے وہ اس عورت سے جو اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی ہے۔ وہ اٹھ کر جانے لگی۔ پھر اچانک اسے کوئی خیال آیا تھا۔ چند منٹ تک اس برف کے مجسمے کو دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھایا تھا۔

"آمین آپ کو بستر پر لٹادوں۔" اس کے لہجے میں نہ ان کے لیے ہمدردی تھی اور نہ ہی ترس، اس کا لہجہ ہر جذبے سے عاری تھا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ اسے تھمایا تھا۔ وہ انہیں سہارا دے کر بستر تک لائی۔ انہیں بیڈ پر لٹانے کے بعد اس نے ان کے اوپر میل ڈالا تھا۔

☆☆☆

اس کا دل پہلے کی طرح پریشان تھا۔ اس نے اپنے لیے دو راستے چنے تھے۔ پہلا زین جو ہمیشہ کے لیے اپنی ماں کو چھوڑ دے، وہ عورت اکیلی رہ جائے۔ دوسرا وہ زونیا سے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کرلے۔ دونوں ہی کام ہو چکے تھے۔ وہ ذہنی طور پر زین کی جدائی کے لیے تیار تھی۔ دھچکا تو اسے زین کی موت نے پہنچایا تھا۔ اس کی موت ۔۔۔ نے زونیا کی ساری خواہشیں پوری کردی تھیں بس طریقہ الگ تھا۔

وہ ہر حال میں زین کو اس عورت سے الگ کرنا چاہتی تھی اور اب ایسا ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ ناخوش تھی۔ اسے ٹوٹی پھوٹی حالت میں دیکھ کر زونیا کو کوئی خوشی نہیں ملی تھی۔

اگلے دن وہ بہت سا فروٹ اور کھانے پینے کی اشیاء لے کر ایک مرتبہ پھر اس دروازے پر موجود تھی۔ اسے دیکھ کر رامین کے چہرے کی رنگت دیکھنے والی تھی۔

"تم پھر آگئیں اور یہ کیا کچھ اٹھا لائی ہو۔ ارے بھئی بڑی بی کچھ نہیں کھا سکتی اور" زونیا نے اس کی بات کاٹی۔ آج وہ یہاں اکیلی آئی تھی۔

"یہ ساری چیزیں آنٹی کے لیے نہیں ہیں۔ یہ سب تو میں آپ کے لیے لائی ہوں۔ یہ فروٹ، سموسے جلیبیاں اور ہاں بچوں کے لیے چاکلیٹ بھی ہیں۔ آنٹی کے لیے تو صرف دوائیں ہیں۔"

اس کی بات پر رامین کا چہرہ دمک اٹھا اور وہی ہوا جو زونیا چاہتی تھی۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی تھی۔

زونیا سمجھ چکی تھی کہ اس عورت کو دے دلا کر ہی اپنا کام نکلوایا جاسکتا ہے۔ اس سے جان چھڑا کر، جب وہ نور جہاں کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ایک مرتبہ پھر زمین پر بیٹھی تھیں۔ اس مرتبہ ان کی جگہ تبدیل ہو چکی تھی اور ان کے ہاتھ میں زین ۔۔۔ کی فریم شدہ تصویر تھی زونیا اس تصویر کو دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی تھی۔ کچھ چیزیں زندگی میں نظر انداز نہیں کی جاسکتی ہیں۔ اس نے بمشکل اس فریم میں نصب تصویر سے آنکھیں پھیری تھیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کا بازو تھام کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے اٹھ گئیں۔ مگر وہ ٹھیک سے چل نہیں پا رہی تھیں۔ زونیا نے نیچے دیکھا ان کے پیروں پر سوجن تھی۔ کہیں اس سوجن کا انگوٹھے کے انفیکشن سے تو کوئی تعلق نہیں۔ وہ کچھ پریشان ہوئی تھی۔ تھوڑی سے کوشش کے بعد وہ نور جہاں کو بستر تک لانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

"آپ سوگ منا کر ثابت کرنا چاہ رہی ہیں کہ آپ اسے مجھ سے زیادہ چاہتی تھیں۔"

انہیں بیڈ پر بٹھانے کے بعد ۔۔۔ وہ اب کمرے کا حلیہ ٹھیک کررہی تھی۔ زین کی فریم شدہ تصویر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔ تصویر رکھنے کے بعد وہ دروازے کے پاس رکھی کرسی کی جانب گئی اور وہاں رکھا شاپر اٹھالائی تھی۔ اسے اس عورت پر اب بھی شدید غصہ تھا۔

"آپ کے پاس بچا ہی کیا ہے آدھی زندگی شوہر کا سوگ مناتی رہیں مگر بیٹے کا سہارا تھا۔ اب باقی زندگی زین کا سوگ منائیں گی۔ اب تو کوئی امید بھی باقی نہیں ہے آپ کے پاس۔"

ان کا اتنا خیال رکھنے کے باوجود، اس نے بے رحمی سے ایک تلخ بات کہی تھی۔ نور جہاں جیسے ہر احساس سے عاری ہو چکی تھیں۔ اگر باتیں اثر کرتیں تو سب سے پہلے جواب رامین کو ملتا۔ اس نے

شاپر میں سے بسکٹ برآمد کیے اور پیکٹ کھول کر نور جہاں کو کھلانا شروع کردیے۔ آدھ گھنٹا لگا لیکن ناخنوں کی میل غائب ہوگئی۔ بال سنور گئے۔ پھٹی ہوئی ایڑیوں میں کچھ بہتری آئی۔ آنکھوں کی سوجن اور جلن باقی رہ گئی تھی اور یہ مسئلہ تو زونیا کی آنکھوں کے ساتھ بھی تھا اور شاید ہمیشہ رہنا تھا۔ وہ دونوں ایسی جنگجو تھیں جن سے میدان جنگ چھن گیا تھا۔

وہ چپ چاپ کھاتی رہیں ان کے کھانے کے دوران زونیا خاموش رہی تھی۔ بسکٹ ختم ہونے کے بعد اس نے اسی شاپر میں سے کچھ دوائیں برآمد کی تھیں۔ دوا کھلانے کے بعد وہ بیڈ کی دوسری جانب آکر بیٹھ گئی اور دوبارہ بولنا شروع ہوگئی۔

"بہت محبت کرتا تھا وہ آپ سے لیکن آپ اس سے بالکل محبت نہیں کرپائیں۔ آپ نے اسے دھوکا دیا۔ اس کی سب سے پیاری چیز کو اس سے دور کرنے کی کوشش کی۔ اپنے آخری وقت میں اس نے تکلیف سہی۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس عورت کا سپاٹ چہرہ اسے تکلیف دے رہا تھا۔

"اس کی زندگی میں پہلے آپ آئی تھیں میں بعد میں آئی تھی۔" وہ مسلسل بولے جارہی تھی۔ مسلسل لیکن بے ربط۔

"ٹھیک کہتا تھا وہ، مجھے نمبر دو پر ہی ہونا چاہیے۔ اس کے غم نے آپ کو پاگل کردیا لیکن میں کتنی نارمل ہوں۔ روز صبح اٹھتی ہوں، ناشتا کرتی ہوں۔ تیار ہوکر آفس جاتی ہوں۔ ہنستی ہوں، بولتی ہوں۔ بھوک بھی ٹھیک ٹھاک لگتی ہے مجھے۔ رومین کے سارے کام بھی کرتی ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوبارہ نور جہاں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ تکیے کے سہارے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ٹانگیں بیڈ پر پھیلائے، نور جہاں کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے، آنکھیں بند کیے وہ اپنا آپ کھول رہی تھی۔

"دیکھیں میں کتنی نارمل ہوں، ہے نا۔" آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ نور جہاں اب دھندلائی ہوئی تھیں۔

"میں تو بالکل نارمل ہوں۔ مجھے تو کوئی غم نہیں ہے۔"

وہ اب مسلسل روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں میں اب تیزی آگئی تھی۔

"اس کا دل میری طرف مائل تھا اور وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ مگر آپ کی ضد نے مجھے بھی ضدی بنادیا۔"

وہ اب ہچکیاں لے رہی تھی۔ بہت دیر تک رونے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر گردن موڑ کر نور جہاں کی جانب دیکھا۔ وہ سو چکی تھیں۔ اس کی ہنسی رو بھٹکی تھی۔ اسے ایک مرتبہ پھر غصہ آیا تھا۔ نور جہاں کا نقاہت زدہ، کمزور وجود اسے زہر لگنے لگا۔ وہ فوراً اس گھر سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

زندگی کے دائرے میں ایک اور دائرے کا اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ روز اس گھر جاتی تھی جو پہلے اس کے لیے زین کا گھر تھا، جسے بعد میں اس نے اپنا گھر کہہ کر خواب دیکھنے شروع کیے تھے۔ اپنے گھر کو اجڑی ہوتا دیکھنا اس کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔ ایک ایک کمرا، ایک ایک دیوار، وہاں موجود ایک ایک فرد، وہ مجبور تھی کچھ کرنہیں پارہی تھی سوائے نور جہاں کی خدمت کے۔ امی ایک دن اس پر خفا ہوئی تھیں۔

"ٹھیک ہے زین کی ماں ہے وہ مگر تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہے نا۔ جان چھڑاؤ اس عورت سے۔" وہ ناشتے کی ٹیبل پر اس سے مخاطب تھیں جو اس وقت ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے لگاتے رک گئی۔ اس کی پیشانی پر شکن ابھر آئی تھی مطلب یہ بات اس کے دل پر لگی تھی۔

"ذمہ داری تو یہ دونوں بھی ہماری نہیں ہیں تو پھر انہیں چھوڑ کیوں نہیں دیتیں آپ؟" سنگلاخ لہجہ اور خنجر کی طرح چبھتے ہوئے الفاظ۔ وہ تینوں گنگ رہ گئی تھیں۔ انہیں اس سے اس حد تک صاف گوئی یا پھر بدتمیزی کی امید نہیں تھی۔

"میرا تو رشتہ لگتا ہے ان دونوں سے تمہارا کون سا رشتہ ہے اس عورت سے۔ اس کا بیٹا تمہارا منگیتر تھا

شوہر نہیں۔ تم اس کی منکوحہ نہیں تھیں اس لیے بیوہ بننے کی کوشش مت کرو۔"

کڑواہٹ کا جواب زہر سے دیا گیا تھا۔ ٹیبل پر موجود سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ جتنی بدتمیزی اس نے کھائی تھی، اتنی ہی بدلحاظی اور رکھائی اس کی ماں نے دکھائی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھتی رہی۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

ہاتھ میں پکڑا سلائس پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے اس نے کرسی پیچھے کی جانب کھسکی، اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گئی جانے سے پہلے شولڈر بیگ سے بجلی کا بل نکال کر ماں کو پکڑایا، جو وہ کل ہی بینک میں جمع کرا آئی تھی۔ رضیہ کچھ تاسف بھری نظروں سے اس ادھ کھائے سلائس کو دیکھتی رہیں جو وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

"تمہیں یوں اس سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اکبری نے انہیں سمجھایا۔

"تو کیا کروں اسے زندگی برباد کرتے ہوئے دیکھتی رہوں۔ ساری دنیا کی خدمتیں کرتی پھرے۔ بس اپنے بارے میں نہ سوچے۔" وہ دکھی لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

زین کا پسندیدہ گٹار اس کباڑ خانے میں ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا۔

"اللہ معاف کرے، میں نے تو اپنے شوہر کو صاف صاف کہہ دیا کہ یہ موسیقی جیسے حرام کام کے آلات گھر میں نہیں رکھوں گی۔ اب دیکھو کیسے کیسے غیر اسلامی شوق پالے ہوئے تھے مرحوم زین بھائی نے۔ بس اللہ مغفرت کرے۔"

وہ اب کانوں کو ہاتھ لگا کے توبہ کر رہی تھی۔ وہ شام کو واپس آتے ہوئے وہ ٹوٹا پھوٹا گٹار بھی اپنے ساتھ لے آئی۔ وہ کمرہ جو شادی کے بعد رہنے کے لیے اس نے تیار کروایا تھا ٹوٹی پھوٹی۔ ٹیڑھی میڑھی نامکمل چیزوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ ہر چیز جو لا سکتی تھی لے آئی تھی۔ زین سے جڑی ہر نشانی۔

وہ رشتے دار جو شوہر کے مرنے کے بعد انہیں اجڑی ہوئی مالی حالت میں اکیلا چھوڑ گئے تھے، وہ بیٹے کے مرنے کے بعد اس کی حلال کی کمائی سے اکٹھا کیا ہوا اثاثہ اڑانے آ گئے تھے۔ وہ دونوں عورتیں ایک ہی کشتی کی مسافر تھیں مگر وہ کشتی ڈوب چکی تھی اور اس کشتی کا نام زین تھا۔ وہ ان کے لیے دوائیں، پھل، کپڑے اور ضرورت کی ساری چیزیں لے کر جاتی۔ ان کی پسند ناپسند ہر چیز کے بارے میں پہلے ہی باخبر تھی۔ اس کی سورس آف انفارمیشن بہت مضبوط تھی اور وہ تھا ان کا بیٹا۔

وہ خاموش رہتی تھیں۔ ان کے رشتے دار کسی مال مفت دل بے رحم کی طرح، ان کے گھر میں آن گھسے تھے۔ یہ گھر زین نے اپنی کمائی سے لیا تھا۔ اس گھر میں رکھی اور سجی ہوئی ہر چیز اس کی محنت کے پیسوں سے آئی تھی۔ ایک ایک چیز سے زونیا کی یادیں جڑی تھیں۔

اب ان سب چیزوں پر دوسروں کی چلتی ہوئی حکمرانی، زونیا کو عجیب بے بسی کا احساس دلاتا تھا۔ ہر چیز سے کہانی وابستہ تھی۔ ہر کہانی سے یاد جڑی تھی۔

ایک دن وہ آئی تو ڈرائنگ روم کا فرنیچر تبدیل ہو چکا تھا۔

"ڈرائنگ روم میں اتنے بڑے صوفہ سیٹ کی کیا ضرورت تھی اسی لیے ہم نے اسے بیچ کر دو چھوٹے صوفہ سیٹ لے لیے ہیں اس طرح زیادہ لوگوں کے بیٹھنے جگہ بن گئی ہے۔"

رامین نے چہکتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

"وہ سیٹ زین کو بہت پسند تھا اس نے آرڈر پر بنوایا تھا۔"

اپنے غصے کو ضبط کر کے وہ کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"لیکن ہمیں پسند نہیں تھا بھئی، بڑا ہی قیمتی سیٹ تھا۔ اب اتنا مہنگا سیٹ گھر میں رکھنے کی کیا تک بنتی ہے۔ ہم نے اسے بیچ کر ایک بلکہ دو صوفہ سیٹ خرید لیے وہ بھی بالکل آدھی قیمت میں اور باقی پیسوں سے نیا فریج لے لیا۔"

وہ بہت فخر کے ساتھ اپنا کارنامہ بتا رہی تھی۔

pklibrary.com

''زین بھائی تو دنیا سے چلے گئے اب ان کا ان چیزوں سے کیا لینا دینا۔'' اپنے لہجے کو دکھی بناتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس دن وہ پہلی بار ان کے پاس آئی اور ان سے الجھ پڑی۔

''آپ ان لوگوں کو کچھ کہتی کیوں نہیں ہیں۔ چپ کیوں ہیں، چپ کو توڑ دیں۔''

وہ ان کا گھٹنا ہلا رہی تھی۔ روتے بلکتے اس نے اسی گھٹنے پر ماتھا ٹیک دیا اور چند لمحوں بعد اس نے اپنے سر پر ایک ہاتھ پھرتے ہوئے محسوس کیا۔ جو وجود خود ٹوٹ چکا ہو وہ کسی اور کو کیا توڑے گا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بدسے بدترین ہونا ابھی باقی تھا۔

☆☆☆

اکبری کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ اس کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ زونیا کئی دن تک نور جہاں کے پاس نہیں جا پائی تھی۔ کئی دن بعد پہنچی تو دروازے پر تالا لگا تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ رامین اور اس کا شوہر سب کچھ بیچ کر دبئی چلے گئے ہیں۔ نور جہاں یہیں تھیں اسی شہر میں۔ نائمہ نامی پڑوسن نے اسے ایک کاغذ تھمایا جس پر نور جہاں کا پتا لکھا تھا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر عالیہ کو ساتھ لیے اس پتے پر پہنچی۔ حیرت، دکھ اور صدمے کے مارے اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ جگہ ایک اولڈ ہاؤس تھی۔

''شادی کے بعد وہ بھی تمہارے اولڈ ہاؤس کا حصہ بن جائے گا جہاں دنیا سے کٹ کر رہنے والی تین بوڑھی عورتیں رہتی ہیں۔ اس کی ساری زندگی ان کی دواؤں کی خریداری اور دقیانوسی قصے سننے میں گزر جائے گی۔''

ایک نخوت بھری آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

زندگی کا دھارا اور وقت کی سوئی اس نخوت کو کسی کے لیے سزا کے طور پر چن چکی تھی۔ وہ عورت جو اس بھیانک غلطی کی وجہ تھی، اسے اولڈ ہوم میں پھینک کر وہ دونوں میاں بیوی بیرون ملک فرار ہو چکے تھے۔

''دیکھا تم نے اس عورت کا انجام۔'' اس کے اندر آواز گونجی تھی۔

''اسے کہتے ہیں مکافات عمل، تمہیں دھمکیاں دینے والی آج کس حال میں ہے۔''

''دیکھو اللہ نے کیسا انصاف کیا ہے۔'' وہ ان آوازوں کو سنتی رہی۔

وہ نور جہاں سے ملے بغیر اولڈ ہاؤس کے گیٹ سے واپس چلی آئی۔

☆☆☆

وہ تینوں بہت خوش تھیں۔ زونیا صبح سے اس کمرے میں گھسی ہوئی تھی۔ خوب صفائیاں ہو رہی تھیں۔ وہ بہت دنوں بعد یوں مصروف نظر آ رہی تھی۔ صبح صبح اٹھ کر صفائی والی کے ساتھ مل کر کمر اصاف کر رہی تھی۔ کمرے میں موجود ہر ٹوٹی پھوٹی چیز پھینک دی۔ جیسے وہ زین کی ہر نشانی کو اپنی زندگی سے نکال کر پھینک دینا چاہتی ہو۔ حتیٰ کمرے سے سارا کاٹھ کباڑ نکالا جا چکا تھا سوائے اس پینٹنگ اور گٹار کے اس کی جگہ ایک سنگل بیڈ، گول میز اور دو کرسیاں رکھی جا چکی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ایک سنگل ڈور لکڑی کی الماری بھی۔

دوپہر تک سب کچھ سیٹ ہو چکا تھا۔

''امی اٹھ گئی ہوں میں، کچھ کھانے کو دے دیں۔''

نہ جانے کتنے دنوں بعد اس نے کھانا ضرورت کے تحت نہیں شوق سے کھایا۔

سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے وہ اداسی اور خالی پن غائب تھا، جو زین کے جانے کے بعد اس کے وجود کا ایک حصہ بن چکا تھا۔

ان کی یہ غلط فہمی اس وقت ٹوٹ گئی جب شام کے وقت زونیا نور جہاں کو سہارا دیے اندر داخل ہوئی تھی۔ بوڑھی، رعشہ زدہ وجود، سوکھے ہونٹ اور خالی آنکھوں والی نور جہاں۔ لعل اولڈ ہاؤس کی نئی مکین۔ اس عورت کو سہارا دے کر اندر لاتے ہوئے وہ اس احساس جرم اور احساس ندامت سے نجات حاصل کر رہی تھی، جو کئی دنوں سے کانچ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کی طرح اس کے دل کو کاٹ رہا تھا۔ اولڈ ہاؤس اپنی نئی مکین کا استقبال کے لیے تیار تھا۔

☆☆

اُس کو خط لکھنا وبال ہو گیا تھا
مگر ہم ہی سے یہ کمال ہو گیا تھا

ہاں محبت کے کچھ خطوط اُس نے بھی لکھے
اور اُن میں سے ایک ارسال ہو گیا تھا

بہت چاہا کہ اُسے کوئی نہ گزند پہنچے
جبر کے بعد بھی اک سوال ہو گیا تھا

کب یہ چاہا کہ بچھڑوں لیکن بچھڑنا ہی پڑا
جب وہ بچھڑا تو خود سے مثال ہو گیا تھا

ایک عرصے بعد اُس نے پوچھا کہ تم کیسے ہو
چلو اُسے بھی تو کچھ خیال ہو گیا تھا

عشق سے پہلے ظریف کون اُسے جانتا تھا
عشق کے بعد وہی بے مثال ہو گیا تھا

ظریف احسن

سالِ نو

نفرتوں کی گہرائیوں سے
محبت کو کشید کرتے ہیں
تمام تر شکستہ سامانیوں
کو بس مقید کرتے ہیں
ادھورے خوابوں کو
از سرِ نو تعمیر کرتے ہیں
اے سالِ نو ہم تجھے دل سے
خوش آمدید کہتے ہیں
اے سالِ نو! ہم تجھ سے تمام تر
اچھی امید کرتے ہیں

عروج عباس

pklibrary.com

اے گروپ

اِس ماہ کی سٹار کرن

شرارت

بس کی کھڑکی کے اوپر لگی ایک تختی پر لکھا تھا۔
"خواتین کا احترام کریں۔" دوسری تختی پر درج تھا۔
"خاموشی سے سفر کریں۔"
کسی شرارتی نوجوان نے ان دونوں عبارتوں کے درمیان اور لکھ کر تیسری تختی پر ایک کاغذ چسپاں کر دیا جس پر لکھا تھا کیوں کہ بولنے کا حق صرف خواتین کا ہے۔

دور اندیش

ایک صاحب کو ایک سنسان گلی میں ایک ڈاکو نے روک لیا اور کنپٹی پر پستول رکھ کر بولا۔
"تمہارے پاس جو کچھ ہے نکال دو۔ ورنہ بھیجا نکال باہر کروں گا۔"
"نکال دو" ان صاحب نے لاپروائی سے کہا۔ "آج کے دور میں انسان بھیجے کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے پیسے کے بغیر نہیں۔"

شکریہ

"آپ کے تحفے کا بہت بہت شکریہ۔" زمان صاحب نے توقیر صاحب سے کہا۔
"ارے صاحب چھوڑیے، اتنی معمولی سی چیز کا کیا شکریہ ادا کرنا۔" توقیر صاحب نے انکساری سے بولے۔
"خیال تو میرا بھی یہی تھا لیکن میری بیوی بضد تھی کہ میں اخلاقاً آپ کا شکریہ ادا کروں۔" زمان صاحب نے جواباً کہا۔

فائدہ

لڑکی نے اپنے دفتر کے ساتھی سے کہا۔ "مجھے آج احساس ہوا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط رویہ اختیار کیا تھا۔ جس کی وجہ سے تم مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے درمیان ایک ماہ تک بات چیت بند رہی۔ غلطی میری تھی، میں تم سے معذرت خواہ ہوں، امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔"
"معذرت کی تو خیر کوئی بات نہیں۔" لڑکے نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "مگر اس ایک مہینے میں میرے بینک اکاؤنٹ میں پورے آٹھ ہزار کا اضافہ ہو گیا، اگر ہماری بات چیت تین چار مہینے اور بند رہے تو مجھے امید ہے کہ میں نئی موٹر سائیکل خریدنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

بھول

ایک شخص بکری ذبح کرنے لگا تو بھول گیا کہ کیا پڑھنا ہے ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے چھری چلاتے ہوئے بڑے جوش سے کہا۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"
بکری نے جواباً کہا۔ "آئی لو یو۔"

سوال

"شوہر نے عدالت میں مجسٹریٹ سے شکایت کی "جناب یہ سپاہی ہم میاں بیوی کو بلاوجہ پکڑ کر عدالت میں لے آیا ہے۔ ہم تو گلی میں کھڑے معمولی سی بات پر جھگڑا کر رہے تھے۔"
مجسٹریٹ نے کہا۔ "مگر آپ لوگ گھر کے بجائے گلی میں کیوں جھگڑا کر رہے تھے؟"
"بیوی فوراً بولی تو آپ کا مطلب ہے ہم اپنا سارا فرنیچر توڑ ڈالتے۔"
☆☆

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم بیمار یا میت کے پاس آؤ تو بھلی بات کہو، اس لیے کہ جو تم کہتے ہو، فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔"

قرآن مجید اللہ کا کلام

سائنس دان گیری ملر کا کہنا ہے کہ قرآن کا رویہ تحقیقی رویہ ہے۔ گیری ملر لکھتا ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک چچا تھا۔ ابولہب تھا اس کا نام۔ ابولہب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد قرآن، اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا تھا۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں بھی جاتے پیچھے پیچھے جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو جھٹلاتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے کہ دن ہے تو وہ کہتا نہیں رات ہے۔

قرآن میں ابولہب کا ذکر بھی آیا ہے کہ۔

"وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ دوزخ کی آگ میں جلنا اس کا مقدر ہے۔"

مطلب یہ کہ وہ کبھی اسلام قبول نہیں کرے گا۔

گیری ملر لکھتا ہے، اس آیت کے نزول کے بعد ابولہب دس سال تک زندہ رہا۔ اس کے لیے قرآن کو جھٹلانا بہت آسان تھا۔ وہ مسلمانوں سے کہتا میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مسلمان بنالو۔ جب وہ مسلمان بنالیتے تو کہتا۔

"لو بھئی تمہارا قرآن جھوٹا ثابت ہو گیا۔" لیکن ابولہب نے ایسا نہیں کیا حالانکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کو جھوٹا ثابت کرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائے۔

کچھ باتیں اچھے لوگوں کی

☆ جو گھر حاجت مند کو روٹی کا ایک ٹکڑا اور ضرورت مند کو ایک بستر کی جگہ دینے میں بخل سے کام لے، وہ بربادی کے قابل ہے۔ (خلیل جبران)

☆ میں نے شجر علم کا میوہ توڑ لیا ہے جس پر لکھا ہے۔ کامیابی ان کے لیے ہے جو کوشش کرتے ہیں۔ (ڈسٹرائیلی)

☆ بڑے آدمی زندگی میں کم، کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ (برنارڈشا)

تکبر کا انجام

اللہ تعالیٰ نے ملک الموت سے پوچھا۔

"تجھ کو کسی بندے کی روح قبض کرتے وقت کبھی رحم بھی آیا یا نہیں؟"

ملک الموت نے عرض کیا۔ "اللہ رب العزت! مجھ کو دو ذی روحوں کی جان نکالتے میں کمال دقت ہوئی تھی۔ اگر تیرا حکم نہ ہوتا تو میں ہرگز ہرگز ان کی جان نہ نکالتا۔"

ارشاد ہوا۔ "بتاؤ وہ دو لوگ کون تھے؟"

عرض کیا۔ "ایک تو وہ بچہ تھا جو نیا پیدا ہوا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ جہاز کے ٹوٹے ہوئے تختے پر بے سر و سامانی کی حالت میں بحر بیکراں میں تیرتا جا رہا تھا۔ اس وقت اس بچے کا واحد سہارا تمام کائنات میں اس کی ماں تھی تو مجھے حکم ہوا کہ اس کی ماں کی روح قبض کرلوں۔ اس وقت مجھے اس بچے پر بے حد رحم آیا تھا، کیونکہ اس بچے کی ماں کے سوا کوئی دوسرا خبر گیر نہ تھا اور بھوکا پیاسا بچہ اپنی ماں کے دودھ کے لیے ترس رہا تھا۔

اور باری تعالیٰ! دوسرا ایک بادشاہ تھا جس نے

ایک شہر کمال آرزو سے ایسا بنوایا تھا کہ ویسا شہر دنیا میں کہیں نہیں تھا، جب وہ شہر تیار ہو گیا اور بادشاہ اپنے شہر کو دیکھنے پہنچا تو جس وقت ایک قدم اس کا شہر کے دروازے میں تھا تو مجھے حکم ہوا اور اس کی جان قبض کر لے۔ اس وقت بھی مجھے بہت رونا آیا تھا کہ وہ بادشاہ کیا کچھ حسرتیں اپنے دل میں لے گیا ہوگا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "عزرائیل! تمہیں ایک ہی شخص پر دو بار رحم آیا ہے کیونکہ یہ بادشاہ وہی بچہ شداد تھا جس کو ہم نے بغیر ماں باپ کے، بنا کسی سہارے کے سمندر کی تیز و تند لہروں اور طوفانوں میں بھی محفوظ رکھا اور اس کو حشمت و ثروت کی بلندیوں پر پہنچایا اور جب یہ اس مرتبے کو پہنچا تو ہماری تابع داری سے منہ موڑا اور تکبر کرنے لگا اور آخر کار اپنی سزا کو پہنچا۔"

اہم سبق

ایک عالم اپنے ایک شاگرد کو ساتھ لیے کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔

چلتے چلتے ایک پگڈنڈی پر ایک بوسیدہ جوتا دکھائی دیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کسی بڑے میاں کا ہے۔ قریب کے کسی کھیت کھلیان میں مزدوری سے فارغ ہو کر اسے پہن کر گھر کی راہ لیں گے۔ شاگرد نے جناب شیخ سے کہا۔

"حضور! کیسا رہے گا کہ تھوڑی دل لگی کا سامان کرتے ہیں۔ جوتا ادھر ادھر کر کے خود بھی چھپ جاتے ہیں۔ وہ بزرگوار آ کر جوتا غائب پائیں گے تو ان کا ردعمل دلچسپی کا باعث ہوگا۔"

شیخ کامل نے کہا: بیٹا! اپنے دلوں کی خوشیاں دوسروں کی پریشانیوں سے وابستہ کرنا کسی طور بھی پسندیدہ عمل نہیں۔ بیٹا! تم پر اپنے رب کے احسانات ہیں۔ ایسی قبیح حرکت سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنے رب کی ایک نعمت سے تم اس وقت ایک اور طریقے سے خوشیاں اور سعادتیں سمیٹ سکتے ہو۔ اپنے لیے بھی اور اس بے چارے مزدور کے لیے بھی۔ ایسا کرو کہ جیب سے کچھ نقد سکے نکالو اور دونوں جوتوں میں رکھ دو۔ پھر ہم چھپ کے دیکھیں گے جو ہوگا۔"

بلند بخت شاگرد نے تعمیل کی اور استاد و شاگرد دونوں جھاڑیوں کے پیچھے دبک گئے۔

کام ختم ہوا، بڑے میاں نے آ کر جوتے میں پاؤں رکھا۔ تو سکے پاؤں سے ٹکرائے انہوں نے ہڑبڑاہٹ کے ساتھ جوتا اتارا تو وہ اس میں سے باہر آ گئے۔ ایک عجیب سی سرشاری اور جلدی میں دوسرے جوتے کو پلٹا تو اس میں سے سکے کھنکتے باہر آ گئے۔ اب بڑے میاں آنکھوں کو ملتے ہیں۔ دائیں بائیں نظریں گھماتے ہیں۔ یقین ہو جاتا ہے کہ خواب نہیں تو آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ بڑے میاں سجدے میں گر جاتے ہیں۔ استاد شاگرد دونوں سنتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے کچھ یوں مناجات کر رہے ہیں۔

"میرے مولا! میں تیرا شکر کیسے ادا کروں تو میرا کتنا کریم رب ہے۔ تجھے پتا تھا کہ میری بیوی بیمار ہے بچے بھی بھوکے ہیں۔ مزدوری بھی مندی جا رہی ہے۔ تو نے کیسے میری مدد فرمائی۔ ان پیسوں سے بیمار بیوی کا علاج بھی ہو جائے گا۔ کچھ دنوں کا راشن بھی آ جائے گا۔"

ادھر وہ اسی گریہ وزاری کے ساتھ اپنے رب سے مناجات تھے اور دوسری طرف استاد و شاگرد دونوں کے ملے جلے جذبات تھے اور ان کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ کچھ دیر کے بعد شاگرد نے دست بوسی کرتے ہوئے عرض کیا۔

"استاد محترم! آپ کا آج کا سبق کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ آپ نے مجھے مقصد زندگی اور اصل خوشیاں سمیٹنے کا ڈھنگ بتا دیا ہے۔"

شیخ جی نے موقع مناسب جانتے ہوئے بات بڑھائی۔ "بیٹا! صرف پیسے دینا ہی عطا نہیں بلکہ باوجود قدرت کے کسی کو معاف کرنا بھی ہے۔ مسلمان بھائی بہن کے لیے غائبانہ دعا بھی ہے۔ مسلمان بھائی بہن کی عدم موجودگی میں اس کی عزت کی حفاظت بھی ہے۔"

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

وجیہہ خان ـــــــ کراچی
ہنستے ہنستے رو پڑتی تھی
کتنی پاگل وہ لڑکی تھی
بالکل ویسے پھول کھلے ہیں
جیسے وہ ہنستی رہتی تھی

رابعہ شاہد ـــــــ کراچی
کب حادثوں نے چین سے سونے دیا مجھے
کس رات رنج و یاس کی آندھی چلی نہیں
تاراج کر دیا گیا، فصل بہار کو
موسم کی چار دن بھی گلوں سے بنی نہیں

فائزہ شاہد ـــــــ کراچی
عمر اک خواب سجانے میں گئی
تیری تصویر بنانے میں گئی
اک شعلہ سا کبھی لپکا تھا
زندگی آگ بجھانے میں گئی

فاکہہ آبل ـــــــ کراچی
جب محبت کا جنوں تھا وہ زمانہ اور تھا
اب انا کا مسئلہ ہے خود وہ چل کر آئے گا

ادم کمال ـــــــ فیصل آباد
خوشبو کا روپ راکھ کی صورت بکھر گیا
اک پھول جیسے خواب کے جلنے کی دیر تھی
سارے کا سارا شہر ہی انجان ہو گیا
اک شخص کے نگاہ بدلنے کی دیر تھی

صدف خان ـــــــ پشاور
ہر طرف پھیلی تھی اس کی یاد جنگل کی طرح
میں گزر کر آ گیا ہوں اڑتے بادل کی طرح

ہما ندیم ـــــــ گوجرہ
کسی فریب میں تیرے کبھی نہ آؤں گی
میرا یہ فیصلہ ہے اب لکیر پتھر پہ

نادیہ یاسر ـــــــ گوجر خان
وہ درد ہی درد نہ رہا ورنہ اے متاع حیات
مجھے گمان بھی نہ تھا، میں تجھے بھلا دوں گا
ابھی تو رات ہے کچھ دیر سو ہی لے ناصر
کوئی بلائے گا تو میں تجھے جگا دوں گا

آسیہ حفیظ ـــــــ حیدر آباد
ہاں چلو جھوٹ سہی وعدے وفا ہو جاتے
یوں بچھڑتے کہ مرے لب پہ دعا ہو جاتے

عائشہ، تحریم ـــــــ محراب پور
یاد رکھنا بھی اک عذاب ہوا
بھول جانے کا حوصلہ بھی نہیں
اک دن وہ مجھے بلائے گا
کیا یقین ہے کہ ٹوٹتا بھی نہیں

نمرہ غاقب ـــــــ گرین سٹی
نہیں تم سے کوئی شکوہ مگر اک التجا ہے
جو بنا رہے ہو حالت، کبھی آ کے دیکھ لینا

ندا یوسف ـــــــ ملتان
پہلے تو میری موت پہ اک جشن سا ہوا
پھر اس کے بعد مدتوں رویا گیا مجھے

اقرا انس ـــــــ راولپنڈی
جدا کر کے اسے خود سے میں گھر آ کر بہت رویا
جہاں جلتے تھے ہم دونوں وہاں جا کر بہت رویا
میں پہلے اس کا رونا سوچ کر ہنستا رہا پھر دل
میں پھر اس کی ہنسی کو ذہن میں لا کر بہت رویا

روحینہ خان ـــــــ کراچی
بات کھلنے پہ وہ لے بیٹھا پرانی رنجشیں
ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے خفا پہلے سے تھا

pklibrary.com

نی خاموشی اور پھر آدھی رات کو بہنی عزت خطرے میں ڈال دینا۔ ہاجرہ ریحان بہت اچھا لکھتی ہیں، اس دفعہ نظر بٹو لکھ دیا (ایڈٹ مت کیجیے گا۔ تعریف کے ساتھ تنقید بھی پہنچنی چاہیے) قرینہ زندگی...... اچھی تحریر تھی۔

مٹھی بھر محبت، کمال کردیا امیراشفیع نے...... پہلے تو مجھے لگا کہ مینو کے والد ہی بی جی کے شوہر ہوں گے روایتی اتفاقات سے بھری ڈرامائی کہانی کی طرح لیکن ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا۔ اور زہور نے زندگی جیسی نعمت کو رولنے کے بجائے احتشام کا ہاتھ تھام لیا۔ ویری ویری ویل ڈن حمیرا...... اچھی راہ دکھائی آپ نے۔ حقیقت بھی اور بہترین لکھی۔ مسافت...... ٹاپ آف دی لسٹ، کمال، بہترین، اعلا، مدتوں یاد رہ جانے والی تحریر شاباش سعیدہ عمیر۔

پیاری عارفہ آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ آپ اچھی تنقید نگار بھی ہیں۔ لیکن ہاجرہ ریحان کے افسانے میں ہیروئن نے خاموشی اختیار کی تھی خوشی کا اظہار نہیں تھا۔ کبھی کوئی عزت دار آدمی حالات کی مجبوری کی بنا پر کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے تو اس پر خاموشی ہی اختیار کی جاتی ہے۔ شرمندہ نہیں کیا جاتا۔ بہت شکریہ۔

ریحانہ چوہدری مدو کے (اندھیر) سے لکھتی ہیں
شکر ہے کہ شمارہ 2 دسمبر کو ہی مل گیا۔ سرورق ہے تو بہترین آنکھوں کو بہت بھلا لگا۔ 25 دسمبر کی ہماری زندگی میں ایک شناخت تو قائداعظم کی برسی کی حیثیت سے ہے اور دوسری شناخت ہماری شادی کی اینورسری کی ہے اور حیرے کی بات بتاؤں کہ 2 ستمبر ہماری سالگرہ اور میری بھانجی رضوانہ ریاض جو SGS سمبڑیال میں پڑھاتی ہے۔ اس کی بھی سالگرہ 2 ستمبر کو اور اس کی بھی شادی 25 دسمبر کو ہوئی ہے۔ یعنی دونوں کی دونوں اینورسریز اکٹھی ہوتی ہیں۔

سبحان اللہ پیارے نبی کی پیاری باتیں کیا ہی ایمان افروز احادیث کا اعادہ کروادیا آپ نے، جزاک اللہ خیر۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا میں دو بہنوں نے اپنی اپنی داستاں سنائی دو مختلف تجربات کو پڑھ کر زیادہ مزہ آتا ہے۔

فرح نادر کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے انہوں نے اپنی زندگی کے بہت سے سچ ہمارے ساتھ شیئر کیے۔

آپ کے خطوط کی محفل تو ہمیشہ سے لاجواب رہی ہے۔ مہینے میں جانے کتنی مرتبہ ان کو پڑھتی ہوں۔ سونیا

رضیہ جمیل

خواتین آپ

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

عارفہ فضل شاہ...... گاؤں حمید سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے
دسمبر کا شمارہ ملا تو دل خوش ہوگیا...... وجہ افسانوں کی طویل فہرست...... سلسلے سب کے سب بہترین تھے۔ یا حیرت اس دفعہ تو اس ماہ کی مسکراہٹیں بھی واقعی مسکرانے کا سبب بن گئیں ورنہ وہی گھسے پٹے پرانے لطیفے ہوتے تھے۔ تاریخ کے جھروکے دلچسپ تھے پسند آئے۔ سلسلوں کے بعد افسانے پڑھے...... بابل کا آنگن...... بہترین تحریر اور اچھا سبق۔

چپ...... انتہائی سبق آموز، دکھاوا...... بہت اچھا سبق دیتی تحریر......

بند کواڑوں سے آگے...... لڑکی کی بے وقوفی پہ انتہائی کوفت ہوئی۔ یہ ذرا سی ہمدردی اور بات کر لینے کو محبت سمجھنے والی احمق مخلوق۔

الس او کے، شاباش ہانیہ بہترین فیصلہ کیا...... جسے عزت نفس کا خیال نہیں، اس کے ساتھ زندگی ضائع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صورت گر خوابوں کے...... مزہ نہیں آیا۔ ہیرو کی حرام کمائی چوری پہ خوشی۔ ہیروئن صاحبہ

ربانی، اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)

سچ کہوں تو "والعصر" امت العزیز شہزاد کا ناول ہے تو بہترین مگر اس کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھی ہوں۔ کرداروں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا اور سمجھنا مشکل لگتا ہے۔

"بابل کا آنگن" قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ بہترین تھا۔

لبنیٰ آصف نے "دکھاوا" میں ثمرہ اور اس کی ماں ذکیہ کی کیفیت کو سمجھے بنا ہی اسے برا سمجھنے لگتی ہیں مگر شکر ہے کہ زرینہ نے آگاہی کے در وا کر دیے۔ حمیرا اشفیع کا "مٹھی بھر محبت" ایک اصلاحی تحریر تھی۔ ریحانہ وقاص کا چپ معاشرتی ناہمواریوں کا آئینہ تھا۔

عروج راؤ، "اٹس اوکے" کی ہانیہ نے بالکل درست فیصلہ کیا۔ عزت نہیں تو کچھ نہیں۔

تمام افسانے ہی بہترین تھے۔ جیسے افسانے بہترین تھے ویسے ہی تمام اشعار بھی پڑھ کے بہت اچھا محسوس ہوا۔ بہت ہی اچھا انتخاب تھا۔

اجل صاحبہ سے ایک بات پوچھنا تھی کہ تاریخ کے اوراق کے لیے کیا کچھ تاریخی حقائق لکھ کر آپ کو بھجوا سکتی ہوں۔

پیاری ریحانہ! آپ کی محبتوں کے لیے ممنون ہیں۔ آپ نے بہت اچھا خط لکھا۔ سرما کی رات میں چار بجے اتنا اچھا خط لکھنا واقعی کمال بات ہے، افسوس کہ صفحات کی مجبوری کی وجہ سے آپ کا پورا خط شائع نہ کر سکے۔ تاریخ کے جھروکے اس سلسلے کے لیے آپ تاریخی حقائق بھجوا سکتی ہیں۔ ہماری کسی اور قاری بہن کو تاریخ سے دلچسپی ہو تو وہ بھی بھجوا سکتی ہیں۔

شادی کی سالگرہ کی مبارک باد۔ ہماری دعا ہے کہ آپ تا زندگی یہ سالگرہ اپنے ہم سفر کے ہمراہ مناتی رہیں آمین۔

جویریہ مریم کی کہانی میں ہیں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ والی بات نہیں تھی۔ یہ کہانی ان لڑکیوں پر تھی جو ذرا سی لڑکوں کی توجہ دینے پر خود ہی خواب دیکھنے لگتی ہیں۔

مناہل اقبال حیدر آباد سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے سرورق پر موجود پیاری سی گم صم اپنے خیالوں میں کھوئی ماڈل بہت پیاری لگی۔ سرورق کا جائزہ لینے کے بعد شہر شام بجر پڑھا لگ رہا ہے، جلد ہی ہم پرانی وسیلہ سے ملنے والے ہیں۔ اس کو اتنا ٹریجڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی وسیلہ کی طرف سے دل کو سکون ملا تھا کہ آپ اختر بانو کو لے آئیں سیانے صحیح کہتے ہیں کہ بیٹی سے ڈر نہیں لگتا اس کے نصیبوں سے لگتا ہے۔ اکلوتا ناولٹ مٹھی بھر محبت اچھا لگا۔ زبور نے بالکل درست فیصلہ کیا۔

ج: پیاری مناہل! زندگی کی طرح ناولوں میں بھی اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ کچھ کردار نکل جاتے ہیں، کچھ نئے کردار شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح ناول آگے چلتا ہے۔ "ناولوں کی کہانیاں زندگی سے ہی اخذ کی جاتی ہیں جب زندگی ہمیشہ ہموار راستوں پر نہیں چلتی تو ناول کیسے چل سکتا ہے۔ نگہت کے ناول میں اسی لیے اختر بانو کو آئی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ

فہمیدہ جاوید نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

روبینہ بہت اچھی اور منفرد طبیعت کی مالک ہے یہی تم لوگوں کے ادارے کی کامیابی ہے کہ اصل چیز اخلاق ہوتا ہے جو اپنا بنا لیتا ہے۔ ام طیفور کے شوہر کا روبینہ نے بتایا، بہت افسوس ہوا۔ اللہ ام طیفور کو صبر دے اور آسانیاں کرے۔ شعاع میں آخری خط مارچ 2021 میں دیا تھا تب سے طویل وقفہ آ گیا جواب ٹوٹا جب تم نے میری پسندیدہ ترین رائٹر نگہت سیما کا ناول شروع کیا تو سوچا کہ لازمی خط لکھوں۔ کاش یہ طویل ترین ہو۔ اب خواتین میں نگہت کا طویل سا انٹرویو پڑھنے کو ملے گا کہ ہمارا بھی تو تینوں ڈائجسٹوں پر کوئی حق ہے اور میری خواہش کا بھی پاس رکھا جائے۔ خواتین میں بھی پلیز لازمی نگہت کا کوئی قسط وار شروع کریں۔ ایک ساتھ تین کہانیاں جو چل رہی ہیں بہت ہی مزا آ رہا ہے اور نگہت کی یہ خوبی ہے کہ ماضی اور حال کو اتنی عرق ریزی سے لے کر چلتی ہیں کہ بالکل بوریت نہیں لگتی، وہیں کہانی میں غضب کی روانی ہوتی ہے۔ خواتین کے گولڈن جوبلی نمبر دو میں پس آئینہ کتنا کمال کا ناول تھا۔ جس میں نگہت کی روانی پر میں حیران رہ گئی۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ خواتین میں انٹرویوز میں کتنی سینئر رائٹرز رہتی ہیں۔ ابھی انٹرویو کے لیے مگر آج کل بس نئی لکھنے والیوں سے ہی شاہین ملاقات کروا رہی ہیں۔ نگہت سیما، رفعت سراج، ناہید چوہدری،

نئی غزل، افشاں آفریدی، سعدیہ عزیز آفریدی، آسیہ مرزا، رفعت ناہید سجاد اور دوسری کتنی ہیں جو ابھی باقی رہتی ہیں، ان کے بھی انٹرویو لازمی لگائیں، شعاع وخواتین سے اتنی وابستگی تھی مگر جب ہر بار ایک ہی چیز ملتی ہے اور اپنی پسند کے مطابق کچھ نہیں ملتا، انسان تبدیلی کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ مگر دل تو شعاع وخواتین میں ہی اٹکا ہوتا ہے کہ یہ ہی ابتدا تھے میری۔ خواتین کا معیار اور بات الگ ہے تو یہ کچھ گلے تھے میرے اور شکریہ۔

ج: فہمیدہ! کمال کردیا آپ نے۔ بھلا اتنے پرانے ناتے اتنی ذرا سی بات پر تھوڑی توڑے جاتے ہیں۔ آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر، ہم پرانی رائٹرز سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں لیکن بہت سی رائٹرز انٹرویو نہیں دینا چاہتیں تو ہم انہیں مجبور تو نہیں کرسکتے۔ خواتین ڈائجسٹ میں نگہت کے ناول کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔ ان کا انٹرویو بھی جلد لیں گے۔ آپ نے خط لکھا بے حد خوشی ہوئی۔ ہمیں اپنی پرانی رائٹر بھی عزیز ہیں اور پرانی قارئین بھی اور آپ تو باقاعدہ قاری تھیں اور ہر ماہ ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے سے بھی آگاہ کرتی تھیں۔ اب رابطہ رکھیے گا۔

عذرا آصف نے لاہور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں
دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں سب کو عذرا آصف کی طرف سے سلام پہنچے۔

اور رب طارق عزیز کے درجات بلند فرمائے دسمبر کے حساب سے ٹائٹل کچھ ہضم نہ ہوا۔ مطلب پسند نہیں آیا۔ مگر ماڈل تھی پیاری "پہلی شعاع" قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ...... واقعی، ان کا احسان عظیم، رب کے بعد...... اور تمام اکابرین جنہوں نے ان تھک محنت کی اور بے حساب قربانیاں دیں۔ میرا اللہ سب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور حکمرانوں کو ہدایت دے۔ سب بولو آمین......

حمد ونعت...... رب اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث گواہی دیتے الفاظ پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ عظیم ترین ہستی کے قیمتی ترین الفاظ۔

"یار یہ آج کل "ناتا جوڑا" کچھ بور بور سا ہو گیا ہے؟ نہیں؟" "دستک" اللہ فرح نادر کو صحت والی زندگی دے۔ "خط آپ کے" سب سے پہلے اپنا نام دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ تھینک یو۔ سب قارئین کے تبصرے بہترین تھے۔ کافی نام غیر حاضر تھے۔ والعصر کہانی کچھ تو چلی۔ شکر ہے...... "بابل کا آنگن" بھئی کہیں ساس نندیں حاوی ہیں تو کہیں بھابھیاں۔ "مٹھی بھر محبت" کچھ خاص نہیں لگا۔ زبور کا فیصلہ اچھا لگا۔ "چپ" بھئی یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ وہ جہاں تک بس چلتا ہے اپنا بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے کتنے ہی خسارے اٹھانے پڑیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسی بہت ساری کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ "مسافت" سنیعہ عمیر نے بہت سے انسانوں کی فطرت عیاں کی۔ "بند کواڑوں سے آگے" یار یہ لڑکیاں کب سمجھ دار ہوں گی؟ دھو میتوں۔ "ماہ الملوک" بھئی اختر بانو کے حالات نے تو واقعی رلا ڈالا ہمیں۔ بہترین قسط تھی۔ "انس اوکے" بھئی یہ ہیروئن نے دوسرے افسانے والی ہیروئنوں کی نقل ماری ہے نا؟ ہانیہ کا فیصلہ...... زبور کا فیصلہ...... وانیا کا فیصلہ...... ثنا کا فیصلہ...... سارے ملتے جلتے فیصلے...... اپنی خودداری کو قائم رکھنے کے فیصلے۔ "شام ہجر" فرح جی نے سفید محل کی سیر بارش میں کروا کے کہانی کا مزہ دوبالا کردیا ہے۔ تانیہ کے ساتھ دیکھو، اب کیا ہونے والا ہے۔ "قرینہ زندگی" ہمارے معاشرے کے پچانوے فیصد "میاؤں" ایسے ہی ہیں اور محبت بھی ایسے ہی چھپا چھپا کے رکھتے ہیں...... ہیں نا؟ "نظمیں غزلیں میں" افتخار عارف کے الفاظ ٹھا کر کے دل وروح پر لگے۔ "اس ماہ کی مسکراہٹیں" تسلی کے علاوہ سب نے ہی مزہ دیا۔ "باتوں سے خوشبو آئے" بہترین تھا۔ "تاریخ کے جھروکوں" سے اصل آپی نے ایک مرتبہ پھر بہت سی آگہی عطا کی۔ "موسم کے پکوان اور خوب صورت بنیے" بہترین تھا۔ "رضیہ آپی یکم جنوری کو میری پیاری بیٹی آسیہ سیف کی برتھ ڈے ہے اور چار جنوری کو میرے پیارے بیٹے ابوذر سیف کی تو دونوں کو آپ نے بہت وش کرنا ہے۔

میرے افسانے اگر قابل اشاعت ہوئے تو وہ بھی بتانا ہے۔ نہیں ہیں تو بھی بتانا ہے۔ میرے بچوں کے سیکنڈ ٹرم کے پیپر ہو رہے ہیں اور مجھے لگتا ہے جیسے میرے پیپر ہو رہے ہیں۔ اللہ پاک تمام بچوں کو کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کرے۔ آمین۔ ایک فرمائش...... نازیہ رزاق سے پلیز کچھ لکھوائیں۔ مجھے ان کی تحریر کا بہت انتظار رہتا ہے فرزانہ کھرل کی طرح ان کے الفاظ بھی باندھ دیتے ہیں

pklibrary.com

جیسے بندے کو۔

پیاری عذرا! آپ سے کس نے کہا کہ لڑکیاں سمجھ دار نہیں ہیں۔ سب لڑکیاں سمجھ دار ہوتی ہیں بس بشر ہونے کے ناتے کبھی کبھی غلطیاں کر بیٹھتی ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ بقول آپ کے سب لڑکیوں نے ملتے جلتے فیصلے کیے اپنی خودداری کو قائم رکھنے کے فیصلے۔

ہیہ اور سیف کو مبارک باد اور دعائیں۔ آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں۔

مہتے علی خان خانیوال سے شریک محفل ہیں

شعاع کی ۲۲ سال سے قاری ہوں اور 22 سالوں میں شاید ہی کوئی شمارہ چھوڑا ہو حالات کیسے بھی رہے ہوں شعاع کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا، تمام سلسلے اور کہانیاں بہت پسند ہیں، آپ سے ایک شکایت ہے وہ یہ کہ اپیا اب آپ لوگ مستقل ناولز کے ساتھ پچھلی اقساط کا خلاصہ نہیں دیتے۔ مجھے اقساط کا خلاصہ پڑھنا ہے پلیز اپیا۔ محترم اپیا ایک چھوٹی سی گزارش اور بھی ہے وہ یہ کہ 28 جنوری کو میری دوست عائشہ خان کی برتھ ڈے ہے تو مبارک باد پہنچا دیں۔

عزیز بہن! اتنی پرانی قاری ہیں بائیس سال سے شعاع پڑھ رہی ہیں اور ہمیں بائیس خط بھی نہیں لکھے اب رابطہ رکھیے گا۔ ہر ماہ نہ سہی لیکن اتنا لمبا وقفہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کی دوست عائشہ خان کو ان کی سالگرہ کی مبارک باد پہنچا رہے ہیں۔

خلاصہ ہم ہر سلسلہ وار کہانی کے ساتھ دیتے ہیں۔ مزید خیال رکھیں گے۔

کائنات لیاقت لکھتی ہیں

دھانی رنگ میں ملبوس کپڑوں میں پیاری سی مسکراہٹ لیے اتنی پیاری ماڈل، اپنا پسندیدہ رسالہ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا (یچی) وہیں (شاپ پر) پر کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اپنا خط نہ پا کر دل شدید دکھا، ہمارا پہلا خط تھا۔ فروری میں ہماری شادی ہے سب دعا کیجیے گا۔ افسانوں میں بابل کا آنگن نمبر ون پر رہا، قرۃ العین ہاشمی نے بالکل ٹھیک کہا۔ دوسرا نمبر دکھاوا اپنی بیٹی کو دیں جو دینا ہے دوسروں کو کیوں ذلیل کر رہے ہیں۔ "والعصر" اتنی مشکل کہانی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی، آگے کا پڑھتا ہے۔ پیچھے سے بھول جاتے ہیں ایک تو بہاری زبان اوپر سے الفاظ کا اتنا مشکل چناؤ کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ فرح بخاری کا ناول "شہر شام ہجر" ایسا لگ رہا ہے جیسے کہانی ختم ہونے والی ہے۔ "ماہ الملوک" موسٹ فیورٹ اتنی سادہ زبان صاف الفاظ زبردست پلاٹ، سائرہ رضا کے بعد یہ پہلی رائٹر ہے، جو سیدھا دل میں اتر گئی (کہانی سمیت) "مسافت" شکر ہے دانیا نے ہارون کو کافی پر بلا لیا۔ ادارہ سے ایک فرمائش ہے جی سب کا انٹرویو لینے والی ہماری شاہین آپا کا کوئی انٹرویو لے لیں۔ پلیز پلیز (تُسی جی خواہش ساڈی بجاں) موسم کے پکوان سارے ہی زبردست ہوتے ہیں ہمیں تو اپیزا بنانے کا طریقہ سکھا دیں۔ تو اپیزا اور توے کے اوپر بننے والا نان کی ریسپیز دیں۔ ہم نے دو کہانیاں بھیجی تھیں۔ ان کا بتا دیں۔

پیاری کائنات! شادی کی دلی مبارک باد ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ زندگی کا یہ موڑ آپ کے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے۔ (آمین)

آپ کا پچھلا خط ہمیں ملا نہیں ورنہ ضرور شائع کرتے۔ آپ کی پیزا کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ ضرور دیں گے۔ شاہین رشید کا انٹرویو ہم بھی کرنا چاہتے ہیں اگر وہ دیں۔ والعصر کی کہانی کے بارے میں آپ کی شکایت امت العزیز تک پہنچا رہے ہیں۔

زینب ظفر نے ڈی آئی خان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں زینب ظفر ہوں ڈی آئی خان سے پچھلے سال جنوری میں میرا افسانہ "لمحہ" چھپا تھا۔ "پچھلے" اس لیے کہا کہ یہ خط آپ تک پہنچتے پہنچتے 24 کا جنوری سر پہ ہوگا۔ کیا خبر آپ تک پہنچتا بھی ہے یا راستے میں گردش زمانہ کے ہاتھوں نامعلوم انجام کو پہنچتا ہے۔

میرا ناول "اہل وفا" افسانہ "کہانی سنو گے؟" آپ کو ملے؟ اگر کچھ وٹس ایپ کریں تو کہا جاتا ہے۔ محترمہ یہاں پہلے ہی بہت رش ہے بذریعہ ڈاک بھیجیے۔"

اور ڈاک پہ ہم جیسوں کو کتنی خواری ہوتی ہے، وہ آپ جیسے کبھی نہیں جان سکتے۔ یہ خواری پھر بھی گوارہ تھی مگر آخر میں شنوائی پھر بھی نہیں ہوتی اور بھیجا ہوا مواد کہیں وقت کے کسی تاریک خلا، یا اندھے کنوئیں کی غذا ہو جاتا ہے۔ اور بھائیوں کے نخروں پہ تو الگ سے کوئی کتاب لکھنی پڑے گی۔

pklibrary.com

ج: پیاری زینب! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ اپنی تحریریں ڈاک سے ہی بھجوائیں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ای میل سے ہمیں اتنی تحریریں موصول ہوتی ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے کمپیوٹر کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔
افسانے مل گئے ہیں۔ آپ میں صلاحیت ہے، بہت اچھا لکھ سکتی ہوں آپ کے دونوں افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔

صدف ناصر گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

2023ء کا آخری شمارہ بہت ہی معصوم سی ماڈل لیے ہوئے ملا۔ اچھا لگا۔ ہمیشہ ہی دسمبر کی "پہلی شعاع" بے حد اداس کر دیتی ہے۔ بچھڑے دوست، گزرا وقت، طویل راتیں، سنہری یادیں۔ آہ! کیا کیا یاد دلا دیا۔
"پیارے نبی کی پیاری باتیں" ہماری اصلاح کے لیے ہمہ وقت تازہ دم۔ اس ماہ سب ہی ٹاپک بہترین۔
"تانا جوڑا" نے بہت کچھ سکھایا۔ صبر، شکر، خود آگہی اور اصلاح۔ تینوں بہنوں نے اچھا لکھا۔
"خط آپ کے" شعاع کا رونق بھرا سلسلہ ناہید اسماعیل لمبی غیر حاضر ہو گئی ہیں۔ رمشا روشن بھی معروف۔ باقی ہر تبصرہ لاجواب اور بھرپور۔
"شہر شام ہجر" کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ کہیں رکتا نہیں ہے نہ بور کرتا ہے۔ "شہناز بی بی" اور "ارحم" کے انجام کا شدت سے انتظار ہے۔ سمیعہ عمیر کی مسافت نے سوچ کے کئی در وا کر دیے۔
تحریر بے حد جان دار اور نئے پلاٹ پر مدتوں یاد رکھی جانے والی ہے۔
"ماہ الملوک" میں گاؤں اور حویلی کا ماحول بے حد بھاتا ہے۔ وہ زمانے جو میٹھے اور سچے تھے۔
"مٹھی بھر محبت" حمیرا شفیع کی زبردست سی تحریر۔ افسانوں کے بعد حمیرا نے ناولٹ پر بھی گرفت جمالی۔ ویری گڈ! اس تحریر کی "زیور" اچھی لگی۔
"افسانے تو کیا کہنے!" "دکھاوا" نے دل اداس کر دیا۔ بڑھا چڑھا کر پیش کرنا، جی بھر کر شیخیاں بگھارنا اور رہی سہی کسر سوشل میڈیا نے پوری کر دی۔ بات بعد میں ہوتی ہے تصویر پہلے اپ لوڈ کر کے دکھاوا کیا جاتا ہے۔
"بابل کا گھر" قرۃ العین خرم نے بہترین طریقے سے ان ماں، بیٹیوں کو راہ ہدایت دکھائی جو بابل کے گھروں کا صفایا کر جاتی ہیں، اپنی بے جا فرمائشات سے۔
"چپ" لکھ کر ریحانہ وقاص نے اپنے پچھلے افسانوں کا ریکارڈ توڑ ڈالا۔ بے حد گہرائی لیے ہوئے شاندار تحریر۔ غلط کرتے ہیں ایسے مرد جو گھر میں تو آگ کا گولہ بنے پھرتے ہیں مگر باہر ان کی زبان شہد ٹپکاتی ہے تو اس صورت میں انجام ٹھیک ہوا محترم کا۔
"اٹس او کے" سو سوری۔ "بند کواڑوں سے آگے" اس سے بڑھ کر کیا تذلیل ہوئی کہ "شہرام یزدانی" نے ثنا بی بی کو صدقے اور زکوٰۃ خیرات پر رکھا۔ اور وہ خود کو محلوں کی رانی سمجھ بیٹھی۔
"صورت گر خوابوں کے" دلچسپ اور اچھی تحریر۔
"قرینہ زندگی" میں بے چاری صبا تناسب کر کے بھی خوشی اور سکون نہ حاصل کر پائی۔ اور آل بارہ تحریروں میں سے ساڑھے گیارہ تحریریں بے حد اچھی اور نئے ٹاپکس پر مبنی ہیں۔ (ہاہاہا) زبردست بھئی!
مستقل سلسلوں کی بات کریں تو "نظمیں غزلیں" میں افتخار عارف اور عینا عبدل نے دل خوش کر ڈالا۔ "مسکراہٹیں"
استانی جی کے جوابی خط نے ہنسا ہنسا کر ہم سب کو دوہرا کیا۔
"باتوں سے خوشبو" کے لیے تعریف کے الفاظ ہی کم پڑ جاتے ہیں۔ کہاں سوشل میڈیا کا دور اور کہاں یہ شاندار سلسلہ!
"کھلتا کسی پہ" صفیہ نے حیدرآباد سے دل اداس کیا۔ کہتی ہیں۔

آنگن میں کچھ خواب پڑے ہیں
ویسے یہ گھر خالی ہے!

ج: پیاری صدف! ہمیشہ کی طرح تبصرہ جامع، مکمل اور جان دار ہے۔ بہت شکریہ۔ آپ نہ صرف تبصرہ بہت اچھا کرتی ہیں بلکہ آپ کی رائٹنگ بھی بہت صاف ستھری موتیوں جیسی ہے۔ بہت شکریہ۔

نرگس مسکان...... گولارچی بدین سے شرکت کر رہی ہیں
سب سے پہلے پہلی شعاع پڑھا لیکن آخری کی دو لائنز

pklibrary.com

میں غلطی ہوئی۔ قائداعظم تو 25 دسمبر کو پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد سارے رسالے کا جائزہ لیا پھر سیدھا پہنچے اپنے فیورٹ ناول "شام شہر ہجر" فرح آپی ہر قسط اتنی حیران کن لکھتی ہیں۔ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ آگے کیا ہوگا۔ امیزنگ سپر ماہ الملوک بہت اچھا جا رہا ہے۔ نزل کی پھپھو کے لیے بہت دکھ ہوا۔

سنیعہ عمیر آپی نے مسافت بہت اچھا لکھا۔ ویل ڈن آپی پھر "مٹھی بھر محبت" حمیرا شفیع کا ناولٹ اب بھلا کوئی پوچھے زلدو بی بی سے کہ جب ان کی اماں (پھپھو) نے خبردار کیا تھا پھر کیا ضرورت تھی اتنا آگے جانے کی۔

ناول "والعصر" میں تو اتنا بڑا دھماکہ کہ دریٹی بھاگ گئی۔ اب آگے اللہ جانے۔ اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ افسانوں میں سب اچھے تھے لیکن "چپ" ریحانہ وقاص کا بازی لے گیا بہت اچھا لکھا۔ "بابل کا آنگن" قرۃ العین آپی کا بہت اچھا تھا۔ "دکھاوا" لبنیٰ آصف نے بہت اچھا لکھا۔

بہت خوب جویریہ مریم کا "بند کواڑوں سے آگے" بالکل ٹھیک لکھا۔ انس او کے عروج راؤ نے خوب لکھا۔ سیلف ریسپکٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ "صورت گر خوابوں کے" ہاجرہ ریحان نے اچھا لکھا اس کے بعد "قرینہ زندگی" "شاہین قمر نے بالکل درست لکھا۔

"جب تجھ سے ناتا" اچھا لگا۔ ورنہ کبھی کبھار تو اتنا دکھی ہوتا ہے۔

اس ماہ کی مسکراہٹیں سب اچھی لگیں۔ بزنس مائنڈ اور استانی جی کا جوابی خط خوب لطف آیا۔

ج: پیاری نرگس! اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ ایک جیسی رائٹنگ، پینسل سے لکھا خط اور گولارچی سے صرف آپ ہی لکھتی ہیں۔ بہت شکریہ آپ نے ہمیں اپنی قیمتی رائے سے نوازا۔ تبصرہ بہت اچھا ہے۔

عدینہ لغاری جمپو سے شریک محفل میں، لکھا ہے

پہلی شعاع پڑھ کر یوں لگا جیسے اپنے دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں۔ شاہ سائیں کی "حمد" یہ سندھی ہے اردو میں اچھی لگی نعت بھی اچھی ہیں۔ ناتے پڑھے آگے بڑھے کاظم پاشا ہی ملاقات اچھی رہی بہت دنوں پیچھے باادب با ملاحظہ کی دستک ہوتی رہی ہم بچپن میں یہ ڈرامہ دیکھا کرتے تھے، شاہین آپا نے اس کا ذکر نہیں کیا؟ نومبر کے شمارے میں شرکت کر نہ سکی رسالہ بہت لیٹ ملا تھا "خط آپ کے" پیارا سلسلہ۔ زرینہ جی نے چھوٹی بہن سمجھا۔ خوشی ہوئی "زرینہ جی مجھے بھی آپ بہن ہی سمجھیں ہم دونوں کی کاسٹ بھی ایک ہی ہے۔" یہ کاسٹ سندھی میں زیادہ ہے۔ سائرہ رضا کا ناول مزاح سے بھرپور تھا۔ رزق وبال مبارک باد۔ نعیمہ ناز جی شان دار ناول تھا۔ فلسطینی بچے کی لوری ہم تو رو پڑے۔ اب واپس آتے ہیں اس شمارے کی طرف خطوط میں ریحانہ وقاص کا خط پڑھ کر دکھ ہوا۔ ایسے اناڑی ڈاکٹروں کی یہاں بھرمار ہے یہاں کے غریب لوگ ان ہی سے دوا لیتے ہیں، بڑے ڈاکٹروں تک ان کی پہنچ نہیں ہے اب جئیں یا مریں ان کی قسمت رضوانہ جی یہ رسی والا جھولا نہیں ہے یہ چار ٹانگوں والا لکڑی کا بنا جھولا سمجھیں۔ فرح تسی گریٹ، سعدیہ عمیر بہت عمدہ لکھا سونیا لبنیٰ آصف اور ریحانہ وقاص تینوں اے ون کی دوڑ میں ہیں۔ حمیرا شفیع نام ہی کافی ہے باقی سارے سلسلے اچھے تھے

ج: پیاری عدینہ! تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ کرسکے۔ اس ماہ شامل ہے۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

فرح بخاری کا جاذب نظر ناول شام شہر ہجر اس بار بھی بلند سطح پر رہا، کہانی پرکشش ہوتی جارہی ہے۔ نگہت سیما کا ماہ الملوک بھی اچھا لگ رہا ہے ویسے ماہ الملوک کے معنی کیا ہیں۔ اور پیاری حمیرا شفیع کی مٹھی بھر محبت کا جواب نہیں۔ افسانوں میں بند کواڑوں سے آگے بہترین اسٹوری تھی۔ بالکل درست بات ہے کہ بند کواڑوں کے آگے جو دنیا ہے، اس کے دام بہت اونچے ہیں۔ بہت زبردست جملہ ہے۔

ریحانہ وقاص کی چپ بھی دل دکھا گئی۔ لیکن تحریر اچھی رہی۔ اور دکھاوا مختصر سی کہانی بھی ٹھیک ہی رہی لبنیٰ آصف نے سبق آموز انداز اپنایا۔

بابل کا آنگن کے کیا کہنے بھئی یہ تو تقریباً گھر گھر کی کہانی ہے، قرۃ العین خرم ہاشمی آپ نے تو سو فیصد درست لکھا اینڈ بھی اچھا کر دیا۔ شاہین قمر کی قرینہ زندگی اور ہاجرہ ریحان کا صورت گر خوابوں کے بھی اچھے لگے۔ باتوں سے خوشبو آئے اور پیارے نبی کی پیاری باتیں تو

شعاع کا سب سے زیادہ پیارا سلسلہ ہے۔

ج: پیاری بہن! ہر ماہ آپ کا نام پرچے میں شامل ہوتا ہے۔ آپ ہماری باقاعدہ قاری ہیں۔ بڑی توجہ سے پرچا پڑھتی ہیں۔ ہمیں آپ لوگوں کے خطوں سے رہنمائی ملتی ہے تو انسیت ہونا تو لازمی ہے، ہم آپ کو پیاری بہن صرف لکھتے ہی نہیں سمجھتے بھی ہیں آپ ہمیں سچ مچ بہنوں جیسی لگتی ہیں۔

ماء السلوک ایسا پانی ہے، جس میں ہر چیز حل ہو جاتی ہے۔ اسے پانیوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے اسے سونا پگھلانے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

انیسہ عائش نے کوٹ رادھا کشن قصور سے لکھا ہے

عذرا جی کے دو دن میں پرچا پڑھنے پر ہمیں بالکل حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ ہم تو ہر بار ہی دو تین دن میں پورا پرچا پڑھ ڈالتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایک رات ہی کافی ہوتی ہے۔ ایچ ایس بی کے خط پر پہنچے تو ہمیں اپنا وقت یاد آ گیا جب ہم نے اپنے نام کے ساتھ عائش جوڑا۔ گھر والے پوچھتے یہ کیا نام ہوا بھئی۔ اور دوستوں، ساتھیوں نے تو چھیڑ ہی بنا لی۔ عائش صاحبہ، عائش جی، سوائے پیاری ساتھی وجیہہ کے جسے بہت اچھا لگا ہمارا نام۔ بہر حال بڑا پرلطف اور دلچسپ تجربہ رہا ہمارا۔ ایچ ایس ایچ آپ بھی آزما کر دیکھ لیں۔ (بس مشورہ زبردستی نہیں)

اس بار سب سے پہلے ہم نے حمیرا شفیع کا ناولٹ پڑھا۔ اچھا لگا کہ آخر تک دلچسپی برقرار رہی اور سبق بھی سکھا گیا۔ افسانوں میں "بابل کا آنگن" روایتی موضوع "دکھاوا" اہم نقطے کی طرف توجہ دلاتا منفرد۔ "چپ" "دلچسپ طرز تحریر۔ "اٹس اوکے" ہمارے دل کی بات لکھ دی۔ عروج راؤ نے۔ "صورت گر خوابوں کے" پرلطف داستان "قرینہ زندگی" میں صبا کی ساس اچھی لگیں۔ ہیپی اینڈنگ تو ہم بھی ہیپی۔ بند کواڑوں سے آگے، میں ہم تو ڈر ہی گئے تھے مگر شہرام کی نیت بری نہیں تھی غلطی پر نتاشا ہی تھی۔ بات ہو جائے "شہر شام ہجر" کی تو مومن اور ایلیا والا سین مصنوعی مصنوعی سا لگا نہ جانے کیوں؟ تانیہ کے ساتھ نہ جانے کیا ہو مگر ہمارا دل برا ہونے کا اشارہ نہیں دے رہا۔ "ماء السلوک" کی ساری قسط سوگواری میں چھپی ہوئی تھی آنسو بھر آئے۔ امت العزیز کے ناول میں اب دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے۔ شرر اور خولہ کے بارے میں تجسس اور عیسیٰ کا ماضی کھلنے کے منتظر۔ "مسافت" میں دانیا کا ثابت قدم، مستقل مزاج اور مضبوط کردار۔ زبردست۔ سنیعہ عمر صاحبہ، اس ماہ کی مسکراہٹوں خصوصاً منگیتر والی نے مزہ دیا۔ اس بار ادا جی بھری تحریریں کم تھیں۔ (شکر)

ج: پیاری انیسہ! تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔ افسانہ جلد شامل ہوگا ان شاء اللہ۔

حفصہ خان گاؤں 21 جیڈی اوکاڑہ سے شرکت کر رہی ہیں

میرا نام حفصہ خان، خان میں خود کے لیے کہلوانا پسند کرتی ہوں۔ ابو کا نام ظہور احمد ہے۔ گاؤں 21 جیڈی سے چلی آ رہی ہوں۔ میں آٹھویں کلاس سے ڈائجسٹ کی قاری ہوں۔ میں اپنی پیاری دوست مقدس سے لے کر پڑھا کرتی تھی۔ مقدس کی کوئی کزن ہر ماہ پڑھا کرتی تھیں۔ تو ان کا ٹرنک بھرا ہوا تھا جو کہ میں نے اور مقدس نے مل کر سارے پڑھے اور اب میں میٹرک پاس کر چکی ہوں۔ تین سال ہو چکے ہیں۔ اپنے کچھ شعر اور غزل تحریر کر رہی ہوں۔

ج: پیاری حفصہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کی شاعری ہم نے شعبہ شاعری کے سپرد کر دی تھی۔ ان سے اشاعت کے بارے میں سوال کیا تو ان کا جواب تھا کہ آپ فی الحال لکھنے کے بجائے صرف مطالعہ کریں۔

کائنات لیاقت سمبڑیال سیالکوٹ سے لکھتی ہیں

اس ماہ ہمیں شعاع نہیں ملا تو تبصرہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ کی محبت میں ہمیں ہر ماہ پانچ کلو میٹر دور جانا پڑتا ہے۔ ماہدولت ٹیچنگ کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ اس ماہ دو کہانیاں بھی بھیج رہے ہیں۔

ج: پیاری کائنات! آپ میں صلاحیت ہے۔ لکھ سکتی ہیں لیکن آپ نے جس موضوع پر لکھا ہے اس موضوع پر ہمیں ہر ماہ کم از کم دس کہانیاں موصول ہوتی ہیں۔ کہانی میں آپ نے بہت زیادہ وعظ و نصیحت کی ہے۔ کہانی میں کبھی بھی ڈائریکٹ نصیحت نہیں ہونا چاہیے۔

☆☆

pklibrary.com

بقیہ سروے

لوگ مجھے بتائیں کہ میں نے ٹھیک کیا تھا یا غلط کیا تھا۔

تسنیم کوثر......ایف بی ایریا کراچی

1۔ گزرے سال کی بھی کیا بات ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ الجھنوں، فکروں، خوف، بے حد ہوش اڑاتی مہنگائی جس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس پر بھی سمندری طوفان کا ڈر تو زلزلے کی الٹی سیدھی پیشن گوئی اور سونے پہ سہاگہ چوری ڈکیتی بہت زیادہ اسٹریٹ کرائم کی وارداتیں جس کا ہم لوگ بھی شکار ہو چکے ہیں اور سیاسی ہلچل یعنی ایک افراتفری کا مجموعہ ہی رہا 2023۔

2۔ پچھلے سال تقریبات تو کافی اٹینڈ کی ہیں جس میں ہمارے ہی گھر میں بچوں کی برتھ ڈے وغیرہ کے چھوٹے موٹے فنکشن تو ہوتے ہی رہے لیکن سرفہرست ابھی حال ہی میں یعنی 3 دسمبر 2023 کو میرے بھتیجے اشعر صدیق کی شادی اور 7 دسمبر کو ولیمہ کی تقریب منعقد ہوئی جس میں اکلوتی پھپھو ہونے کی حیثیت سے ہر فنکشن میں بہت پذیرائی ملی اور مزا بھی بہت آیا۔

3۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ کھانے کا مزا تو سردیوں میں ہی آتا ہے۔ اب دیکھیے نا سرسوں کا ساگ ہے، پائے ہیں گاجر کا حلوہ ہے تو انڈوں کا حلوہ ڈرائی فروٹ کارن سوپ وغیرہ وغیرہ تو خاص سردیوں کی سوغات ہیں۔ سردیوں کی طویل رات ہوتی ہے اس میں گرم بستر میں دبک کر مونگ پھلی اور چلغوزے سے شغل کرنا کیا مزہ دیتا ہے۔ سوری چلغوزے کا یہاں کیا کام یہ تو دسترس سے باہر ہو گیا ہے۔ مگر سردیوں کی تو بات ہی الگ ہے اور ہمیں تو موسم سرما بہت ہی پسند ہے۔

مہوش خولہ

1۔ گیا سال صاحب کتاب بنا گیا ہے۔ اپنے علمی سرکل میں عزت میں اضافہ کر گیا۔ اس کے علاوہ گیا سال مجھے دو پیاری بھابھیاں اور شہزادے جیسا بھانجا محمد فیصل ہارون دے گیا۔ اللہ کی طرف سے اپنی ذات کے لیے بھی بڑی خوشیوں کی امید و انتظار ہے۔ کچھ خوشیاں اپنے دینی حصے سے ملتی ہیں۔ کچھ خوشیاں ہم کسی کی ضرورت

پر آخری حد تک جا کر اس کے کام آ کر خرید لیتے ہیں۔

2۔ دین کے صحیح مطالعے نے سوشل بنا دیا۔ ورنہ معمولی سے اخلاق والی تھی۔ زیادہ روابط پسند نہ تھے۔ اب سوشل ہونے کی وجہ سے کئی تقریبات اٹینڈ کرنی ہیں، یاد بھی نہیں کتنی تقاریب میں گئے۔ بس زندگی میں رشتے داروں کا احباب کا ہنگام ہی رہتا ہے۔

قریب دنوں کا اک واقعہ ہے۔ ماہ نور بھابھی نے مجھے اک خاص موقع پر زبردستی تیار کروایا۔ نیا سوٹ پہننے اور میک اپ کا کہا میرے لیے خاص ڈش بنائی۔ وہ مجھے بہت زیادہ اچھا لگا اور ہمیشہ یاد رہے گا۔

3۔ موسم سرما اور کھانے۔ آہ مدیرہ اس سوال نے تاں مجھے دکھی کر دیا۔ اتنے پیارے موسم میں گھر والوں کو ہماری اچھی صحت کے پیش نظر ہماری ڈائٹ یاد آ گئی۔ ٹوٹی ڈائٹ کا سلسلہ دوبارہ جوڑنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ لیکن موسم سرما کے احترام میں ہم مستقل اگنور کر رہے ہیں۔ چائے کے دور میں شمولیت دھوکے سے دیتے ہیں۔ شام کی چائے چھوڑ دی ہے لیکن جیسے ہی شام گزر رہی ہے، پی لیتے ہیں۔ قہوے تو بانگ دہل پیتے ہیں۔

اس موسم سے متعلق کھانوں میں ہمارے گھر میں رائج کھانے گاجر کا حلوہ، تل کے لڈو، مونگ پھلی کی گڑ دانی، شکر قندی کی چاٹ، پائے کا سالن، مچھلی، مٹر پلاؤ، مکس سبزی اور سلاد کے آئٹم جو بڑھ جاتے۔ مولی چقندر گاجر اس کی خوشی نہ پوچھیں۔ بیسن، جو، مکئی، باجرہ ہر آٹے کی روٹی اور کرن آرائیں کی سگنیچر ڈش ساگ تو اتنا کھاتے ہیں کہ صبح دوپہر شام رات ساگ ہی ساگ رنگ ہی ہرا بھرا ہو جاتا خدشہ ہوتا کہ ساگ ہم پر نہ اگ آئے۔

بہت منفرد غذائیت سے بھرپور ”شکر قندی“ کی ڈش حاضر خدمت ہے۔

شکر قندی ایک کلو ابال لیں۔ شکر قندی کے ٹکڑے چوکور کاٹ لیں۔ سردی کی ساری سلاد، مولی، گاجر، چقندر، پیاز، ٹماٹر، کھیرا، بند گوبھی تیار کر لیں۔ دھنیا پودینہ بھی باریک کتر لیں۔ کیلا بھی شامل کر سکتے ہیں۔

یہ سب آدھا کلو دہی کو تھوڑا پتلا کر کے اس میں مکس کریں۔ نمک کالی مرچ چاٹ مسالہ پاپڑی ڈال کر کھائیے۔ ذائقہ اور غذائیت دونوں پائیے۔ ☆☆

pklibrary.com

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

مرغ تنجن مسالہ

ضروری اشیاء:

مرغی	سوا کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
دھنیا	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک پاؤ
تیل	ایک کپ
ادرک	دو چائے کے چمچے
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
خشخاش	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک چائے کا چمچہ
کشمش	حسب ضرورت
بادام	دو کھانے کے چمچے
پستہ	دو کھانے کے چمچے
خوبانی	دس عدد
جائفل جاوتری	آدھا چائے کا چمچہ
انڈے	دو عدد
کھیرا	آدھا
ٹماٹر	ایک عدد

ترکیب:

تیل گرم کرکے پیاز ڈالیں اور لال کرکے نکال لیں۔ ٹھنڈی کرنے کے بعد اسے پیس لیں۔ اسی تیل کو دوبارہ گرم کرکے مرغی ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد دہی، ادرک، لہسن، پسی پیاز، نمک، لال مرچ اور دھنیا ڈال کر بھونیں۔ بھوننے کے بعد پسا ہوا سفید زیرہ، خشخاش، سونف ڈالیں اور تھوڑا پانی ڈال کر پکائیں۔ جب مرغی گل جائے تو کشمش، بادام، پستہ، خوبانی اور جائفل جاوتری ڈال کر دو سے تین منٹ تک پکائیں۔

مرغی پک جائے تو چولہا بند کردیں۔ سرونگ ڈش میں نکالیں۔ انڈے، کھیرے اور ٹماٹر کے سلائس کے ساتھ گارنش کریں۔ مرغ تنجن مسالہ تیار ہے۔ تافتان یا نان کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کوکو کینڈی کولڈ کافی

ضروری اشیاء:۔

کریم	ایک کپ
کافی	آدھا چائے کا چمچہ
کوکو پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گرم پانی	دو سے تین کھانے کے چمچے
کینڈی بسکٹ	دو سے تین عدد
شکر	دو کھانے کے چمچے
براؤن، وائٹ چاکلیٹ	گارنشنگ کے لیے
ٹھنڈا دودھ	چھ کھانے کے چمچے

ترکیب:

گرم پانی میں کافی ڈال کر مکس کرلیں اس کے بعد دودھ میں کافی مکسچر، ایک کھانے کا چمچہ شکر، کوکو پاؤڈر، اور کینڈی بسکٹ ڈال کر خوب اچھی طرح گرائنڈ کریں۔ کریم کو برف کے اوپر رکھے ہوئے اسٹیل کے پیالے میں ڈالیں اس میں شکر ڈال کر خوب اچھی طرح جھاگ دار بننے تک پھینٹیں۔ اس کے بعد اس میں دودھ میں مکس کیا ہوا مکسچر ہلکے ہلکے ڈالتی جائیں اور الیکٹرک بیٹر سے پھینٹتی جائیں، مزے دار کوکو کینڈی کولڈ کافی تیار ہے، سرونگ گلاس میں نکال کر براؤن اینڈ وائٹ چاکلیٹ سے گارنش کرکے سرو کریں۔

☆☆

pklibrary.com

امت الصبور

ماضی کے جھروکوں سے

محبت اور مصلحت کی کشمکش

عضد الدولہ کے لیے چین سے ایک کنیز لائی گئی تھی۔ وہ اس قدر حسین تھی کہ عضد الدولہ ایک لمحے کے لیے اس سے جدا ہونا پسند نہ کرتا۔ یا تو یہ حالت تھی کہ سلطنت کے مختلف حصوں سے صد ہا عرضیاں اور مراسلے روزانہ موصول ہوتے تھے اور وہ اسی روز ان سب کا جواب لکھوا دیتا تھا اور ہر ایک پر اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا تھا یا یہ عالم ہوا کہ دفتر کے دفتر جمع ہونے لگے مگر بادشاہ کو کنیز کے سوا کسی چیز کی سدھ بدھ نہ رہی، نہ کسی عرضی کا جواب، نہ دستخط، نہ دربار، نہ امور سلطنت تمام کاروبار کی طرف سے آنکھ بند کرلی۔

جب بادشاہ کی غفلت حد سے گزر گئی تو لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ بادشاہ کو بھی احساس ہوا کہ یہ ساری خرابیاں اس کنیز کے سبب سے پیدا ہوئی ہیں۔ ایک دن غصہ آیا تو حرم سرا کے محافظ خاص شکر کو حکم دیا کہ۔

"اس کو لے جاؤ اور دجلہ میں پھینک آؤ!"

شکر نے سوچا کہ بادشاہ نے غصے میں ایسا حکم دیا ہے۔ کل ضرور پچھتائے گا اور جب کنیز کو زندہ نہ پائے گا تو میری جان کی خیر نہیں۔

یہ سوچ کر اس نے کنیز کو ایک علیحدہ مکان میں لے جا کر چھپا دیا اور دوسرے دن امیر کی خدمت میں عرض کردی۔

"حضور کے حکم کے مطابق اسے دریا میں پھینک آیا ہوں۔"

چند روز گزرنے پہ عضد الدولہ کو کنیز کی یاد ستانے لگی۔ اپنے کیے پر پچھتاتا اور بے چین ہو کر چلاتا۔

"یہ میں نے کیا کیا؟ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار لی۔"

ایک دن اپنے مصاحبوں کے ساتھ مجلس عیش میں بیٹھا کہ اتنے میں شکر ادھر آنکلا۔ اس پر نظر پڑی تھی کہ دل کے زخم ہرے ہوئے۔ چینی کنیز کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ غم و غصے سے بے قابو ہو کر بولا۔

"کیوں او بدبخت! سنگدل! تو نے کس دل سے اس نازنین کو پانی کی راہ مٹی میں ملا دیا۔"

یہ کہہ کر غلاموں کو حکم دیا کہ "اسے بھی لے جا کر دجلہ میں پھینک دو تاکہ آئندہ مجھے اس کی منحوس صورت نظر نہ آئے۔ کیوں کہ جب بھی اس پر نظر پڑتی ہے مجھے میری محبوبہ یاد آجاتی ہے اور دل کے گھاؤ ہرے ہو جاتے ہیں۔"

حکم ملتے ہی غلاموں نے شکر کو آگھیرا۔

جب شکر نے دیکھا کہ اب جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ دو قدم باہر کی طرف اور بڑھے تو کوئی غلام اس کی بات نہ مانے گا۔ چلا کر بولا۔

"حضور! جان کی امان پاؤں تو مردہ کنیز کو زندگی کی حالت میں سامنے لے آؤں۔ بات یہ ہے کہ مجھے آج کے دن کا پہلے سے اندیشہ تھا۔ اس لیے میں نے اسے دجلہ میں نہیں پھینکا۔"

عضد الدولہ نے اسی وقت کنیز کی حاضری کا حکم دیا اور وہ سامنے کیا آئی کہ بادشاہ کو عید نظر آئی۔ خوشی سے بے خود ہو کر شکر کو خلعت اور دولت سے مالا مال کردیا اور اب پھر نئے سرے سے اس کی زندگی رنگ رلیوں میں گزرنے لگی۔

کچھ عرصے تک یہی رنگ رہا اور پہلے کی طرح پھر حکومت کے کاموں میں ہرج ہونے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عضد الدولہ نے دوبارہ چینی کنیز کو شکر کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ "اسے غرق کر آؤ۔"

شکر نے اس مرتبہ بھی پہلی سی احتیاط برتی اور کنیز کو غرق کرنے کے بجائے کہیں چھپا دیا۔ ایسا کرنا اس کے حق میں اچھا ہوا۔ کیوں کہ چند ہی روز بعد پھر بادشاہ کو کنیز یاد آئی اور شکر کو حاضر کرنی پڑی اور کچھ عرصے کے لیے پھر عضد الدولہ دنیا مافیہا سے بے خبر ہو گیا اور پہلے کی طرح پھر سلطنت کے کاموں میں خلل واقع ہونے لگا۔

"ادھر آ، اس کشتی کو دیکھ!"

کنیز آگے بڑھ کر دروازے کے قریب آئی اور دریا کی طرف دیکھنے لگی۔ یکایک عضد الدولہ نے اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا اور جب دیکھا کہ وہ مردہ ہو چکی ہے تو غلاموں کو حکم دیا۔

"اسے نکال لاؤ۔" اور لوگوں پر ایسا ظاہر کیا جیسے کنیز خود دریا میں گر پڑی ہو چناں چہ کئی دن تک اس نے کنیز کا سوگ منایا اور اس کی یاد میں بے تاب رہا۔

☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

بالوں کی الجھن سلجھائیں

خشک اور سرد موسم میں سب سے زیادہ شامت بالوں کی آتی ہے۔ بال دھوئیں تو وہ ضرورت سے زیادہ خشک اور روکھے ہو جاتے ہیں اور ایک دن بعد بالوں میں اتنا تیل آ جاتا ہے جیسے نہ جانے کتنے دن سے نہ دھلے ہوں۔

مارکیٹ میں بے جان اور خشک بالوں کے لیے ان گنت مہنگے شیمپو اور کنڈیشنر دستیاب ہیں لیکن اگر کوئی ایسا طریقہ ہو کہ بنا خرچے کے گھر بیٹھے بالوں کو پارلر جیسا ٹریٹمنٹ مل جائے تو کتنا ہی اچھا ہو۔ چند گھریلو ٹوٹکے اپنا کر آپ نہ صرف سردیوں میں اپنے بالوں کو محفوظ رکھ سکتی ہیں بلکہ ان سے بالوں کو نئی روشنی بھی مل سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل قدرتی نسخے آپ کے بالوں کو صحت مند اور چمک دار بنا سکتے ہیں۔

☆ انڈے کی زردی میں شیمپو کا محلول شامل کر کے بالوں میں شیمپو کی طرح اور پانچ سے چھ منٹ تک لگا رہنے دیں۔ یہ محلول آپ کے بالوں کے لیے اور سر کی خشک جلد کے لیے شیمپو اور کنڈیشن دونوں کا کام دے گا۔ اس سے بال سلکی اور جڑیں مضبوط ہوں گی۔

☆ میتھی دانہ کو باریک پیس کر دو لیموں کے رس کے ساتھ جڑوں میں اچھی طرح لگا لیں اور کپڑا باندھ کر سو جائیں صبح کو کپڑا ہٹا کر پھر مالش کریں اور پاؤڈر جھاڑ کر کنگھی کر لیں۔ گرم پانی میں تولیہ بھگونے نچوڑنے کے بعد سر کے اوپر دس منٹ کے لیے لپیٹ لیں پھر تولیہ ہٹا کر شیمپو سے دھو لیں۔

☆ سرسوں کی گٹھلی کو کوٹ کر رکھ لیں۔ نہانے سے پہلے گرم پانی میں بھگو دیں اور پھر سر میں مل کر پانی اور شیمپو سے دھو لیں۔

☆ پانی میں آدھا کٹا پیاز، چند دار چینی کے ٹکڑے اور چند لہسن کے جوے ابال لیں، جب پانی ادھارہ جائے تو اسے ٹھنڈا کر لیں۔ اس سے تین دن مسلسل بال دھونے سے بال بڑھنا شروع ہو جائیں گے اور ملائم بھی ہوں گے۔

☆ ایک ٹماٹر کو زیتون کے تیل میں ملا کے پیسٹ بنا لیں اور اس کا سارے سر پہ اچھی طرح لیپ کر لیں۔ تیس منٹ بعد سر دھو لیں۔

☆ جس پانی میں آلو ابالے گئے ہوں اس سے سر دھو لیں۔ اس کے بعد شیمپو کر لیں۔

☆ ایک پیاز کو پیس لیں، اس میں شیمپو شامل کریں، اس سے سر دھونے سے بال نہ صرف جلد لمبے ہوں گے بلکہ چمک دار بھی ہو جائیں گے۔

☆ ایک پیالی میں انڈا توڑ کر ڈالیں اور اس میں تھوڑا شیمپو شامل کر لیں۔ اس آمیزے کو شیمپو کی طرح گیلے بالوں پہ مل لیں۔ کچھ دیر لگا رہنے دیں پھر بال سادے پانی سے دھو لیں۔

☆ آدھا کپ زیتون یا سرسوں کا تیل گرم کر لیں، اس میں ایک چمچ عرق گلاب ڈال دیں۔ پہلے بالوں کو سلجھائیں پھر تیل سے بالوں اور سر کا اچھی طرح مساج کریں۔ پھر تولیے سے بالوں کو باندھ لیں۔ آدھے گھنٹے بعد شیمپو سے سر دھو لیں۔

☆ بال شیمپو سے دھونے کے بعد ہلکے سے خشک کر لیں۔ پھر ایک کپ چائے بنائیں۔ جب وہ کنکنی ہو جائے تو اس سے بالوں کو دھو لیں۔

☆ آدھا کپ مایونیز سے بالوں کا مساج کریں اور بالوں کو تولیے سے ڈھک لیں۔ ایک گھنٹے تک اسے لگا رہنے دیں پھر ہلکے گرم پانی سے دھو لیں۔

☆ نیم کے پتے لے کر اس کا پیسٹ بنا لیں اور بالوں کو کسی بھی شیمپو سے دھو کر اس پیسٹ کو سر پر پانچ منٹ کے لیے لگائیں۔ بعد ازاں سر کو پانی سے دھو لیں۔

pklibrary.com